خاص نمبر

ماہ نامہ

ہمدرد

نونہال

جولائی ۸۹ء

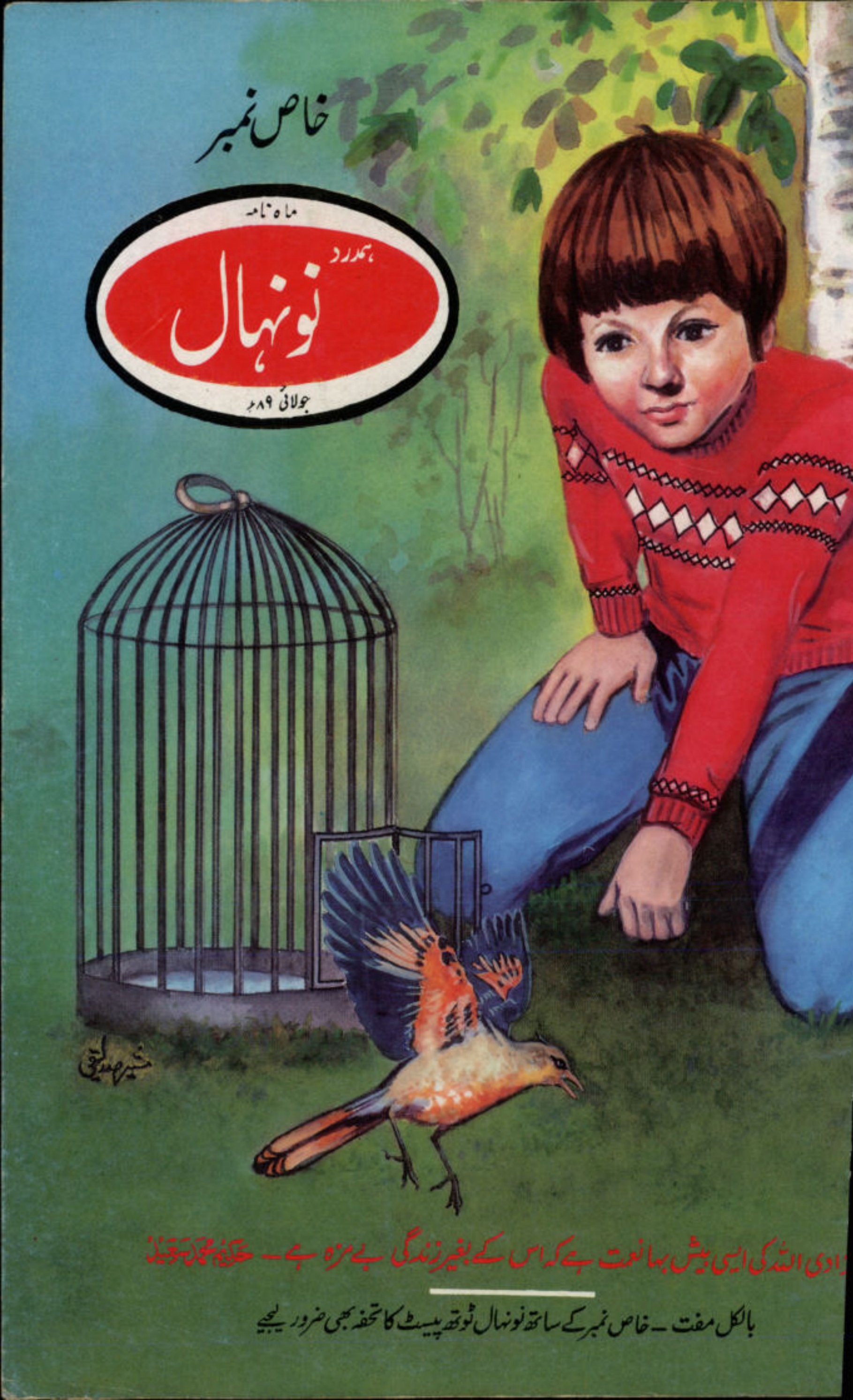

زادی اللہ کی ایسی بیش بہا نعمت ہے کہ اس کے بغیر زندگی بے مزہ ہے۔ حکیم محمد سعید

بالکل مفت ۔ خاص نمبر کے ساتھ نونہال ٹوتھ پیسٹ کا تحفہ بھی ضرور لیجیے

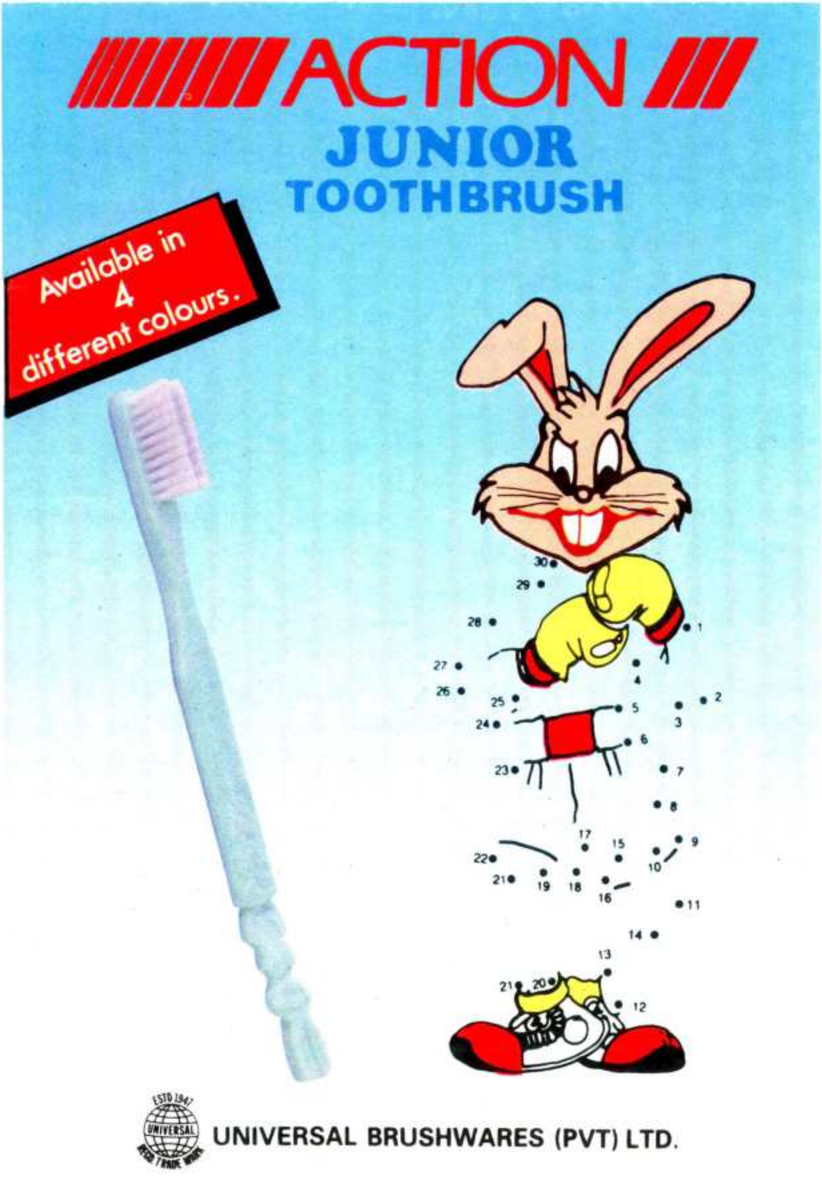

SCAN K.T.F.

CORAL

Everyone loves to eat
mayfair Toffees and Sweets

- Milk Bon Bon
- Orange Candies.
- Coconut Candies.
- Deluxe Toffees
- Assorted Candies.
- Tattoo Toffees
- Honey Candies.

And now another
offer from the house of Mayfair

Milka Chew
Fruta Chew
Minta Chew

mayfair **Bubble**

You will love it because it is the only juicy bubble that makes
big big Bubbles.

mayfair The Sweet Favourites.

AFI Asian Food Industries (Private) Limited.
Shernaz House, West Wharf Road, Karachi, Pakistan.
Phones: 201612, 201617 Cable: BON BON Telex: 25482 AFI PK

ADARTS

AFI 1 86

Talc of the Year

Swiss Miss

Parfum Cologne
Talcum Powder

It is the talc
with
Parfum Cologne

سوئس مس

پرفیوم کلون ٹالکم پاؤڈر

آپ کو دن بھر خوشبو میں بسائے رکھتا ہے۔

سوئس مس پرفیوم کلون ٹالکم پاؤڈر
استعمال کیجئے۔

اس کے بعد آپ کو کلون کے استعمال کی
ضرورت نہیں۔

ADMIRAL OF NEW YORK

ISSN 0259 - 3734

ہمدرد نونہال

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

فون: 616001 سے 616005 (پانچ لائنیں)

پتا: ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ،
ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

خاص نمبر

مجلس ادارت

صدر مجلس — حکیم محمد سعید
مدیر اعلا — مسعود احمد برکاتی
مدیرۂ اعزازی — سعدیہ راشد

ذی الحجہ ۱۴۰۹ ہجری
جولائی ۱۹۸۹ عیسوی
جلد ۳۷
شمارہ ۷
قیمت فی شمارہ ۵ روپے
خاص نمبر ۱۲ روپے
سالانہ ۵۵ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۱۰۳ روپے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق محفوظ رکھیں۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا

اس رسالے میں کیا ہے

صفحہ	مصنف	عنوان	عنوان	مصنف	صفحہ
۷	جناب حکیم محمد سعید	جاگو جگاؤ	نشانی	امید افشاں نذیر	۳۹
۹	مسعود احمد برکاتی	پہلی بات	ہم اور خانے	جناب یوسف ناظم	۴۱
۱۰	ننھے گل چیں	گلدستہ	ادب کا خزانہ (نظم)	جناب قمر ہاشمی	۴۶
۱۱	جناب عتیق الرحمٰن صدیقی	حضرت ابراہیم کا راستہ	مجھے شکایت ہے	مسعود احمد برکاتی	۴۸
۱۵	جناب شاعر لکھنوی	گرمی (نظم)	جاہل	مجیب ظفر انوار	۵۱
۱۶	جناب شان الحق حقی	خالی وقت میں خلا کی بات	آزادی	لبنیٰ سلیم	۵۳
۱۹	جناب میرزا ادیب	باجی جی	وہ یادگار دن	شہناز پروین	۵۷
۲۶	ادارہ	معلومات عامہ ۲۷۹	ہمدرد انسائکلوپیڈیا	جناب علی ناصر زیدی	۷۰
۲۷	جناب حکیم محمد سعید	بچپن کی باتیں	بات ایک کتاب کی	جناب میرزا ادیب	۷۳
۳۳	نصرت شاہین	خوشی کی پری	آسان علاج	ادارہ	۷۸

صفحہ	مصنف	عنوان	عنوان	مصنف	صفحہ
۸۵	جناب علی اسد	دو بھائی	حشرات - ہمارے دوست	جناب ڈاکٹر منظور احمد	۱۳۷
۹۵	جناب عنایت علی خاں	کیا کہنے (نظم)	عظمت اللہ کے ہاتھ	جناب حسن منظر	۱۴۳
۹۶	ڈاکٹر سید اسلم	عید قرباں اور گوشت	سمندری موجیں	ڈاکٹر سہیل برکاتی	۱۶۷
۹۹	مسعود احمد برکاتی	میں پاکستانی ہوں	چاندی کے کھروالا ایکبرا	جناب معراج	۱۷۲
۱۰۳	جناب شوکت تھانوی	خوشی ٹیک خوشی نوٹیک	نازو شکور	ساجد علی ساجد	۱۸۷
۱۱۳	سید ندیم یوسف	انوکھی دنیاؤں کی سیر	مونٹی کرسٹو کا نواب	الیگزینڈر ڈوما / مسعود احمد برکاتی	۲۰۱
۱۲۷	جناب حکیم محمد سعید	طِب کی روشنی میں	انشا پارے	جناب ابنِ انشا	۲۰۹
۱۳۱	جناب فیض لودھیانوی	چُھٹّی کی گھنٹی (نظم)	دھاریوں والا سانپ	آرتھر کانن ڈائل / اشرف نوشاہی	۲۱۵
۱۳۲	جناب رؤف پاریکھ	میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں	سند باد جہازی کے حیرت انگیز سفر	جناب احمد خاں خلیل	۲۳۱

♦ مہربان دوست کے نام، جاوید اقبال ـ ۸۱ ♦ دادی امّاں، شازیہ نور ـ ۱۰۵ ♦ ایک ادیبہ، نظم پارہ نقطی ۱۰۹
♦ نیا سبق، حیدر راحت ـ ۱۱۱ ♦ مشرق اور مغرب کی باتیں، جناب مرزا ظفر بیگ ـ ۱۸۰ ♦ اور وہ مقابلہ جیت گئی، راحیل
نجمی ـ ۱۸۳ ♦ دانہ دانہ، نکتہ داں نونہال ـ ۱۹۱ ♦ نونہال لُغت، ادارہ ـ ۳۰۳ ♦ نونہال مصور، ننھے آرٹسٹ ـ
۲۱۳ ♦ کھل کھلاتیے، ننھے مزاح نگار ۲۶۵ ♦ سام پہ کیا گزری (آخری ٹکڑا) سید اظفر مہدی ـ ۲۶۹ ♦ نونہال
ادیب، ننھے لکھنے والے ـ ۲۷۹ ♦ آدھی ملاقات، نونہال پڑھنے والے ـ ۲۹۷ ♦ معلومات عامہ ۲۷۷ کے جوابات، ادارہ ـ ۲۱

حکیم محمد سعید پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپواکر ادارۂ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ سے شائع کیا

With Best Compliments

From

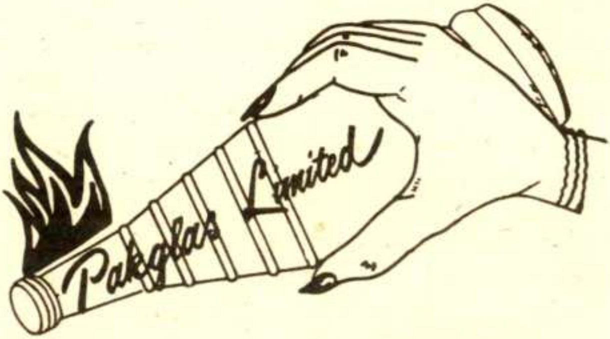

A NAME IN GLASS INDUSTRY

Manufacturers of

all kinds of glass bottles / wares

(Amber / White)

Specialised in Pharmaceutical

HEAD OFFICE & WORKS:

A-60 S.I.T.E.
P.O. Box 3638
Karachi-16
Pakistan

Cable: "PAKGLAS"

TELEPHONES:

Office 291685 - 292483
Works 291557 - 292315

Res: 617507
629546

SAMR ART

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جاگو جگاؤ

جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ مسلمان، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اسی طرح ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے محبّت بھی ہمارے ایمان کا حصّہ ہے۔ ایک مسلمان دوسرے سے اس لیے محبّت کرتا ہے کہ وہ بھی ایمان والا ہے اور وہ بھی اللہ کا ماننے والا ہے۔ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب دو آدمی ساتھ سفر کرتے ہیں اور ان کی منزل اور ان کا راستہ بھی ایک ہی ہوتا ہے تو وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکلیف کا خیال رکھنے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کی منزل بھی ایک ہے۔ ان کا راستہ اور طریقہ بھی ایک ہی ہے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سچّا مانتے ہیں اور دنیا میں بھلائی پھیلانا چاہتے ہیں۔ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا امن و سکون کا گہوارہ ہو۔ دنیا کا ہر انسان آرام سے زندگی گزارے اور تمام انسان ایک دوسرے کی عزّت کریں۔ ایسی صورت میں مسلمان، مسلمان کو تو آپس میں ایک جان دو قالب ہونا ہی چاہیے۔

رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ "قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جنّت میں داخل نہیں ہوگے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ، اور ایمان نہیں لاؤ گے جب تک کہ آپس میں محبّت نہ کرو۔ میں تم کو ایسی بات نہ بتادوں کہ تم اس پر عمل کرو تو آپس میں محبت ہو جائے۔ وہ بات یہ ہے کہ اپنے درمیان سلام پھیلاؤ۔"

سلام کرنے کا مطلب ہے سلامتی چاہنا۔ جب بھی دو مسلمانوں کا آمنا سامنا ہو ان کو چاہیے کہ سلام کریں۔ اس طرح حضورؐ کے ارشاد کے مطابق آپس میں محبّت بڑھے گی اور بھائی چارہ پیدا ہوگا۔

تمھارا دوست اور ہمدرد

حکیم محمد سعید

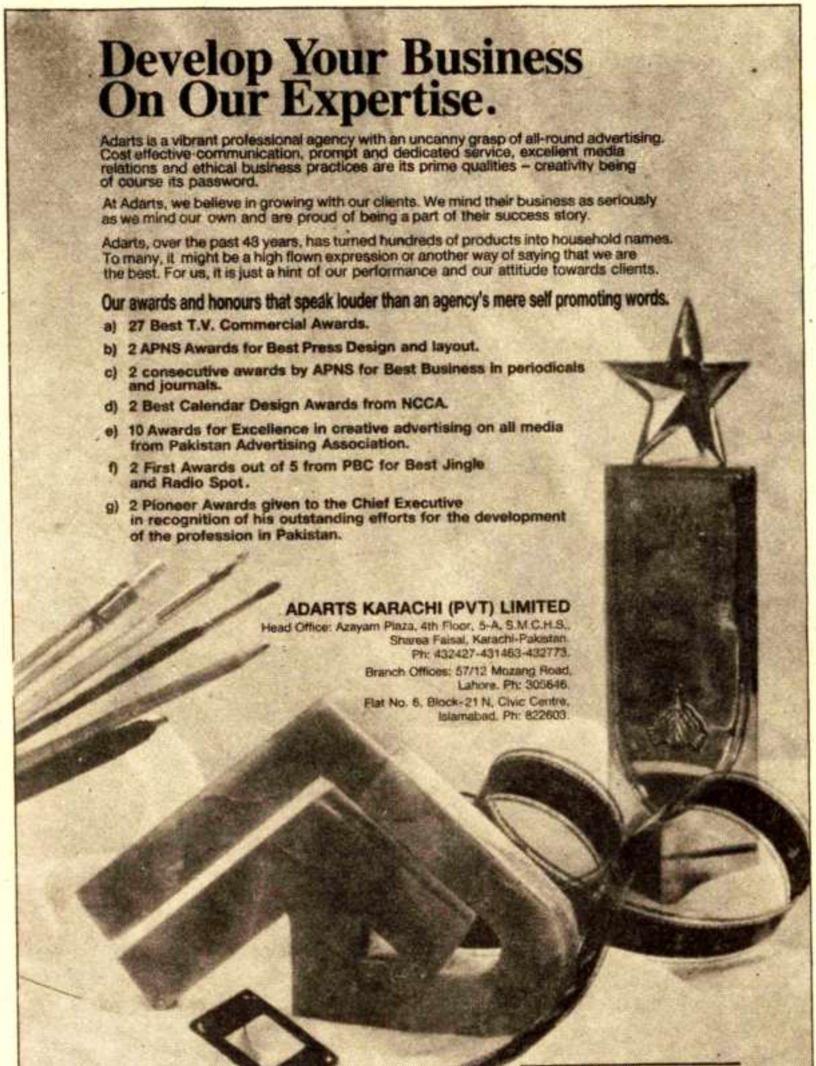
Develop Your Business
On Our Expertise.
Adarts is a vibrant professional agency with an uncanny grasp of all-round advertising. Cost effective communication, prompt and dedicated service, excellent media relations and ethical business practices are its prime qualities – creativity being of course its password.
At Adarts, we believe in growing with our clients. We mind their business as seriously as we mind our own and are proud of being a part of their success story.
Adarts, over the past 43 years, has turned hundreds of products into household names. To many, it might be a high flown expression or another way of saying that we are the best. For us, it is just a hint of our performance and our attitude towards clients.
Our awards and honours that speak louder than an agency's mere self promoting words.
a) 27 Best T.V. Commercial Awards.
b) 2 APNS Awards for Best Press Design and layout.
c) 2 consecutive awards by APNS for Best Business in periodicals and journals.
d) 2 Best Calendar Design Awards from NCCA.
e) 10 Awards for Excellence in creative advertising on all media from Pakistan Advertising Association.
f) 2 First Awards out of 5 from PBC for Best Jingle and Radio Spot.
g) 2 Pioneer Awards given to the Chief Executive in recognition of his outstanding efforts for the development of the profession in Pakistan.
ADARTS KARACHI (PVT) LIMITED
Head Office: Azayam Plaza, 4th Floor, 5-A, S.M.C.H.S., Sharea Faisal, Karachi-Pakistan. Ph: 432427-431463-432773.
Branch Offices: 57/12 Mozang Road, Lahore. Ph: 305646.
Flat No. 6, Block-21 N, Civic Centre, Islamabad. Ph: 822603.
Adarts — a leader by example.

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

دوستو! ایک اور خاص نمبر حاضر ہے۔ ہماری کوشش تو یہ رہی ہے کہ یہ بہت خاص نمبر ہو۔ اب فیصلہ بچوں کے ہاتھ میں ہے۔ جج بھی ایک نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں، مگر ہماری ہمت دیکھو کہ پھر بھی ان کے سامنے اپنا اعمال نامہ پیش کرتے ہیں۔ جب سے نونہال نکلا ہے کتنے بڑے بڑے اچھے اچھے نمبر نکل چکے ہیں۔ آزادی کے عَلم بردار نمبر، افریشیا کی کہانیاں، صحت نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، ۶۹ء کا خاص نمبر، ۷۰ء کا خاص نمبر اور اب ۸۳ء سے ہر سال خاص نمبر۔ آپ لوگ پڑھتے پڑھتے نہیں تھکتے، مگر ہم خاص نمبر نکالتے سے تھک جاتے ہیں، لیکن ہزاروں نونہالوں کی خواہش اور ہزاروں کے تقاضے اور پھر ہمارے بزرگ محترم حکیم محمد سعید صاحب کی خوشی اور دل بڑھاوا کیسے نظر انداز کریں — خیر اب یہ نمبر آپ کی عدالت میں ہے۔

خاص نمبر میں کہانیاں، دل چسپیاں، نظمیں، مسکراتی تحریریں، بزرگوں کی تحریریں، دینی معلومات، اخلاقی باتیں، صحت کے اشارے طویل کہانی، قسط وار کہانی کی آخری قسط، نئی قسط وار کہانی کا پہلا ٹکڑا کھیل اور کھلاڑی کی باتیں، سائنسی معلومات، لطیفے اور مستقل عنوانات سب کچھ ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ نونہالوں کی تعلیم اور تفریح دونوں کا اچھا سامان ہو۔

ہمدرد نونہال بڑے بھی پڑھتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں اور سنبھال کر رکھتے ہیں۔ سنبھال کر تو نونہال بھی خوب رکھتے ہیں۔ یہ خاص نمبر بھی احتیاط سے رکھنا۔ تمھارے بچوں کے بھی کام آئے گا۔

اچھا بھئی، تمام بزرگ لکھنے والوں اور نو عمر لکھنے والوں کا دل سے شکریہ کہ انھوں نے اچھی اچھی پیاری پیاری تحریروں سے خاص نمبر کو نوازا اور قبلہ حکیم محمد سعید کی رہنمائی اور کام کرنے والے ساتھیوں کی مدد کا بھی بہت بہت شکریہ۔ جن کی تحریریں تاخیر سے ملنے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکیں وہ ناراض نہ ہوں۔ اس میں ہمارا قصور کیا ہے۔

اچھا اب آپ رسالہ پڑھیے۔

گل دستہ

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم: اپنے گھر کی دیوار اتنی بلند نہ کرو کہ تمھارے پڑوسی کی ہوا رک جائے۔ مرسلہ: ذوالفقار علی ضیا، جھنگ

حضرت سلیمانؑ: مایوس شخص کے لیے ہر دن بُرا ہوتا ہے مگر خوش مزاج اور خوش دل کے لیے ہر دن عید کا دن ہوتا ہے۔

مرسلہ: ابراہیم شاہ، کراچی

ابوبکر بن داؤد: بے وقوف کے ساتھ آزاد بیٹھنے سے بہتر ہے کہ عقل مند کے ساتھ قید خانے میں بیٹھا جائے۔ مرسلہ: شکیل خاں، میرپور خاص

حضرت امام شافعیؒ: جب کام زیادہ ہوں تو سب سے پہلے اس کام کو ہاتھ میں لو جو سب سے زیادہ اہم ہو۔ مرسلہ: خالد حسین، شہداد کوٹ

حضرت نظام الدین اولیاؒ: اگر کسی نے تجھے دُکھ دینے کے لیے تیرے راستے میں کانٹے رکھ دیے تو تو انھیں راستے سے ہٹا دے۔ اگر تو نے بھی اس کے بدلے میں کانٹے رکھ دیے تو ساری دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

مرسلہ: ظفر احمد قریشی، ٹنڈوالہ یار

امام غزالیؒ: اچھی کتابوں کا مطالعہ دل کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

مرسلہ: محمد جمیل اشرف، مراڑیاں شریف

بقراط: اپنی خامیوں کا احساس ہی انسان کی کام یابی کی کُنجی ہے۔

مرسلہ: عاصم رحیم، رحیم یار خاں

ملٹن: خوشیاں وہیں پروان چڑھتی ہیں جہاں اعتماد کے بیج کو پانی دیا جاتا ہے۔

کنفیوشس: جس نے علم تو حاصل کیا مگر سوچ بچار کی عادت نہیں ڈالی اس کی ساری محنت ضائع ہو گئی۔ مرسلہ: کامران احمد خاں، کراچی

ایڈیسن: اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیے۔ یہ کام آپ کے جانے کے بعد اپنے آپ ہو جائے گا۔

مرسلہ: خالد محمود، کراچی

ایمرسن: یہ دنیا باہمت، پُر اُمید اور زندہ دل لوگوں کے لیے ہے۔

مرسلہ: سید نوید احمد شاہ، ٹنڈو آدم

بوعلی سینا: زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی دونوں ہی بُرائی کی طرف لے جاتی ہیں۔

مرسلہ: شارق، کراچی

حضرت ابراہیمؑ کا راستہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تبارک و تعالیٰ کے ایک مقبول اور اطاعت گزار بندے تھے۔ وہ عراق کے قدیم شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوّت عطا فرمائی اور نہایت اونچے مرتبے پر فائز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن عزیز میں انھیں راست باز نبی کہا اور فرمایا:

"بے شک ابراہیم ایک الگ اُمّت تھے، اللہ کے فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ وہ اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی رہ نمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کی اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرے میں ہوں گے۔"

آپ نے لوگوں کو بُت پرستی اور ستارہ پرستی سے روکا اور بتایا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے سب کو پیدا کیا، وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور نفع و نقصان کا مالک وہی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے والد کو دعوت دی اور پھر اپنی قوم کو مگر کسی نے بھی سیدھی راہ نہ اپنائی۔ اُلٹا سب مخالفت پر ڈٹ گئے۔ انھوں نے نمرود بادشاہ کے دربار میں توحید کی دعوت پیش کر کے بادشاہ کو لاجواب کر دیا۔ چناں چہ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کی سزا کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اس میں کئی روز تک مسلسل آگ دہکائی گئی یہاں تک کہ اس کے شعلوں سے دور اور نزدیک کی چیزیں جھلسنے لگیں۔ تب ایک گوپھن میں حضرت ابراہیمؑ کو بٹھا کر بھڑکتے ہوئے الاؤ میں پھینکا، مگر اللہ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی اور آپ کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ آپ صبر و رضا کے پیکر ثابت ہوئے۔ آپؑ ایک ایک کر کے کتنی ہی آزمائشوں سے دوچار ہوئے مگر سب سے کام یاب ہو کر نکلے۔ جب آپؑ کو اسماعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے

کا حکم ملا تو سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنے بڑھاپے کی آرزوؤں کے مرکز کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ آئے اور جب اپنے لختِ جگر کو خواب میں ذبح کرنے کا اشارہ ملا تو اس کڑے اور دل پگھلا دینے والے امتحان میں کام یاب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس واقعے کو یوں بیان فرمایا:

"ایک روز ابراہیمؑ نے اس سے (اسماعیلؑ سے) کہا، بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا، ابّا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے آپ کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ آخر کار جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم، تو نے خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ (الصّٰفّٰت)

اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کر کر کے مانگے ہوتے جگر گوشے کو ذبح کرنے کے لیے چت لٹانے کے بجائے اوندھے منھ لٹایا تاکہ کہیں بیٹے کا چہرہ دیکھ کر ہاتھ میں لرزش نہ پیدا ہونے پائے۔ اللہ کو اپنے فرماں بردار اور اطاعت گزار بندے کی یہ جاں نثاری اتنی پسند آئی کہ ایک عظیم قربانی فدیے میں دے کر حضرت اسماعیلؑ کو چھڑا لیا۔ اللہ کے فرشتے نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے ایک مینڈھا پیش کر دیا تاکہ بیٹے کے بدلے میں اسے ذبح کریں۔ اسے بڑی قربانی اس لیے کہا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے اسماعیل جیسے صابر اور جاں نثار بیٹے کا فدیہ تھا اور اس لیے بھی کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سُنّت جاری کر دی کہ اس تاریخ کو تمام ایمان والے دنیا بھر میں جانور قربان کر دیں اور وفاداری و جاں نثاری کے ایک عظیم الشّان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں۔ اللہ کے سچّے نبی حضرت ابراہیمؑ جب آخری اور سب سے بڑی آزمائش میں بھی پورے اُترے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں خوش خبری دی:

"اے ابراہیمؑ میں تمھیں سارے انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔" امامت کے اس فرض کو نبھانے کے لیے باپ اور بیٹے نے مل کر اللہ کے گھر کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔

بیت اللہ کی دیواریں اُٹھاتے ہوئے وہ اپنے رب کے حضور یوں دعا کرنے لگے:
"اے اللہ! ہمارے عمل کو قبول فرما یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ مالک! ہمیں اپنا سچّا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ پیدا کر جو تیرا اطاعت گزار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا۔ ہم پر کرم کی نظر رکھ۔ تو بلاشبہ نظرِ کرم فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (البقرہ)

جب کعبے کی تعمیر مکمل ہو گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو اس گھر کے قریب بسا دیا۔ "پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک شاخ کو ایک چٹیل میدان میں تیرے محترم گھر کے پاس بسا دیا ہے، اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں۔" (القرآن)

اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو دنیا والوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ اور عبادت کا مرکز بنا دیا اور ابراہیمؑ سے کہا کہ لوگوں میں منادی کرا دینا کہ اس کا حج فرض ہے۔ فرمایا:
"اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ متعیّن کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرا کسی کو شریک نہ ٹھیرانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے شرک کی آلودگیوں سے پاک رکھنا۔" (القرآن)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی زیارت ہر اس بالغ مسلمان پر ایک بار فرض کر دی کہ جو اپنے گھر سے مکّہ مکرمہ تک آنے جانے کی قدرت اور طاقت رکھتا ہو۔ پیارے نبیؐ نے فرمایا:
"جسے کسی بیماری نے یا کسی حقیقی ضرورت نے یا ظالم حکمراں نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے وہ یہودی مَرے یا نصرانی۔" اور وہ شخص جس نے اس فرض کو صحیح طریقے سے ادا کیا اس کے متعلق حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ مقبول حج کا بدلا جنّت کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کی پاکیزہ دعاؤں کو قبول فرمایا اور ان کی اولاد سے ایسا رسول مبعوث فرمایا کہ جو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت ہے اور اس پر ایسی کتاب اُتاری جو دنیا والوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور حق و باطل کے

درمیان فرق کھول کر رکھ دینے والی ہے۔ اللہ کے اس آخری رسولؐ کو ماننے والے کروڑوں لوگ آج دنیا کے کونے کونے سے ذی الحجہ کے مبارک مہینے میں "لبّیک اللّھمّ، لبیک" (میں حاضر ہوں میرے اللہ! میں حاضر ہوں) کا ورد کرتے ہوئے ایک ہی لباس پہنے ہوئے اس گھر کا طواف کرتے ہیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے اس ارادے کا اظہار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا راستہ ہی ان کا راستہ ہے اور منیٰ میں پہنچ کر حضرت ابراہیمؑ کی سُنّت کو تازہ کرتے ہوئے جانور قربان کرتے ہیں اور یوں اپنے عمل سے اس عزم کو دہراتے ہیں:

"کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ ربُّ العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں" (القرآن)

کتابیں جنھیں بچّے شوق سے پڑھتے ہیں

چالاک خرگوش کے کارنامے

ایک چالاک خرگوش جس نے لومڑی کی پٹائی کرائی، ریچھ کو کنویں میں جا پھنسایا، بھیڑیے کو درخت کی کھوہ میں بند کیا اور شیر کو درخت سے باندھ دیا۔ اس دل چسپ ناول کو جب تک آپ ختم نہ کرلیں گے آپ کو چین نہیں آئے گا۔
قیمت: چھے رُپے

ننھا سیاح

یہ ننھے ابن بطوطہ بجّی کی سیر و سیاحت کی حیرت انگیز کہانی ہے جو بغداد سے کشتی میں روانہ ہوکر بونوں کے جزیرے میں جا نکلتا ہے، بونوں کی عجیب و غریب دنیا کا کھوج لگاتا اور ایک شریر جن کو قید کرتا ہے۔ یہ سفر نامہ بچوں نے بہت پسند کیا ہے۔ اس کے چار اڈیشن نکل چکے ہیں۔
قیمت چھے رُپے۔

چند مشہور طبیب اور سائنس داں

تمام نونہال یہ چاہتے ہیں کہ انھیں دل چسپ سائنسی معلومات حاصل ہوں مثلاً کس نے سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا سائنسی طریقہ معلوم کیا؟ کس نے کرۂ ارض کا محیط، عرض بلد اور طول بلد درست طور پر معلوم کیا۔ اس کتاب میں آپ کو دنیا کے ۲۴ مشہور طبیبوں اور سائنس دانوں کے دل چسپ حالات ملیں گے۔ قیمت سات رُپے

قصہ اژدہا پکڑنے کا

اس کتاب کی آٹھ کہانیوں میں ہر کہانی میں کسی نڈر اور بہادر آدمی کا کارنامہ ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے ربر کی کشتی میں بحر اطلانٹک کو اکیلے عبور کیا تھا۔ ایک اور آدمی نے قطب شمالی کے برفانی علاقے کے باشندوں کے حالات لکھے ہیں۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو نونہالوں کو دلیر بنا دیتی ہیں۔ قیمت پانچ رپے

گرمی

بچّے کی فریاد

پھنک رہا ہے بدن
جل رہی ہے زباں
پاس پیسے نہیں
برف بھی ہے گراں
گھر کے پنکھے سے بھی
اٹھ رہا ہے دھواں
پھر میں جاؤں کہاں
میرے اللہ میاں

گھر کی دیوار ہے
کوہ آتش فشاں
بیل انگور کی
ہوگئی نیم جاں
اور پسینہ ہے یوں
جیسے دریا رواں
پھر میں جاؤں کہاں
میرے اللہ میاں

لو کی حدّت سے ہے
آدمی نیم جاں
آگ ہے یہ زمیں
آگ ہے آسماں
بُھن رہے ہیں شجر
تپ رہے ہیں مکاں
پھر میں جاؤں کہاں
میرے اللہ میاں

دھوپ ہی دھوپ ہے
کیا یہاں، کیا وہاں
کوئی چھینٹا پڑے
ابر برسے یہاں
میرے اچھے خدا
خالقِ دو جہاں
مالکِ مہرباں
میرے اللہ میاں

خالی وقت میں خلا کی بات

شان الحق حقی

خلا کے معنی ہیں خالی جگہ۔ جہاں کچھ نہ ہو وہاں خلا ہو گا۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ عالم میں خلا مُحال ہے۔ جہاں کچھ نظر نہیں آتا وہاں بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ جہاں مادّے کے ذرّے زیادہ گھٹے ہوئے ہوں وہاں وہ ٹھوس ہو جاتا ہے۔ جہاں گیس کی صورت میں زیادہ پھیلے ہوئے ہوں وہاں ہم خلا سمجھتے ہیں، جیسے ہمارے اِرد گرد کی ہوا جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس سے آگے کی فضا اور بھی خالی ہے۔ اگرچہ بالکل یا سو فی صد خالی نہیں کہی جا سکتی۔

خیر یہ تو تھی فزکس یا طبیعیات کی بات۔ ایک اور دل چسپ بات ایک فلکیات کے ماہر نے کہی ہے۔ سر جیمز جینز (JAMES JEANS) نے دوُر بینوں کی مدد سے ستاروں کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ کائنات میں اتنے ستارے ہیں کہ شمار سے باہر۔ ستاروں کے کروڑوں جھُرمٹ یا "جزیرے" ہیں اور ہر جھُرمٹ میں کروڑوں ستارے۔ حال آنکہ ابھی ہم اتنی دوُر تک نہیں دیکھ سکے ہیں جسے کائنات کی آخری حد کہا جا سکے۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کائنات تقریباً خالی ہے، یعنی کائنات اتنی وسیع اتنی وسیع ہے کہ اربوں کھربوں ستارے اس کے ایک ذرا سے کونے میں سما سکتے ہیں۔

اس کی مثال سر جیمز جینز نے یہ دی کہ ستاروں کے جس جھُرمٹ یا جزیرے میں ہماری زمین واقع ہے اُس میں سورج سے بھی بڑے بڑے کوئی دس کروڑ ستارے ہیں۔ لیکن خود فضا اتنی وسیع ہے کہ یہ دس کروڑ ستارے اس کے مقابلے میں گویا دس کروڑ خاک کے ذرّے ہیں جو برِّاعظم ایشیا کے برابر جگہ میں بکھیر دیے جائیں تو پھر فضا کو خالی نہ کہیں تو کیا کہیں۔ اسی لیے ستاروں کے آپس میں ٹکرانے کا امکان بھی بہت ہی کم ہے۔

اب پھر طبیعیات کی طرف آئیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خلا چاہے نسبتاً خالی سہی اس میں بڑی طاقت یا کشش ہوتی ہے۔ خلا خود کو پُر کرنے کے لیے آس پاس کی چیزوں کو کھینچتا ہے۔ ہوائی جہاز اسی اصول پر چلتے ہیں۔ جہاز کا پنکھا سامنے کی ہوا کو پیچھے کی طرف دھکیلتا ہے۔ اس طرح

آگے خلا پیدا ہوتا ہے ۔ وہ جہاز کو آگے کھینچتا ہے ۔

اسی اصول پر ویکیوم کلینر (VACUM CLEANER) بھی کام کرتا ہے ۔ یہ خاک کے ذرّوں کو کھینچ کھینچ کر اپنے اندر بھر لیتا ہے اور خاک میں اَٹی ہوئی دری یا قالین صاف ستھرا نظر آنے لگتا ہے ۔ اب ہم آپ کو اس "ویکیوم کلینر" کی بابت ایک چھوٹی سی نظم سُنا کر بات کو ختم کرتے ہیں :۔

ویکیوم کلینر کے اک تاجر
نام ہے جس کا کوڑا پنکھی
یا کہہ لیجیے کوڑا پھنکنی
(کوڑا پھانکنے والی مشین)
پہنچے ایک نئی بستی میں
اور اک گھر پر جاکر بولے
پھینک کے فرش پہ ڈھیر سا کوڑا:
"یہ نہ چُنے گر اِک اِک ذرّہ
اِس کوڑے کا
تو پھر آپ یہ سارا کوڑا
مجھ کو کھلائیں"
سُن کر صاحبِ خانہ بولے:
"لیجیے حاضر ہے یہ چمچہ
بسم اللہ!
بجلی تو یہاں ہے ہی نہیں"۔

خاص نمبر آپ کو کیسا لگا ؟ اپنی رائے لکھنا نہ بھولیے ۔

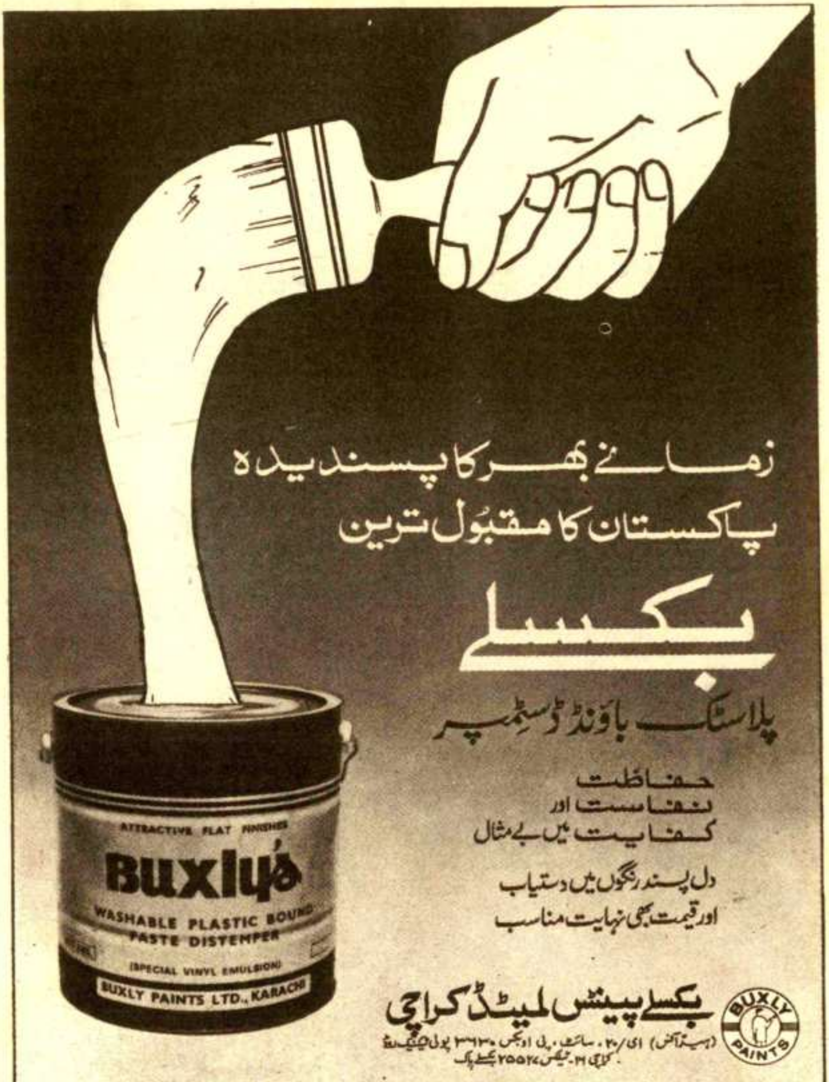

زمانے بھر کا پسندیدہ
پاکستان کا مقبول ترین
بکسلے
پلاسٹک باؤنڈ ڈسٹمپر
حفاظت
نفاست اور
کفایت میں بے مثال
دل پسند رنگوں میں دستیاب
اور قیمت بھی نہایت مناسب
بکسلے پینٹس لمیٹڈ کراچی
(ہیڈ آفس) ای/۲۰، سائٹ، پی او بکس ۳۶۱۳۰ پولی ٹیکنیک
کراچی ۲۱۔ ٹیلکس ۲۵۵۲۷ بکسلے پاک
ATTRACTIVE FLAT FINISHES
Buxly's
WASHABLE PLASTIC BOUND
PASTE DISTEMPER
(SPECIAL VINYL EMULSION)
BUXLY PAINTS LTD., KARACHI
BUXLY
PAINTS

United 2/86

میرزا ادیب

باجی جی

باجی جی کا اصل نام کیا ہے قصبے کے صرف وہ لوگ جانتے ہیں جنھوں نے یہاں پر چالیس پچاس برس گزارے ہیں۔ وہ کہتے ہیں باجی جی کا پیدائشی نام سکینہ بیگم ہے مگر یہ لوگ کبھی جب باجی جی کا ذکر کرتے ہیں تو انھیں سکینہ بیگم نہیں باجی جی ہی کہتے ہیں۔

قصبے کے رہنے والے باجی جی کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ وہ جس گلی میں رہتی ہیں اُس کا نام بھی باجی کی گلی مشہور ہو گیا۔

باجی جی کی عمر پچاس سے اوپر ہے۔ جس مکان میں رہتی ہیں اس کا صحن کافی وسیع ہے۔ یہ وسیع صحن ایک مدرسے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ صبح سویرے جب باجی جی اپنے گھر کے کاموں سے فارغ ہو جاتی ہیں تو صحن میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس وقت تک اِرد گرد کے بچے کافی تعداد میں آکر بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔ باجی انھیں پڑھانا شروع کر دیتی ہیں اور دوپہر کے بعد تک پڑھاتی رہتی ہیں۔

یہ ان کا روزمرّہ کا کام ہے اور یہ کام وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔

قصبے کے لوگ اس وجہ سے تو ان کی عزت کرتے ہی ہیں کہ یہ قصبے میں علم کی روشنی کم سے کم پینتیس برس سے پھیلا رہی ہیں اور اپنے قصبے میں ہی نہیں آس پاس کے قصبوں میں

بھی ان کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے جس نے ان کی عزت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس دوسری وجہ سے بھی لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔

باجی جی جب پندرہ سولہ برس کی تھیں تو انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جو اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔ باجی جی کے سارے شاگردوں کو بھی یہ کارنامہ معلوم ہے۔ کوئی نیا شاگرد مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو گو وہ بھی یہ کارنامہ سُن چکا ہوتا ہے، مگر چاہتا ہے کہ اسے خود باجی جی کی زبانی سُنے۔ باجی جی اس کی خواہش پوری کرنے میں دلی خوشی محسوس کرتی ہیں اور اسے خود اپنی نوجوانی کا واقعہ سُنا دیتی ہیں۔

احسن اس مدرسے میں داخل ہوا تو چُھٹّی کے دن بھی صحن میں بیٹھا رہا۔ باجی جی اندر چلی گئیں اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر کسی کام سے باہر نکلیں تو احسن کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"کیوں بیٹا! تم گھر نہیں گئے؟"

"باجی جی! ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

باجی جی اس کے قریب آ گئیں، "کہو بیٹا! کیا بات ہے؟"

احسن دو تین لمحے تو خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا "باجی جی! میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی کہانی آپ کی زبانی سنوں۔"

"ارے پگلے!" باجی جی مسکرانے لگیں، "مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔ اب یوں کرو گھر جاؤ، کھانا کھاؤ اور شام کے وقت اپنی امّی سے اجازت لے کر آ جاؤ۔ کہو ٹھیک ہے؟"

"جی بالکل ٹھیک ہے۔"

احسن بستہ اُٹھا کر چلا گیا اور اُدھر شام ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہی تھا کہ آ گیا۔

"امّی سے اجازت لے کر آئے ہو نا؟" باجی جی نے سب سے پہلا سوال کیا۔

"اجازت دے دی ہے میری امّی نے۔"

باجی جی اُسے اندر ایک کمرے میں لے گئیں۔ چار اور بچّے بھی آ گئے۔ احسن نے اپنے دوستوں کو بتا دیا تھا کہ باجی جی آج مجھے اپنی کہانی سنائیں گی۔ ان بچّوں نے بھی اپنی ماؤں سے یہ کہانی سُن رکھی تھی۔ احسن کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ یہ کہانی باجی جی سے سُنیں۔ اس لیے وہ بھی احسن

کے بعد وہاں پہنچ گئے۔
باجی جی نے بچّوں کو چائے پلائی اور جب وہ چائے پی چکے تو بولیں، "لو بھئی! اب سنو وہ واقعہ جسے سُننے کے لیے تم آئے ہو!"
سب کی آنکھوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ بڑی توجہ سے باجی جی کے چہرے کو دیکھنے لگے۔
"بچّو! آج تو ہمارے قصبے کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ بہت سارے محلّے، بازار اور گلیاں آباد ہیں مگر جس زمانے کا میں واقعہ سُنا رہی ہوں اس وقت اس کی آبادی بہت کم تھی۔ لوگ اِدھر آتے ہوئے ڈرتے تھے۔"
احسن جھٹ بول پڑا، "وہ کیوں باجی جی، وہ کیوں ڈرتے تھے؟"
"تم نے ٹھیک سوال کیا ہے احسن بیٹا! لوگ اس وجہ سے یہاں آباد ہونا نہیں چاہتے تھے کہ قصبے سے کچھ دُور ایک ندی بہتی تھی۔"
"ندی بھی، بہتی تھی تو کیا ہوا۔" احسن نے سوال کیا۔
"اس وقت بہتی تھی۔ مدّت ہوئی سوکھ چکی ہے۔ اس کا پانی ایک بہت بڑے تالاب میں جمع کر لیا گیا ہے۔ یہ پانی صاف کر کے پینے کے کام آتا ہے۔ تو اس ندی میں کبھی کبھی ایسی طغیانی آجاتی کہ گھر کے گھر تباہ ہو جاتے تھے۔ اب ایسا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس زمانے میں ہمارا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ میرے ابّو کاشت کار تھے۔ انھوں نے کما کر جتنا رُپیہ جمع کیا تھا اس سے ہم یہی مکان خرید سکتے تھے۔"
باجی جی ذرا دیر رُکیں۔
"ہاں تو میں تمھیں بتا رہی تھی کہ میں، میرے ابّو، میری امّی اور میرا چھوٹا بھائی ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شہر سے ہماری خالہ جان ہمارے ہاں چند روز گزارنے کے لیے آگئیں۔ جب وہ آئیں تو بالکل ٹھیک تھیں مگر دو دن کے بعد ان کے دمے کی بیماری ایک دم بڑھ گئی۔ بچّو! دمے کی بیماری میں سخت کھانسی آتی ہے۔ انسان کا سانس رُک رُک جاتا ہے۔ دمے نے خالہ جان پر جو حملہ کیا تھا وہ بڑا سخت تھا۔ دن کے وقت تو کھانسی آتی رہی اور وہ سنبھل جاتی تھیں۔ رات کو یہ ہوا کہ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ایک دفعہ تو کھانستے کھانستے چارپائی سے نیچے گر پڑیں۔

ہمارے ابّا جان گھر میں تھے نہیں۔ وہ کھیت کی سبزیاں بیل گاڑی میں لاد کر شہر کی منڈی میں چلے جاتے تھے۔ اور کئی روز کے بعد واپس آتے تھے۔ وہ گھر میں ہوتے تو وہ خود شہر میں جا کر ڈاکٹر کو لے آتے۔ وہ تو تھے نہیں ڈاکٹر کو کیسے بُلا کر لایا جائے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اُدھر خالہ جان کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تھی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلا کر لانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ ندی میں طغیانی آگئی تھی اور کسی کو خبر نہیں تھی کہ کتنا پانی قصبے میں آگیا ہے۔ اور کہاں کہاں پھیل گیا ہے۔ اس وقت میرا چھوٹا بھائی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایسی خطرناک حالت میں ایک چھوٹا سا لڑکا کیسے گھر سے باہر جا سکتا ہے۔ خالہ جان نے اسے بہت روکا مگر وہ بولا "خالہ جان! شہر یہاں سے قریب ہی تو ہے۔ میں نے ایک ڈاکٹر کا گھر دیکھ رکھا ہے۔ چلا جاؤں گا۔"

"ندی میں طغیانی آئی ہوئی ہے بیٹا۔" امّی بولیں۔

"کوئی بات نہیں امّی! مجھے ایک اونچے راستے کا علم ہے۔ وہاں پانی نہیں چڑھ سکتا۔"

باجی جی خاموش ہو گئیں۔

"تو باجی جی، آپ کا بھائی چلا گیا؟"

باجی جی نے سر ہلا کر ہاں کے انداز میں جواب دے دیا۔

"میں اور امّی جو کچھ کر سکتی تھیں وہ ہم نے کیا لیکن خالہ جان کی کھانسی تھمتی ہی نہیں تھی۔ میرے بھائی الطاف کے جانے کے بعد ہم اس کی طرف سے بھی فکر مند ہو گئے تھے۔ الطاف جب گھر سے گیا تھا تو رات کے دس بجے ہوں گے۔ خیال تھا کہ گھنٹے سوا گھنٹے تک لوٹ آئے گا مگر بارہ بج گئے تھے اور اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ امّی کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور خالہ جان کا یہ عالم تھا کہ وہ اس فکر سے کہ نہ جانے الطاف کہاں ہے اور اس پر کیا بیت رہی ہے، اپنی بیماری بھی بھول گئی تھیں۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا تو میں نے امّی سے کہا، "امی! میں جاتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی نہیں۔"

خالہ تو میرے جانے کا سن کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگیں۔ کھانسی کی وجہ سے ان کے منھ سے آواز نکلتی ہی نہیں تھی۔

میں نے کہا، "امی! آپ فکر نہ کریں۔ میں بالکل خیر خیریت سے واپس آجاؤں گی الطاف کے ساتھ ...."

امی اور خالہ دونوں نہیں مانتی تھیں۔ پھر بھی لالٹین جلا کر میں نے ہاتھ میں لی۔ اس زمانے میں گھروں کے اندر لالٹینیں ہی جلائی جاتی تھیں۔ باہر اندھیرا تھا۔ میں لالٹین کی مدّھم روشنی میں قدم اُٹھانے لگی۔

جس راستے پر میں جا رہی تھی وہاں پانی نہیں پہنچا تھا مگر قریب سے اس کے شاں شاں کی آواز آ رہی تھی۔ میں چلتی بھی جا رہی تھی اور دعا بھی مانگتی جا رہی تھی، "یا اللہ جی! میرا بھائی الطاف یہیں کہیں مل جائے۔"

یہ وہ راستہ تھا جو باقی راستوں سے اونچا تھا۔ طغیانی کے دنوں میں یہیں سے گاڑیاں شہر کو جاتی تھیں۔ میں چلتی گئی ــ چلتی گئی۔ یکایک میں نے اپنے دائیں طرف ایک چیز دیکھی ــ تیزی سے اُدھر گئی تو الطاف زمین پر پڑا تھا۔

الطاف، الطاف کہہ کر میں نے اسے بار بار پکارا۔ اس کا بازو ہلایا، ماتھا سہلایا مگر وہ تو بے ہوش ہو چکا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ میں کئی منٹ تک اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام رہی۔ ضروری تھا کہ اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔ اس کے لیے میں نے لالٹین کا کُنڈا منھ میں دبا لیا اور اسے بڑی مشکل سے اُٹھا کر گود میں لے لیا۔ اٹھانے کو تو میں نے اسے اٹھا لیا مگر ایک قدم اُٹھانا بھی دوبھر تھا۔

میں نے ہمّت سے کام لیا اور بڑی دقت کے ساتھ چلنے لگی۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ لالٹین کی گرم چمنی بار بار میری ٹھوڑی کو چھو دیتی تھی اور میں تڑپ اُٹھتی تھی، مگر رُک تو سکتی نہیں تھی۔ میری ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں اور ٹھوڑی میں بڑا درد ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی گری کہ جب گری لیکن بھائی کی زندگی کا معاملہ تھا۔ کشتی کی طرح چلتی گئی اور اللہ اللہ کر کے شہر میں پہنچ گئی۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا ابھی کافی تھا۔ میں اپنی لالٹین کی بہت مدّھم روشنی میں چلی جا رہی تھی۔ ایک سائکل سوار قریب سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر وہ سائکل سے نیچے اُتر پڑا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا بھائی بے ہوش ہے۔ کسی ڈاکٹر کا پتا بتائیے۔ اس نے کہا، "ہسپتال قریب ہے اسے وہاں لے جائیے۔" اس نے مجھے ہسپتال کا پتا بتایا اور چلا گیا۔

واقعی ہسپتال قریب تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جیسے ہی میں دروازے سے اندر داخل ہوئی ایک نرس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ میری بات سُنی تو اسی وقت اسٹریچر اور ہسپتال کے دو ملازموں کو لے آئی۔

اس مہربان نرس نے میری بڑی مدد کی۔ میرے بھائی کو حادثات کے وارڈ میں لے گئی۔ جو ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود تھا اس نے الطاف کو سب سے پہلے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ وہ ہوش میں آگیا تو اس نے بتایا کہ وہ چلتے چلتے ایک بھاری پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا۔

اسے بڑی چوٹیں آئی تھیں۔ جسم کے کئی حصّوں سے خون بہ چکا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس نے مجھے تسلّی دی مگر میرا دل بُری طرح پریشان تھا۔ مجھے امّی اور خالہ جان کی فکر بھی تھی۔ امی نہ جانے کس حال میں ہوں گی اور خالہ جان کی کیا حالت ہوگی۔

الطاف کی مرہم پٹی ہو چکی تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو وہ مجبوری بتائی جس کی وجہ سے میرا بھائی اور میں گھر سے باہر نکلے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "بیٹی! میں ضرور تمھارے ساتھ چلا جاتا مگر میں ڈیوٹی پر ہوں۔" میں رو پڑی۔ ڈاکٹر کے دل پر میرے رونے کا بڑا اثر ہوا۔ بولے: "میں ایک ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ ان سے یہاں آنے کی درخواست کروں گا۔ وہ آ گئے تو میں ضرور تمھارے ساتھ چلوں گا۔ انھوں نے فون کیا۔ ان کے دوست ڈاکٹر نے ہسپتال میں آنے کی ہامی بھرلی۔ چند منٹ بعد میں ڈاکٹر صاحب کی کار میں بیٹھی تھی اور کار اسی راستے سے جا رہی تھی جس سے میں آئی تھی۔ پانی اس راستے پر بھی پہنچ چکا تھا مگر زیادہ نہیں تھا۔

سفر ختم ہوا اور کار میرے گھر کے سامنے رُک گئی۔ امی اور خالہ جان کی حالت سخت خراب تھی۔ لگتا تھا دونوں کے حواس قائم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خالہ جان کو انجکشن لگایا تو وہ کچھ سنبھل گئیں۔ الطاف ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اس سے دونوں سخت پریشان تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں یہ کہہ کر تسلّی دی کہ اس کی مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔ دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

جانے سے پہلے انھوں نے خالہ جان کے لیے چند پُڑیاں دیں جو میں نے انھیں آدھے آدھے

گھنٹے کے بعد کھلا دیں۔ اس سے ان کی حالت میں کافی فرق پڑ گیا۔ رات بیت گئی۔ صبح میں، امّی اور خالہ جان ہسپتال جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب کار میں آ گئے۔ ان کے ساتھ الطاف بھی تھا۔

الطاف کو زندہ سلامت دیکھ کر امی اور خالہ جان کی فکر دُور ہو گئی۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا وہ بولے، "میں نے تو کوئی خاص کام نہیں کیا۔ خاص کام تو اس بیٹی نے کیا ہے۔ ایسی بہادر بیٹی پر ساری قوم کو فخر ہے۔" یہ کہہ کر وہ بڑے پیار اور محبّت سے میرے سَر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"تو باجی جی آپ کا بھائی کہاں ہے؟" احسن نے پوچھا۔

"وہ پنڈی میں رہتا ہے اپنی بیوی کے ساتھ آتا جاتا رہتا ہے۔"

"شکریہ باجی جی۔"

"احسن بیٹا شکریہ کیسا۔ تم نے کہا کہانی سناؤ۔ میں نے سُنا دی۔"

باجی جی مسکرانے لگی تھیں اور بچّے انھیں ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن میں محبّت بھی تھی اور احترام بھی۔

وہ کون تھا؟

• وہ پونے دو سال کا تھا کہ یتیم ہو گیا • اس نے غربت میں آنکھ کھولی مگر اعلا تعلیم حاصل کی اور ملک کا سب سے بڑا لیڈر بنا • وہ افسر بنا، کمشنر بنا، اس کو وزارت پیش کی گئی، مگر اس نے غلامی پسند نہ کی • اس نے انگریزی میں اخبار نکالا، اُردو میں اخبار نکالا۔ عوام کو جگایا • وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھا • وہ سچائی اور آزادی کے جرم میں بار بار قید کیا گیا • وہ دُھن کا پکا اور بات کا سچّا تھا • اُس نے وطن کے لیے لڑتے لڑتے جان دے دی • وہ کون تھا؟ وہ محمد علی جوہر تھا۔ مسعود احمد برکاتی کے قلم سے مولانا محمد علی جوہر کے حالات جو مختصر ہونے کے باوجود مکمل اور معتبر ہیں۔

جوہرِ قابل اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۷ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی

سلسلہ ۲۷۹

معلوماتِ عامّہ

اِس بار خاص نمبر کی وجہ سے ۱۵ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ ان کے جوابات ۲۰ جولائی ۱۹۸۹ء تک بھیج دیجیے۔ تمام صحیح جوابات بھیجنے والوں کو ایک اچھی کتاب انعام میں دی جائے گی اور ان کی تصویریں بھی شائع کی جائیں گی۔ ۱۴ صحیح جوابات والوں کے نام شائع کیے جائیں گے۔

۱۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کُل کتنے سال تک وحی نازل ہوئی؟

۲۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو حضورؐ نے سیف اللہ کا خطاب کس جنگ کے موقع پر دیا؟

۳۔ بتایئے پاکستان میں کن سرکاری عہدے داروں کی گاڑیوں پر نمبر پلیٹیں نہیں ہوتیں۔

۴۔ بتایئے معز الدین محمد بن سام کس مشہور مسلمان بادشاہ کا نام تھا۔

۵۔ بتایئے ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو قاہرہ میں پاکستانی طیارے کے حادثے میں کُل کتنے آدمی ہلاک ہوئے۔

۶۔ "گنی" برِاعظم افریقہ کا ایک آزاد ملک ہے۔ بتایئے یہ کب آزاد ہوا تھا۔

۷۔ پاکستان کا قومی کھیل تو ہاکی ہے۔ بتایئے برطانیہ کا قومی کھیل کون سا ہے۔

۸۔ امریکا کی اُس ریاست کا نام بتایئے جہاں سب سے زیادہ بند باندھے گئے۔

۹۔ بارباڈوس کے دارالحکومت کا نام معلوم ہے آپ کو؟

۱۰۔ روس کی مرکزی حکومت کے دفاتر جس عمارت میں ہیں اس کا نام کیا ہے؟

۱۱۔ سوئزرلینڈ میں ماہ جولائی کا اوسط درجۂ حرارت کتنا ہوتا ہے؟

۱۲۔ نہر پانامہ شمالی اور جنوبی امریکا کے درمیان کن دو سمندروں کو ملاتی ہے؟

۱۳۔ ایران کی قومی اسمبلی کو کس نام سے پکارا جاتا ہے؟

۱۴۔ پالک، آلو، بینگن میں سے سب سے زیادہ فولاد کس سبزی میں پایا جاتا ہے؟

۱۵۔ بتایئے جارج ایسٹ مین نے کیمرا ایجاد کیا تھا، ٹیلے وژن ایجاد کیا تھا یا گھڑی ایجاد کی تھی۔

بچپن کی باتیں

حکیم محمد سعید

ہمارے یہ برکاتی صاحب اچھّے دل چسپ انسان ہیں، ہمیشہ ان کو شرارت ہی سوجھتی تھی۔ جب بھی ہمدرد نونہال کا خاص نمبر نکلتا یہ آتے اور فرماتے: خاص نمبر کے لیے اپنی چند شرارتیں تحریر فرما دیں۔ میں ان کو دیکھتا۔ اوپر سے نیچے تک! اچھے خاصے شریف آدمی لگتے، مگر سوجھتی شرارت تھی! میرے ساتھی ہیں۔ ان کی بات ٹالتا تو کیسے! قلم اُٹھایا اور چند شرارتیں لکھ دیں۔ وہ چھپیں۔ میرے نونہالانِ وطن نے ان کو پڑھا اور پھر لاتعداد خطوط آئے، شرارتوں سے بھرے ہوئے۔ میں ان کو پڑھتا اور میرا دل خوش ہوتا کہ میرے نونہال مجھ سے بڑی محبّت کرتے ہیں۔ ہاں، اور نونہال بھی کم شریر نہیں ہیں۔ فرمائیے یہ شرارت نہیں تو کیا ہے کہ سیکڑوں نونہال مجھے عید کارڈ بھجواتے ہیں۔ بہت سے اپنے پتے نہیں لکھتے! اب انکل سعید ہیں کہ حیران اور پریشان! جواب دیں تو کیسے دیں! اچھا بات تو جناب برکاتی صاحب کی شرارت سے چلی تھی۔ اس بار وہ تشریف لائے۔ نہایت سنجیدہ، متین بنے ہوئے، فرمانے لگے:

ہمدرد نونہال کے خاص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرما دیں۔ یہ کہہ کر ان کا دل مسکرایا، لاکھ چھپایا، مگر دِل کی مسکراہٹ چہرے پر آ ہی گئی۔

ہرن کے شکاری جناب حکیم محمد سعید

دوسرے سانس میں فرمایا : اس بار اپنے برادرِ گرامی کو موضوع بنائیے !
یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی شرارتیں لکھوں ؟ "معاذاللہ"، حلق سے عین کی آواز نکال کر برکاتی صاحب نے فرمایا : "میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی شرارتوں کا آپ کے برادرِ گرامی نے کیسے نوٹس لیا !"
اچھا ! بات تو وہی ہوئی نا کہ میں اپنی شرارتیں ہی لکھوں ! مگر برکاتی صاحب ! آپ نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے ! کیا میں ساری زندگی شرارتیں ہی کرتا رہا ہوں ؟ ارے بھائی، میں نے اچھے کام بھی تو کیے ہیں !
خیر جناب، بات ختم ہوئی اور برکاتی صاحب تشریف لے گئے ۔ ان کو جیسے اطمینان ہو گیا ہو کہ میں ہمدرد نونہال کے لیے کچھ لکھ دوں گا، دل میں تو آیا کہ میں ایک اور شرارت کروں ! یعنی ٹال دوں، اور کچھ نہ لکھوں ! مگر ان کا دل ٹوٹ جائے گا ۔ دل توڑنا شیوۂ مسلم نہیں ہو سکتا !

جناب حکیم محمد سعید شکاری کے لباس میں

میرے نونہالوں ! میں نے جتنی شرارتیں کی تھیں شاید میں سب ہی تو لکھ چکا ہوں ۔ میری شرارتوں نے بہت سے نونہالوں کو شریر بنا دیا ہے ۔ اب میں شریر نونہالوں کی فوج تو تیار کرنے سے رہا ۔ سوچا کہ اس بار کوئی کام کی بات بھی ہو جائے ۔ یعنی شرارت کے بجائے شرافت کا ذکر ہو جائے ۔
لو بھئی سنو ! ایک بار کیا ہوا کہ حضرت سلطان غازی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پر گئے ۔ یہ مزار اقدس قطب صاحب مہرولی، دلّی سے کوئی ۱۷ ـ ۱۸ میل دور جنگل بیابان میں ہے ۔ ہر سال ۱۷ شوال المکرم کو عرس ہوتا تھا ۔

لوگ پہلے قطب صاحب آتے۔ قطب مینار کو شوق اور فخر سے دیکھتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مرجعِ خلائق مزار شریف پر آتے۔ فاتحہ خوانی کرتے۔ ادب سے اُلٹے پاؤں باہر آتے اور اپنی منزلوں کو ہزار امیدوں کے ساتھ سدھارتے۔

میں جب بھی مہرولی (صوبہ دہلی) جاتا پہلے مزارِ خواجہ رح پر حاضری دیتا۔ آج میں جب اپنی دہلی جاتا ہوں تو خواجہ صاحب کے ہاں حاضری ضرور دیتا ہوں۔ خیر تو صاحب ہم ۱۷ شوال کو دہلی سے نکلے، مہرولی آئے۔ یہاں ہمارے دوست جناب اشتیاق حسین شوق منتظر ہوتے۔ بڑے اچھے شاعر تھے۔ سارے انتظامات وہ کرتے تھے۔ اپنا کلام سناتے تو تخلص "شوق" کرتے، مگر جب دوسروں کا کلام پیش کرتے تو 'انقلاب' تخلص فرماتے تھے۔ سلطان غازی رح کے مزار کے قریب ہمارے لیے خیمے لگ جاتے۔ رات کو عُرس کے بعد لوگ وہاں ہی شب گزارتے۔ ہم بھی خیموں میں رہتے۔ دوسرے دن شکار کو نکل جاتے۔ یہاں ہرن کا شکار ہوتا تھا۔

رات بھر فاتحہ خوانی میں گزری۔ صبح نُور کے تڑکے ہمارا قافلہ شکاری کپڑوں میں ملبُوس ہرن کے شکار کو نکل گیا۔ میں بھی شان دار شکاری لباس پہنے تھا۔ برجیس، کوٹ، ہیٹ۔ خود کو اب اس لباس میں دیکھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ میرے ہاتھ میں بارہ بور تھی۔ کارتوس ایس۔جی۔ میں نے کھیتوں کی طرف رُخ کیا۔ بھائی جان محترم میرے ساتھ تھے اور رحمت خاں ہمراہ۔ رحمت خاں کی آنکھیں غضب کی تیز۔ میلوں جاکر ہرن کو تاڑ لیتیں۔ شکار دیکھتا وہ تھا، مارتا میں تھا!

گنّے کے کھیت تھے۔ خیال تھا کہ کوئی ہرن یہاں ضرور ہوگا۔ میں ہر طرح تیار کہ ہرن قلانچیں مارے اور میں ہوا میں اسے مار گراؤں، مگر ہرن نہیں ملا۔ میں نے ایک گنّا توڑ اُسے کھانا شروع کر دیا۔ جب آدھے سے زیادہ گنّا کھا چکا تو بھائی جان محترم نے فرمایا:

"کھیت والے سے اجازت لے کر گنّا توڑا ہے نا؟"

میں سٹپٹا گیا۔ وہاں کھیت والا کہاں تھا۔ میں نے سچی بات کہہ دی کہ یہ تو خیال نہیں رہا۔ مگر صرف اتنی بات بھائی جان محترم کو قبول نہ تھی۔ ان کا ارشاد ہوا کہ ہم جب تک گنّے کا معاوضہ ادا نہ کر دیں یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔ کھیت والے کا انتظار کرنا ہوگا۔

میں نے اپنے بھائی جان محترم کے حکم سے ایک بار بھی سرتابی آج تک نہیں کی ہے۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ رحمت خاں سے کہا کہ بھائی، تم میلوں سے ہرن کو دیکھ لیتے ہو۔ آج ذرا کھیت والے کو دیکھو کہ کہاں ہے! مگر کھیت والا نہ ملا۔ شکار دَھرا کا دھرا رہ گیا۔ کھیت والا کوئی ۱۲ بجے ہاتھ لگا۔ اس سے سب سے پہلے معافی مانگی کہ اس کے کھیت کا گنّا اس کی اجازت کے بغیر توڑا گیا۔ پھر اسے زبردستی پیسے دیے۔ شکار ختم۔ ہم سب اپنے خیمے پر واپس آگئے۔ اطمینان کئی تھے۔ ایک تو یہ کہ بھائی جان محترم کے ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ دوسرے یہ کہ کھیت والے سے معافی مانگنے کا موقع مل گیا اور ایک اور اطمینان یہ کہ برادرِ محترم حافظ محمد یحییٰ ایک ہرن مار لائے تھے!

نیا سلیپر

ایک شام میں نے ایک نیا سلیپر خریدا۔ بڑا چمک دار تھا۔ اس کی چمک دَمک سے دِل خوش ہوگیا۔ ذرا مہنگا ملا۔ کوئی سوا رُپے کا تھا! اسے پہن کر میں ہمدرد منزل میں پہنچا۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ بھائی جان دواخانہ بند کرانے کے لیے اُٹھ رہے تھے، میں نے سیڑھیاں چڑھیں، مگر اس شان سے کہ کھٹ پٹ کھٹ پٹ سے زینہ گونج اُٹھا۔ بھائی جان محترم نے سب سے پہلے سلیپر کی تعریف کی۔ دوسرے سانس میں فرمایا: "کیا یہ ضروری تھا کہ اس، نئے سلیپر سے زینے کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے؟ مناسب ہے کہ آدمی چلے تو آواز نہ ہو!"

میں واقعی بڑا شرمندہ ہُوا۔ وہ دن ہے (۱۹۳۱ء) اور آج کا دن، میں جب چلتا ہوں تو میرے قدم رکھنے کی کوئی آواز نہیں سُن سکتا۔ بھائی جان محترم کی رہنمائی شریعتِ اسلامی کی روشنی میں تھی۔ قرآن حکیم میں واضح ہدایت ہے کہ زمین پر پیر پٹخ کر نہ چلو!

دسترخوان پر ہنسی!

یہ یقیناً ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سخت گرمیوں کے رمضان۔ ایسے سخت کہ برف کی صورت دیکھ کر دل ٹھنڈا ہو جاتا۔ مسجد میں اذان ہوئی اور میں

جناب حکیم محمد سعید اپنے بھائی جان محترم حکیم عبدالحمید کے ساتھ۔ ایک نادر تصویر

وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ " روزے والو روزہ کھول لو۔ روزے داروں روزہ کھول لو "۔ یہ ہم بچّوں کا معمول تھا کہ مسجد میں جاکر کھڑے ہو جاتے۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہم محلّے بھر کا روزہ کھلوا دیتے۔ گھر آیا۔ دسترخوان پر بھائی جان محترم، والدہ معظّمہ، بہنیں وغیرہ سب ہی تھے۔ اُس دَور میں خاندان بھر اکھٹّا ہو جاتا تھا۔ خلوص اور اُنس کی فضا تھی۔ ایک انسان دوسرے انسان سے محبّت کرتا تھا۔

کہ جانے بھائی عبدالوحید (مرحوم) نے کیا حرکت کی کہ میں کھِل کھلا کر ہنس دیا۔ ابھی میری

ہنسی ختم نہ ہوئی تھی کہ رُخسار پر ایک زناٹے کا تھپّڑ پڑا۔ یہ بھائی جان محترم کا ہاتھ تھا جس نے چودہ طبق روشن کر دیے ! ہدایت یہ ملی کہ دسترخوان کے آداب یہ ہیں کہ انسان اس پر بیٹھ کر ٹھٹّے نہ مارے۔

میں پُوری زندگی صرف دو بار بھائی جان محترم سے پٹا ہوں۔ ایک ۱۹۳۳ء میں اور اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں کراچی میں۔ جب ہم حج کے لیے براستہ کراچی، جدّہ جا رہے تھے۔ اس کراچی کے زناٹے کا حال پھر کبھی سناؤں گا ! اس کے علاوہ زندگی بھر اور آج بھی، بھائی جان محترم نے ہر ہدایت مجھے خود عمل کر کے دی ہے۔ انھوں نے میری تربیت کی خاطر اپنے سارے آرام تج دیے۔ وہ ساری زندگی، بلکہ آج تک خود عمل کر کے نصیحتیں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے حکیم محمد سعید بنا دیا۔

تن درستی ہزار نعمت ہے

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تن درستی ہزار نعمت ہے

مشہور مثل ہے کہ جان ہے تو جہان ہے اور یہ ہے بھی درست، کیوں کہ زندگی سے مُراد تن درستی ہے۔ بیمار تو مُردے سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے بزرگ بھی ہمیشہ تن درستی کی تلقین فرماتے رہے، کیوں کہ ایک تن درست اور صحت مند جسم ہی میں ایک تن درست دماغ سوچ سکتا ہے۔ انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ مشین کا کوئی پُرزہ بگڑ جائے تو مشین بے کار ہو جاتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ پھر ایک انسان پر کئی فرائض عائد ہوتے ہیں، جو ایک تن درست انسان ہی انجام دے سکتا ہے۔ تمام دُنیا کے ملکوں میں تن درستی برقرار رکھنے کے لیے خاص قانون نافذ ہیں۔ بعض ملکوں میں تو ملاوٹ کی سزا موت ہے۔ قانون کے علاوہ تن درستی برقرار رکھنے کے لیے ادارے بھی قائم ہیں۔ اس کے علاوہ اس لیے بھی مالی امداد دی جاتی ہے کہ بچوں کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔ لیکن ہمارا وطن اس شعبے میں بہت پیچھے ہے، کیوں کہ خالص دودھ، دہی، مکھن اور گھی عنقا ہو گئے ہیں۔ یہ ایسی بنیادی چیزیں ہیں، جن سے تن درستی بحال رہ سکتی ہے۔

سعدیہ صدیقہ

خوشی کی پری

نصرت شاہین، دیپالپور

تارا چارپائی پر لیٹی آسمان کی طرف تکے جا رہی تھی۔ جگ مگ کرتے ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ تارا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آج اُس کی چچی نے پلیٹ ٹوٹ جانے پر اُسے رُوئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا تھا۔

تارا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کاش! میں پَری ہوتی! نیلے آسمان پر اُڑتی اور لوگوں کے دُکھ بانٹتی۔" اچانک تارا کے قریب ایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ جب تارا نے غور سے روشنی کی طرف دیکھا تو وہاں اُسے ایک پَری کھڑی نظر آئی۔ اس کے لباس سے رنگ برنگی شعاعیں پھُوٹ رہی تھیں۔ پَری کے سَر پر ہیروں کا تاج تھا۔ وہ بھی جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

پری نے تارا کی طرف اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اِدھر آؤ تارا!" تارا ڈرتی ڈرتی

چارپائی سے اُٹھ کے پَری کے قریب آکھڑی ہوئی۔ پری بولی،" میں پَریوں کی ملکہ ہوں۔ آج اِدھر سے گزر رہی تھی کہ تمھیں روتے ہوئے دیکھ کر رُک گئی۔ بتاؤ، تم کیوں رو رہی ہو؟"

تارا نے کہا،" اچھی پری! کیا تم مجھے اپنے جیسی پَری بنا سکتی ہو؟" پری مسکرائی اور بولی،" ہاں کیوں نہیں، لیکن وعدہ کرو کہ تمھاری ان پیاری آنکھوں میں پھر کبھی آنسو نہیں آئیں گے اور تمھاری مسکراہٹ دُکھی لوگوں کے دُکھ دور کرے گی۔" تارا نے وعدہ کر لیا۔ پریوں کی ملکہ بولی،" میں تمھیں خوشی کی پَری بناتی ہوں۔" اس نے اپنی پُرانی چھڑی گھمائی، تارا کے پُرانے لباس کی جگہ نیا لباس آگیا۔ اپنے جسم پر خوب صورت لباس دیکھ کر تارا خوشی سے اُچھل پڑی۔ اس کے علاوہ تارا کے سَر پر نیلے رنگ کا تاج بھی تھا جس میں نیلم جَڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے نیلی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

تارا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی اوپر کی، اس کے ساتھ ہی وہ اُڑنے لگی۔ تارا یعنی خوشی کی پری کی نظر اب ایک عمارت کی طرف تھی جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جب وہ بلڈنگ کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ایک فلیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ لوگ آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ فلیٹ کی مالکہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رو رو کر لوگوں سے کہہ رہی تھی، "میرے بچّے کو بچالو! وہ فلیٹ میں رہ گیا ہے۔" لیکن آگ میں کوئی بھی فلیٹ میں داخل ہونے کو تیار نہ تھا، بلکہ لوگوں نے اُسے بھی اندر جانے سے روک رکھا تھا۔ خوشی کی پری (تارا) تیزی سے فلیٹ میں داخل ہوگئی۔ اس نے فلیٹ کے کمرے میں بلکتے ہوئے بچّے کو اُٹھا کے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور جلدی سے باہر آنے لگی۔ اسی وقت بڑھتی ہوئی آگ نے اس کے لہراتے لمبے سیاہ بالوں کو پکڑ لیا۔ تارا پر تو بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح بچّے کو زندہ باہر لے جائے۔ وہ باہر تو نکل آئی، لیکن اتنی دیر میں اُس کے آدھے بال جل گئے۔ خوشی کی پری نے بچّے کو اُس کی ماں کے حوالے کر دیا۔ ماں خوش ہو کر اپنے بچّے کو پیار کرنے لگی۔ خوشی کی پری وہاں سے رخصت ہوگئی۔ اب ستارے آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے تھے۔ صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ خوشی کی پری نے اپنے پَر اُتار کے چھپا دیے اور عام لڑکی کے بھیس میں بازار میں گھومنے لگی۔

ایک جگہ اُسے بہت ضعیف بوڑھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں پر بڑے بڑے زخم تھے۔ وہ

ایک کوڑھی تھا اور بھیک مانگ رہا تھا۔ خوشی کی پری (تارا) کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس نے چھڑی گھمائی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے رُپے آگئے۔ خوشی کی پری نے وہ رُپے بوڑھے کے کشکول میں ڈال دیے اور اس سے بولی، "بابا! شام کو میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں گی۔" بوڑھے نے اُسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ خوشی کی پری آگے روانہ ہوگئی۔ سارا دن بازار میں گھومتی رہی۔ دوپہر کو اس نے گھنٹی کی آواز سُنی۔ اسکول کے بچّوں کی چھٹّی ہو گئی تھی۔ خوشی کی پری نے ننھے مُنّے بچّوں کو سڑک پار کروائی۔ اِسی طرح چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے شام ہوگئی۔ اب اسے اس بوڑھے فقیر کا خیال آیا جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اس کے گھر چھوڑ دے گی۔ وہ جلدی سے بوڑھے کے پاس آئی اور بولی، "باباجی! چلیے! میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔" بوڑھا اُسے دعائیں دینے لگا۔ خوشی کی پری بوڑھے کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بوڑھے کا گھر آگیا۔ اس نے خوشی کی پری کا شکریہ ادا کیا اور بڑے آرام سے گھر میں داخل ہو گیا۔ تارا کو حیرت ہوئی کہ یہ بوڑھا تو آسانی سے چل نہیں سکتا تھا، مگر اس وقت اتنے آرام سے گھر میں داخل ہو گیا۔

خوشی کی پری سب کچھ جاننا چاہتی تھی، لیکن اتنی دیر میں بوڑھے نے گھر کا دروازہ بند کرلیا۔

خوشی کی پَری نے چھڑی گھمائی اُس کے بازوؤں پر پَر نمودار ہو گئے۔ وہ اُڑ کر بوڑھے کے گھر میں داخل ہو گئی اور ایک طرف کھڑی ہو کے بوڑھے کی کارستانیاں دیکھنے لگی۔ بوڑھے نے سب سے پہلے اپنے ہاتھ دھوئے۔ یہ دیکھ کر تارا کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بوڑھے کے زخم بالکل صاف ہو گئے۔ اصل میں اس نے اپنے ہاتھوں پر جعلی زخم بنا رکھے تھے۔ پھر اس نے چہرے سے داڑھی مونچھیں ہٹائیں اور سر سے وِگ اُتاری۔ اب اُس بوڑھے کی جگہ ایک خوب صورت انسان کھڑا تھا۔
خوشی کی پری کو اُس پر بہت غصّہ آیا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑی:
"تمھیں شرم نہیں آتی! اچھے خاصے ہٹّے کٹّے ہو کر بھیک مانگتے ہو!"
جعلی فقیر تارا کی آواز سن کر گھبرا گیا۔ وہ حیران پریشان خوشی کی پری کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی شکل اس لڑکی جیسی تھی جو اُسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ خوشی کی پری نے جو اُسے یوں حیران ہوتے دیکھا تو بولی: "میں وہی لڑکی ہوں جو تمھیں یہاں تک چھوڑنے آئی تھی۔ میرا نام خوشی کی پری ہے۔ مجھے بتاؤ، تم یہ سب کچھ کیوں کرتے ہو؟"
نوجوان کو جیسے ہوش آگیا بولا: "میرا نام سلمان ہے۔ میں نے کافی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔ میری ماں نے دن رات محنت کر کے مجھے پڑھایا تھا۔ جب میں نے تعلیم مکمل کر لی تو مجھے نوکری نہیں ملی۔ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک دن میری ماں سخت بیمار ہو گئی۔ اُس کی دوا کے لیے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے مجبور ہو کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ کچھ پیسے ملے جن سے میں نے ماں کی دوا خریدی، لیکن وہ پھر بھی نہ بچ سکی۔ میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ سوچا کہ نوکری نہیں ملتی تو نہ ملے، بھیک مانگ کر ہی اپنا اپنا پیٹ بھر لینا چاہیے۔ بس اس دن سے میں نے بھیک مانگنی شروع کر دی۔"
خوشی کی پری نے کہا: "کیا بھیک مانگ کر تمھیں خوشی ہوتی ہے؟"
"نہیں، لیکن کیا کروں، بھوکا بھی تو نہیں رہ سکتا۔" سلمان نے کہا۔
"ایسی ذلّت کی کمائی سے تو بہتر ہے کہ انسان بھوکا مر جائے۔ کیا ہوا اگر نوکری نہیں ملتی۔ تم محنت مزدوری بھی تو کر سکتے ہو! آؤ میرے ساتھ، میں تمھیں محنتی لوگ دکھاتی ہوں۔" خوشی کی پری نے اپنی چھڑی کا ایک سرا نوجوان سلمان کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ اب وہ دونوں آسمان پر اُڑ رہے تھے۔ خوشی کی پَری ایک احاطے میں اُتری۔ یہ نابیناؤں کا ادارہ تھا۔ یہاں نابینا لوگ بیٹھے

کرسیاں بُن رہے تھے۔ خوشی کی پری وہاں سے اُڑی اور دوسری جگہ گئی۔ وہاں ٹانگوں سے معذور ایک بوڑھا، بچّوں کو پڑھا رہا تھا۔ ایک جگہ دونوں ہاتھوں سے محروم شخص اپنے پیروں کے انگوٹھوں سے قلم پکڑ کر خطاطی کر رہا تھا۔ خوشی کی پری نے سلمان کو ایسے اور بہت سے لوگ دکھائے جو معذور ہونے کے باوجود محنت کر کے کما رہے تھے۔ خوشی کی پری نے سلمان سے کہا، "یہ لوگ کسی پر بوجھ نہیں بنے ہیں، بلکہ خود محنت کر کے کما رہے ہیں۔ تم تو ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہو، پھر تم محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے؟" سلمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا:

"خوشی کی پری! مجھے معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ محنت مزدوری سے روٹی کماؤں گا۔"

خوشی کی پری مسکرا دی اور بولی، "ہمارے ملک کے تم جیسے پڑھے لکھے بے کار نوجوان محنت مزدوری کو عیب نہ سمجھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا ملک ترقی نہ کر سکے۔"

خوشی کی پری ایک بار پھر آسمان پر اُڑتی پھر رہی تھی کہ اُس کی نظر سلمان پر پڑی جو کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ اُس کی پیشانی سے بہتا پسینا مٹی میں مل کر اُسے سونا بنا رہا تھا۔ خوشی کی پری کو بڑی خوشی ہوئی۔ خوشی کی پری اور اس کی سہیلیاں ہنستی مسکراتی سمندر کی طرف جا رہی تھیں۔ سمندر کے پاس غم کا دیو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

خوشی کی پَری اور اس کی سہیلیوں کے ہنسنے کی آوازیں سُن کر غم کے دیو نے اپنا سَر اُٹھایا۔ خوشی کی پری نے اس سے پوچھا "اے غم کے دیو، تو رو کیوں رہا ہے؟"

غم کا دیو بولا "میں اس دنیا کو دیکھ کر روتا ہوں۔ غریب بچّے جنھیں پڑھنے کا شوق ہے وہ دن بھر محنت مزدوری کر کے بھی رات کو پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف جن کے پاس ساری سہولتیں موجود ہیں وہ پڑھائی سے جی چُراتے ہیں۔ انصاف کا یہ حال ہے کہ بے قصور پکڑے جاتے ہیں اور قصور وار چھوٹ جاتے ہیں۔ مال دولت کی وجہ سے بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔"

خوشی کی پَری غم کے دیو کی باتیں سُن کر مسکرائی اور بولی، "دیکھو تمھارے آنسوؤں سے سمندر کا پانی نمکین ہو گیا۔ پہلے اپنا منھ دھو لو۔" غم کے دیو نے سمندر میں غوطہ لگایا اور دوسرے ہی لمحے باہر نکل آیا۔ خوشی کی پَری بولی "بھائی غم کے دیو! وعدہ کرو کہ آئندہ آنسو نہیں بہاؤ گے۔" غم کے دیو نے وعدہ کر لیا۔ پھر خوشی کی پری بولی "خالی آنسو بہانے سے بگڑے کام سنور تو نہیں جایا کرتے۔ اُٹھو، لوگوں کی مدد کرو، مگر مسکراتے ہوئے۔ اگر تم مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ رونے بیٹھ گئے تو انھیں حوصلہ کون دے گا۔"

غم کے دیو نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ہنسی خوشی لوگوں کی مدد کرے گا۔ خوشی کی پَری اب خوشی خوشی گھر واپس آ رہی تھی کہ اچانک اُسے کسی نے جھنجھوڑ دیا۔ تارا نے ایک دَم آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے سرہانے اُس کی بچّی کھڑی تھیں۔

"تو کیا یہ سارا خواب تھا۔" لیکن اس خواب نے تارا کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ ہر کام بڑی خوش ہو کر کرتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتی۔ ایک دن یہی تارا ایک بڑی پروفیسر بن گئی۔ لیکن وہ یہ خواب آج بھی نہ بھولی جس نے اُس میں محنت، سچّائی اور مسکراتی زندگی کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔

- اگر تمھارے غصّے کو تمھاری خاموشی برداشت کر سکتی ہے تو تمھارا غصّہ رعب دار ہے۔
- اگر تمھاری زبان برداشت کر سکتی ہے تو تمھارا غصّہ تمھارا وکیل ہے۔
- اگر تمھاری جسمانی طاقت برداشت کر سکتی ہے تو تمھارا غصّہ جنگ و جدل ہے

اور اگر غصّہ اس سے بڑھ کر ہے تو پھر یہ ایک تماشا ہے۔

حلیم صاحب ایک بہت نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ رِٹایرڈ فوجی تھے۔ جنگ کے دوران وہ ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے تھے۔ انھیں خوشی تھی کہ اپنے وطن کی خاطر ان کی ٹانگ کٹی ہے۔ رِٹایر ہونے کے بعد بھی وہ اپنے وطن کے لیے کام کرتے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے تھے۔ وہ غریبوں اور مجبوروں کی مدد کرتے تھے۔ اُن کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا ارشد انجینیر تھا۔ منجھلا بیٹا خالد، وکیل تھا اور چھوٹا بیٹا ساجد اپنا کاروبار کرتا تھا۔ حلیم صاحب اپنے بیوی بچّوں سمیت ایک پُرانے سے گھر میں رہتے تھے۔ انھیں یہ پرانا گھر بہت عزیز تھا۔ وہ اپنے گھر کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بس یہ گھر ہی اُن کی کُل جائداد تھا۔

ایک دن ارشد نے سوچا کہ مکان بہت بڑا اور پُرانا ہے۔ کیوں نہ اس کی جگہ ایک ہوٹل بنوا لیا جائے۔ اس نے سوچ تو لیا، مگر حلیم صاحب سے کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ارشد اپنے ابّا جان کا ہر حکم مانتا اور ان کی خدمت بھی خوب کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ شاید ابّا جان مکان میرے نام کر جائیں۔ خالد اور ساجد بھی کچھ کم نہ تھے۔ وہ بھی اسی انداز میں سوچتے تھے۔ غرض ہر بیٹا اسی چکّر میں تھا کہ یہ مکان ابّا جان اسی کے نام کر دیں۔

ایک روز ارشد نے اس موضوع پر ابّا جان سے بات کی تو حلیم صاحب بہت ناراض ہوئے۔ بعد میں خالد اور ساجد نے بھی اسی طرح کی بات کی، مگر انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ ایک مکان کے

چکّر میں تینوں بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ۔ پہلے انھوں نے ایک دوسرے سے بولنا اور بات کرنا بند کیا ۔ اس کے بعد بات اور بڑھی ۔ اب ان میں اکثر لڑائی ہونے لگی ۔ حلیم صاحب کی کوشش تھی کہ ان کے بیٹے مِل جُل کر محبّت سے رہیں، مگر ان کی کون سُنتا ۔

ایک دن حلیم صاحب نے سوچا کہ وہ کب تک اپنے بیٹوں کو مکان گرانے سے روکیں گے ، جانے کب بُلاوا آجائے ! انھوں نے ہار مان لی اور اپنے بیٹوں کو جمع کر کے کہا کہ آنے والی ۲۳ مارچ کو مکان گروا دیں اور جو کچھ بنانا چاہتے ہیں بنا لیں ۔ ان کے بیٹے بہت خوش ہوئے ۔ پھر ۲۳ مارچ کا دن بھی آ گیا ۔ گھر کا تمام سامان دوسرے مکان میں تبدیل کر دیا گیا ۔ حلیم صاحب خالی گھر میں کھڑے اس کے در و دیوار کو دیکھ رہے تھے ۔ پھر انھوں نے تینوں بیٹوں کو بُلایا اور کہا :

"جانتے ہو، آج اس مکان کی سال گرہ ہے ۔ یہ گھر میرے والد (تمھارے دادا) اور میں نے اپنا خون پسینا ایک کر کے بنایا تھا ۔ تمھارے دادا ایک مُحبِّ وطن انسان تھے ۔ پاکستان کو بنانے کی تحریک میں انھوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جب قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی تو اسی دن انھوں نے اس مکان کی بُنیاد رکھی تھی ۔ انھیں یہ نشانی ، یہ گھر بہت عزیز تھا ۔

یہ میرے اور تمھارے دادا کی جدوجہد کی نشانی ہے ۔ یہ پاکستان کی تحریک کی نشانی ہے ۔ پاکستان کی قرار داد منظور ہونے کی اس نشانی کو میں نے بہت چاہا کہ قائم رکھوں اور سب یہاں ہنسی خوشی مِل جُل کر رہیں مگر اب اس گھر میں تم لوگ اتفاق سے نہیں رہتے ، ایک دوسرے سے لڑتے ہو، بھائی بھائی ہو کر ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہو ۔ اسے گرا کر تم لوگ خوش ہو جاؤ گے نا ! تو توڑ دو اسے ۔ آج اس کی سال گرہ ہے ۔ آج اسے توڑ ڈالو ۔" حلیم صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ کافی دیر تک خاموشی رہی ۔ تینوں بیٹے سر جُھکائے کھڑے تھے ۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ پھر ارشد بولا " ابا جان ! ہمیں معاف کر دیجیے ۔ ہم اس نشانی کو نہیں توڑیں گے ۔ ہم یہاں مِل جُل کر رہیں گے اور کبھی آپس میں نہیں لڑیں گے ۔ اب ہم اس گھر کو اور مضبوط بنائیں گے ۔ اسے سجائیں گے ، سنواریں گے ۔" خالد اور ساجد کی بھی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

حلیم صاحب نے تینوں بیٹوں کو گلے سے لگا لیا ۔

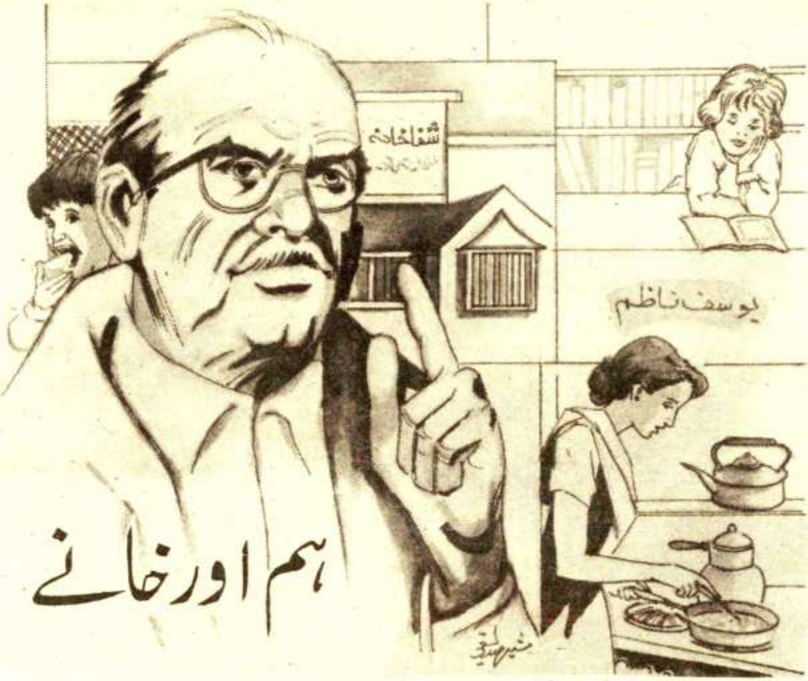

ہم اور خانے

یوسف ناظم

تم پوچھو گے کہ یہ خانے کیا بلا ہے؟ ہم نے یہ عنوان رکھا ہی اس لیے ہے کہ تم تھوڑی دیر پریشان رہو۔ ذرا صبر سے کام لو۔ دو چار سطریں پڑھ لو گے تو خود سمجھ میں آجائے گا کہ ہمارا یعنی ہم سب کا اور خانوں کا کیا تعلق ہے۔

کبھی تم نے غور کیا کہ ہم سب کتنے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ غور کرنے کی تمھیں فرصت ہی کہاں ملی ہوگی۔ اتنا ڈھیر سارا تو ہوم ورک ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا بہت گھر کا کام۔ تھوڑا بہت کھیل۔ لیکن اب ہمارے ساتھ غور کر لو۔ کہا جاتا ہے کہ جب بھی کسی بات پر غور کرنا ہو کسی ساتھی کی مدد حاصل کرو۔ اس طرح غور کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ امدادِ باہمی کی برکتیں بہت ہیں۔

ہم جن خانوں میں بٹے ہوئے ہیں انھیں گنتے جاؤ تو بس گنتے ہی رہو۔ ہم نے بھی انھیں گننے کی کوشش کی تھی، لیکن جلد ہی تھک گئے۔ کچھ خانے جو بہت ضروری اور بہت مشہور ہیں ہمیں یاد رہ گئے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ خانوں سے واسطہ نہ پڑے۔

آدمی کو سب سے پہلے ایک غریب خانہ چاہیے۔ سَر چُھپانے کی جگہ چھوٹی ہو یا بڑی، اچھی ہو یا بُری، عالی شان ہو یا بے شان، غریب خانہ ہی کہلاتی ہے۔ جس کسی کے پاس ایک گھر ہے وہ چاہے محل ہی کیوں نہ ہو آدمی اُسے غریب خانہ ہی کہتا ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے گھر کسی کو کھانا کھلانے بُلاتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ آج رات میں آپ کھانا غریب خانے پر کھائیے گا۔ جواب میں اس شخص کو کہنا چاہیے کہ جی بہت اچھا میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاؤں گا۔ پریشان مت ہو کہ ایک ہی گھر کے دو نام کیسے ہوئے۔ (یہی تو خوبی ہے اردو زبان کی) ویسے اب دولت خانے تو صرف بینک ہی ہو سکتے ہیں۔ دولت اب کسی کے گھر میں ہوتی نہیں ہے۔ جتنی بھی ہوتی ہے بینک میں رکھی ہوتی ہے۔ غریب خانہ بنانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ بڑے شہروں میں تو ایک چھوٹا سا غریب خانہ بنانے کے لیے آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ غریب ہونا آسان ہے لیکن غریب خانہ بنانا مشکل۔ یہ مشکل کب آسان ہو گی کوئی نہیں جانتا۔

غریب خانہ بن جائے تو آدمی اس میں سب سے پہلے باورچی خانہ بناتا ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے باورچی خانے میں آگ سلگانا ضروری ہوتا ہے۔ غریب خانہ نہ بھی ہو تب بھی آدمی کو کسی نہ کسی باورچی خانے سے اپنا رزق حاصل کرنا پڑتا ہے اور باورچی خانہ ہو بھی تب بھی آدمی کو ہوٹل کے باورچی خانے جانا ہی پڑتا ہے۔ گھر کا باورچی خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ صرف اس وقت صاف سُتھرا اور جما جمایا رہتا ہے جب اسے استعمال نہ کیا جائے۔ باورچی خانے میں ہر چیز موجود ہوتی ہے، لیکن کھانا پکاتے وقت کیا مجال جو کوئی چیز آسانی سے مل جائے۔ سب سے پہلے تو دیا سلائی ہی نہیں ملتی۔ سامنے رکھی ہوئی ہے لیکن صبح صبح دیا سلائی کی ڈبیا کا نظر آجانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ امّی اسے ایک جگہ رکھتی ہیں تو باجی اسے وہاں سے ہٹا کر ایسی جگہ رکھ دیتی ہیں جہاں کسی کا ہاتھ کیا اس کی سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی۔ کبھی کبھی تو یہ ڈبیا نمک کے ڈبّے میں پائی جاتی ہے۔ صبح کے وقت باورچی خانے میں اُن برتنوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے جو دن بھر کے استعمال کے بعد دھوئے بغیر یونہی چھوڑ دیے گئے ہوں۔ رات میں بھلا کون برتن دھوتا ہے۔ برتن دھوئیں گے تو ٹی وی پر ڈراما کب دیکھیں گے۔ باورچی خانے میں اگر ہر چیز پھیلی ہوئی نہ ہو تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ باورچی خانے اور دیوان خانے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ باورچی خانے میں اگر جھینگروں کی پانچ سات لاشیں نہ ہوں تو کھانا پکانے میں مزہ نہیں آتا۔ باورچی خانے میں پیاز کے چھلکے، بھنڈی کے ڈنٹھل، لوکی کے ٹکڑے اور اس قسم کی

دوسری چیزیں اِدھر اُدھر نہ پڑی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے یہ کسی اور کا گھر ہے اپنا نہیں۔ اب باورچی خانے کی ہم اس سے زیادہ کیا تعریف کریں۔ اِسی باورچی خانے میں ایک نعمت خانہ ہوتا ہے۔ نعمت خانہ اُس چھوٹی سی الماری کو کہتے ہیں جو اب گھروں میں نہیں پائی جاتی۔ جب یہ الماری ہوا کرتی تھی اس میں دودھ، دہی اور کبھی کبھی کوئی مٹھائی سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ بچّے اسی نعمت خانے سے مٹھائی چُرا کر کھاتے تھے۔ اپنے ہی گھر میں چُرائی ہوئی مٹھائی کیوں اتنی لذیذ ہوتی تھی کوئی نہیں بتا سکتا۔ آج جو لوگ والدین ہیں انھوں نے بھی یہ کام ضرور کیا ہوگا۔ اسی لیے تو یہ الماری نعمت خانہ کہلاتی تھی۔ اب اس کی جگہ فریج رکھے جانے لگے ہیں۔ جن گھروں میں بچّوں کو چُرا کر کوئی چیز کھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی وہ بھی باہر جا کر چوری چھپے کھٹی میٹھی چیزیں کھاتے ہی ہیں۔ نعمت کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو آسانی سے نہ ملے۔

گھر بڑا ہو تو اس میں ایک دیوان خانہ بھی ہوتا ہے۔ دیوان خانے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں دیوانِ غالب رکھا ہو، بلکہ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں خاندان کے صدر کا حکم چلتا ہے۔ بچّوں کو دیوان خانے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ بعض گھروں میں تو بچّوں کی ماں کا بھی دیوان خانے میں آنا اور کسی چیز کو ہاتھ لگانا منع ہوتا ہے، لیکن پھر بھی مائیں دیوان خانے میں پہنچ کر صاحبِ خانہ کا قلم اُٹھا لیتی ہیں اور اس کی مدد سے پاجامے میں ازار بند ڈال کر قلم ایسی جگہ رکھ دیتی ہیں کہ سارا گھر بھی ڈھونڈے تو یہ نہ ملے۔ دیوان خانے میں طرح طرح کے ملاقاتی آتے ہیں۔ اپنی سگرٹ سے دیوان پر بچھی ہوئی چادر جلا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی چائے بھی گرا دیتے ہیں، لیکن انھیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ گھر کے لوگوں پر البتہ دیوان خانے کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ آج کل دیوان خانے کو ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔

اب ذرا گھر کے باہر چلو۔ یہ ڈاک خانہ ہے۔ اس کے بغیر بھی بھلا کوئی رہ سکتا ہے۔ کبھی تم نے سوچا کہ ڈاک خانوں میں یا سڑکوں پر جو لیٹر بکس ہوتے ہیں ان کا رنگ لال کیوں ہوتا ہے؟ یہ خطرے کی علامت ہے۔ خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ تم جو خط اس میں ڈالو گے وہ پہنچے گا بھی یا نہیں۔ تمھارے نام جو اچھے اچھے رسالے بھیجے جاتے ہیں اُن میں سے کچھ رسالے کم کیسے ہو جاتے ہیں؛ تمھارے نام اگر امریکا یا لندن سے کوئی خط آتا ہے تو لفافے پر جو ٹکٹ لگے تھے وہ کہاں گئے؟ کبھی کبھی تو لوگوں کے منی آرڈر کھو جاتے ہیں۔ پارسل گُم ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو ڈاک خانہ ہے ضروری چیز۔ یہ نہ

ہو تو ہم اُدھورے رہ جائیں، دنیا سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے۔ ڈاک خانے کو تو ہم جہاں نما سمجھتے ہیں۔ ڈاک خانے کو سبھی مانتے ہیں اور اس کا بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ کیا کبھی تم نے سُنا کہ کسی ڈاک خانے میں ڈاکا پڑا ہے؟ کبھی نہیں سُنا نا! ڈاکو تک ڈاک خانے کا خیال رکھتے ہیں۔ بینکوں کی بات اور ہے۔

چلو ذرا شفا خانے چلیں۔ شفا خانے کو لوگ عام طور پر دوا خانہ کہتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ امید اچھی رکھنی چاہیے اور زبان پر لفظ بھی اچھا آنا چاہیے۔ شفا خانے کے لفظ میں جو بات ہے وہ دوا خانے میں نہیں ہے۔ دوا خانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں دوا ملتی ہے۔ صرف دوا لے کر کوئی کیا کرے گا۔ شفا خانے کے لفظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مریض کو شفا حاصل ہوگی۔ دوا خانوں کو صاف ستھری حالت میں رکھنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں اسی لیے وہ دوا خانے جہاں ڈاکٹر، نرسیں اور وارڈ بوائے یہ سمجھ کر کام کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں، صاف ستھرے ہوتے ہیں اور صفائی، علاج کی پہلی شرط ہے۔ صاف ستھری جگہ دیکھ کر ہی آدمی خوش ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر اُسے اچھی طرح دیکھ لے، اُس سے اچھی طرح بات کرے، اُسے ہمت دلائے تو اُس کا آدھا مرض دُور ہو جاتا ہے۔ دوا کام بھی کرتی ہے۔ لیکن ایسے بھی دوا خانے ہیں جہاں مریض کو دیکھ کر ڈاکٹر منھ بناتے ہیں۔ اُسے دور کھڑا کرتے ہیں۔ اُس کی نبض دیکھتے بھی ہیں تو اس طرح جیسے کوئی بہت بُرا کام کر رہے ہوں اور ایسا کرتے ہوئے کوئی انھیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ مریض سے پوچھے بغیر نسخہ لکھتے ہیں۔ یہ تو شعر لکھنا ہوا نسخہ لکھنا کہاں ہوا۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ دوا خانے سے چاہے وہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں، سابقہ نہ پڑے۔ اب یوں صحت خود ہی بگڑ جائے تو بات اور ہے اپنی کوشش سے صحت بگاڑنے کے کیا معنیٰ ہوتے ہیں؟

سب سے اچھا خانہ جو ہمیں پسند ہے وہ کتب خانہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی ساری زندگی کتب خانے میں ہی گزار دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔ آدمی کو ہوا خوری بھی کرنی چاہیے۔ مناظر سے بھی لُطف اندوز ہونا چاہیے۔ پانچ دن کا ٹیسٹ میچ تو نہیں لیکن کبھی کبھی ون ڈے کرکٹ میچ یا ویبلڈن کا ٹینس فائنل بھی دیکھنا چاہیے اور کتب خانے تو جانا ہی چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ کتابیں سب سے اچھی دوست ہوتی ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے، لیکن کچھ کتابیں دشمن بھی ہوتی ہیں۔ ان کتابوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ کتب خانوں میں ایسی کتابیں

نہیں پائی جاتیں، لیکن بازار میں تو ملتی ہی ہیں۔
کتب خانے میں جگہ جگہ یہ نوٹس لگی ہوتی ہے:
"شور مت کیجیے۔"
ظاہر ہے کتب خانہ، کتب خانہ ہوتا ہے ریلوے پلیٹ فارم نہیں ہوتا۔ کتب خانوں میں ایک مشکل ضرور ہوتی ہے کہ پورا اخبار پڑھنے کے لیے بہت گھومنا پڑتا ہے اور اخبار میں پوری خبر ایک صفحے پر چھاپنا منع ہے۔ معلوم نہیں اس میں اخبار والوں کی کیا مصلحت ہوتی ہے۔ ایک خبر کا باقی حصّہ پڑھنے کے لیے اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اُس نے پہلے پڑھا کیا تھا۔

کتب خانوں میں بہت سے لوگ پڑھتے کم ہیں لکھتے زیادہ۔ کوئی بھی کتاب لیں گے تو اس کے ہر صفحے پر اپنی رائے ضرور لکھیں گے۔ لکھنا ہی ہے تو گھر بیٹھ کر خود ایک کتاب کیوں نہیں لکھ لیتے۔ کچھ کتابوں سے تو بیچ کے صفحے بھی غائب ہوتے ہیں۔ یہ کون لے جاتا ہے؟ کتب خانے کو جو لوگ اپنے گھر کا نعمت خانہ سمجھتے ہیں انھیں یہ خبر نہیں ہے کہ چُرایا ہوا علم ہضم نہیں ہوتا۔ کتب خانہ تو وہ جگہ ہے جہاں اچھی اچھی کتابیں تحفے کے طور پر پہچانی چاہییں۔ اسکولوں اور کالجوں میں جانے سے آدمی تعلیم یافتہ ہوتا ہے، لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کو اگر عالم فاضل بننا ہے تو اس کے لیے انھیں کتب خانے ہی جانا پڑے گا۔ یہاں فیس کم ہوتی ہے اور علم زیادہ حاصل ہوتا ہے۔
ان خانوں کے علاوہ اور بھی کئی خانے ہیں۔ اچھے بھی اور بڑے بھی۔ ہماری سمجھ میں جو آئے اُن خانوں کا ذکر ہم نے کر دیا۔ باقی کی خانہ پُری تم کرو۔

نونہال کے لیے چند ضروری ہدایات

- اکثر نونہال لفافے میں رُپے رکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ رُپے کبھی لفافے میں رکھ کر نہیں بھیجنے چاہییں
- اپنی ہر تحریر کے آخر میں اپنا نام اور پورا پتا ضرور لکھا کیجیے۔ آپ چاہے کسی بھی کالم کے لیے تحریر بھیجیں۔ ہر تحریر کے آخر میں اپنا نام اور پورا پتا ضرور لکھیے۔
- آپ کو یاد ہے نا! ہم صحت مند نونہال میں صرف دس سال تک کی عمر کے بچّوں کی تصویریں چھاپتے ہیں۔

ادب کا خزانہ

قمر ہاشمی

ہمدرد نونہال کا یہ ماہ نامہ ہے
پوشیدہ اس میں شعر و ادب کا خزانہ ہے
کیا کچھ نہیں ہے اس میں ورق گن کے یہ بتاؤ
ان خوبیوں کا کوئی رسالہ مجھے دکھاؤ
جاگو جگاؤ موتیوں میں تولنے کا ہے
اِک بار پڑھ کے دیکھو تو کتنا سکوں ملے
پھر بات پہلی آتی ہے یہ آخری ہے بات
یعنی ہیں نونہالوں کے اپنے معاملات
گُل دستہ سج رہا ہے اکابر کے قول سے
پُھوٹی ہے روشنی کی کرن سچّے بول سے
پھر کوئی نظم آ گئی روشن ہوا ورق
وہ دیکھو آسمان پہ پھوٹی حَسیں شفق
پھر طب کی روشنی میں سوالوں کے ہیں جواب
کرنے لگے ہیں لوگ دواؤں کا انتخاب
ہمدرد کی کتاب کا یہ اشتہار ہے
اس کو پڑھو یہ علم و عمل کی بہار ہے

قصّے کہانیاں سبق آموز واقعات
مشہور لکھنے والوں کی دل چسپ کائنات
کچھ زندہ جُملے دیدہ و دِل جگ مگا گئے
کچھ لوگ اسی حوالے سے پھر یاد آ گئے
پھولوں کی طرح مہکی ہوئی سطریں دیکھیے
صفحے یہ چٹکلوں کے ہیں اب کِھل کھلائیے
یہ نونہال ادیب یہ روُدادِ بزم ہے
لوح و قلم سجانے کا بھرپور عزم ہے
بچپن کی یہ کہانی بڑے آدمی کی ہے
کچھ دِل کشی تو اس میں مِری زندگی کی ہے
بالکل وہی شرارتیں ویسی ہی شوخیاں
قدرت نے کوٹ کوٹ کے بھر دی تھیں بجلیاں
اس میں کہانیاں ہیں قریب و بعید کی
اِک داستاں حکیم محمد سعید کی
بچّو اِسی کا نام ہے ہمدرد نونہال
دنیا میں ہر جگہ اسے پڑھتے ہیں باکمال

ہمدرد نونہال، جولائی ۱۹۸۹ء

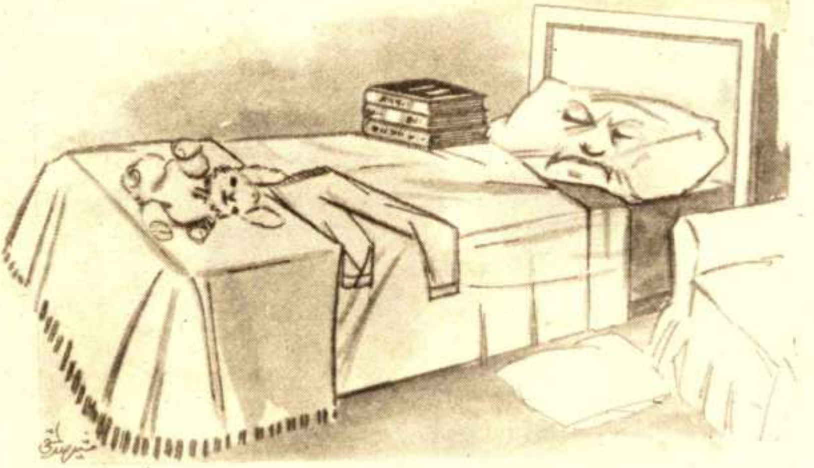

بستر کہتا ہے

مجھے شکایت ہے

مسعود احمد برکاتی

میں بستر ہوں۔ انسان کے آرام کے لیے بنایا گیا ہوں۔ جب سے میں وجود میں آیا ہوں اپنا فرض، اپنا کام انجام دے رہا ہوں۔ خیر و خوبی سے میں نے اس لیے نہیں کہا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ مجھ سے کام لینا انسان کا کام ہے۔ وہ جس طرح چاہے جب چاہے مجھ سے کام لے۔ میرے بس میں نہیں کہ میں انسان کی مرضی کے خلاف چلوں۔ میرے بس میں تو صرف یہ ہے کہ جو کوئی میرا مہمان بنے میں اس کی خاطر تواضع کروں، اس کو آرام پہنچاؤں، اس کو میٹھی نیند سلاؤں، اس کو اچھے اچھے خواب دکھاؤں، اس کو سکون مہیّا کروں، اس کی تھکن اُتار دوں۔ اس کو بیماری میں راحت پہنچاؤں اور صحت یاب ہونے میں اس کی مدد کروں۔ مجھے شکایت ہے کہ مجھے اپنے فرائض انجام نہیں

دینے دیے جاتے۔ مجھ سے وہ کام نہیں لیے جاتے جن کے لیے میں بنایا گیا ہوں۔ مجھ سے وقت پر کام نہیں لیا جاتا۔ مجھے بے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

اصل میں میرا کام رات کو شروع ہوتا ہے اور رات میں ہی ختم ہوتا ہے۔ میرا دن سے تعلق نہیں۔ دن تو میرے آرام کے لیے ہے۔ جب مجھے دن کو آرام نہیں ملے گا تو میں رات کو انسان کو کیا آرام پہنچاؤں گا۔ بہت سے لوگ تو آدھی رات گزر جاتی ہے جب مجھے اپنی پیٹھ دکھاتے ہیں اور پھر خوب دن چڑھے تک مجھے نہیں چھوڑتے۔

ایک صاحب تو حد ہی کرتے ہیں۔ وہ رات کو تین بجے سے پہلے تو میرے پاس پھٹکتے بھی نہیں۔ چار اور پانچ بھی بجا دیتے ہیں۔ پھر سارا دن وہ ہوتے ہیں اور میں۔ ان کی پیٹھ اور میری پیٹھ مشکل سے دوپہر تک جدا ہوتی ہیں۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ جاگ جاتے ہیں مگر نہیں جاگتے۔ کروٹیں بدلتے رہتے ہیں، کیوں کہ وہ صحیح معنی میں نیند سے فیض یاب ہی کب ہوئے۔ کروٹیں بدلنے سے مجھے چڑ ہے۔ میں کروٹیں بدلنے کے لیے کب بنایا گیا ہوں۔

خیر مجھے تو چھوڑیے۔ مجھے تو برداشت اور صبر و ضبط کی عادت پڑ گئی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ لوگ مجھ پر پڑے پڑے وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور پھر بھی نیند اور آرام کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ نیند کے دوران جسم کی مرمّت ہوتی ہے اور اس کو نئی طاقت ملتی ہے۔ نیند پوری کرنے کے بعد جب آدمی اُٹھتا ہے تو گویا وہ نیا آدمی ہوتا ہے۔ اس میں نئی زندگی آجاتی ہے اس کی طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ خود بخود اُٹھنے اور کام کرنے کو اس کا جی چاہتا ہے۔ وہ جاگتے ہی مجھے فوراً چھوڑ دیتا ہے اور پھر میری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔ دوسری رات تک میرا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ اگر وہ طالب علم ہے تو اپنی کتابیں سنبھالتا ہے ضروریات اور ناشتے سے فارغ ہو کر اسکول جانے سے پہلے تھوڑی دیر تک گھر ہی میں بیٹھ کر کتاب پڑھتا ہے۔ اگر ملازم ہے یا تجارت کرتا ہے تو گھر کا سودا سُلف لا کر دیتا ہے اور پھر دفتر روانہ ہو جاتا ہے۔

لیکن ایسا وہی لوگ کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں جو وقت پر مجھ پر آلیٹتے ہیں۔ وقت پر

لیٹنے سے نیند بھی اچھی آتی ہے، لیکن جب نیند کا وقت گزر جائے تو پھر میں صحیح معنی میں ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ میں ان سے کچھ کہتا تو نہیں بلکہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو خوش آمدید ہی کہتا ہوں لیکن مجھے ایسے لوگوں سے شکایت ہے کہ وہ اپنے علم اور اپنے تجربے کو ضائع کرتے ہیں۔ مجھے بھی اپنا مقصد پورا کرنے نہیں دیتے۔ جو چیز بھی وہ مقصد پورا نہ کر سکے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے تو وہ اطمینان اور خوشی کی لذّت سے محروم رہتی ہے۔

میں کام چور نہیں ہوں، اس لیے مجھے ان لوگوں سے شکایت نہیں ہے جو رات کو جلدی میرے پاس آتے ہیں اور رات بھر خوب نیند کے مزے لے کر صبح تڑکے اُٹھ بیٹھتے ہیں، عبادت کرتے ہیں اور کُھلی ہوا میں چہل قدمی کر کے آتے ہیں اور سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔

میرا ان لوگوں کی شکایت کرنے کو بھی دل چاہتا ہے جو رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور پھر بھی صبح جلدی نہیں اُٹھتے۔ جلدی سو کر جلدی اُٹھنا چاہیے۔ دیر تک سونا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ آدمی کو سُست کرتا ہے۔ پرانی بات ہے جلدی سونا، جلدی اٹھنا آدمی کو صحت مند، دولت مند اور عقل مند بناتا ہے۔

مجھے وہ لوگ بھی اچھے نہیں لگتے جو مجھے صاف نہیں رکھتے۔ میری چادر، میرے تکیے کو میلا کر دیتے ہیں اور جب تک میں بالکل ہی گندا نہ ہو جاؤں نہ چادر بدلتے ہیں اور نہ تکیے کا غلاف۔ صاف سُتھرا بستر کتنا سکون دیتا ہے۔ ذرا تجربہ کر کے دیکھیے۔

مجھے ان لوگوں سے بھی شکایت ہے کہ جو مجھے غلط کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب میرے آدھے حصے پر اپنے دفتر کے کاغذات پھیلا دیتے ہیں اور مجھ پر بیٹھ کر ہی ان کاغذات کو پڑھنا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی حالت میں تھک ہار کر میرے بقیہ آدھے حصے پر آڑے ترچھے لیٹ جاتے ہیں۔ حال آنکہ ہزاروں برس کے تجربے کے بعد مجھے ناپ تول کر صرف سونے لیٹنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ کسی افسر کے فائلوں یا کسی پروفیسر یا ایڈیٹر کی کتابوں کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے الماری اور میز ایجاد کی گئی ہے اور تعلیم یافتہ آدمی ہر چیز سے وہی کام لیتا ہے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔

جاہل

مجیب ظفر انوار

"جی سیٹھ صاحب! کتنی کتابیں لی ہیں آپ نے ... ایک ... دو ... تین ... چار... پانچ .... یہی ہیں آپ کی کتابیں؟" دُکان دار نے دُرّانی صاحب سے پوچھا۔ درانی صاحب نے جواب دیا، "جی ہاں، آپ ٹوٹل کر دیجیے۔"

دُکان دار نے ایک کاغذ پر کتابوں کی قیمتیں لکھیں اور پھر کتابوں کو پلاسٹک کی تھیلی میں رکھتے ہوئے بولا، "دو سو اڑتالیس رُپے عنایت کر دیجیے جناب۔" دُرّانی صاحب نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پرس نکال کر سو سو رُپے کے تین نوٹ دُکان دار کے حوالے کیے۔ "شکریہ سر۔" دُکان دار نے باون رُپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ کتابوں کا پیکٹ اُٹھا کر جیسے ہی درانی صاحب پلٹے، کوئی ان سے ٹکرا گیا۔

"چل .... چل .... ہٹ۔" دُرّانی صاحب کے بجائے دُکان دار نے چلّا کر کہا،

"نن ... نہیں ... رُکو ... ۔"

درانی صاحب نے دُکان دار کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔ پھر اس معصوم بچّے سے مخاطب ہو کر بولے، "کیا چاہیے؟ یہ لو!" یہ کہہ کر انھوں نے وہی پچاس کا نوٹ بچّے کی طرف بڑھا دیا جسے کچھ دیر پہلے دُکان دار نے انھیں واپس کیا تھا۔ نوٹ دیکھ کر بچّہ بدک گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ

پیچھے کر لیے۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ بوسیدہ لباس کے پھٹے ہوئے حصّوں سے جھانکتا سیاہ بدن، پھٹے ہوئے ہاتھ، ننگے پیر، تیز ہوا سے کانپتا جسم۔ ایک لمحے کو تو اس غریب کی یہ حالت دیکھ کر انھیں جھرجھری سی آگئی۔

درانی صاحب ابھی کچھ پوچھتے کہ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ "صاحب جی! رہنے دیں، یہ روز یہاں آتا ہے۔ شیلف میں رکھی کتابوں کو دیکھنے! باپ کا مال سمجھتا ہے جو کتابوں کی بھیک مانگنے آجاتا ہے۔" دُکان دار نے تلخ لہجے میں کہا۔ درانی صاحب کچھ نہ بولے اور کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اس بچّے کی شکل ان کے دل میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

اتفاق سے تین چار دن بعد انھیں ایک کتاب کی شدید ضرورت پڑی۔ دفتر سے واپسی پر انھوں نے کار اسی دُکان کے آگے روک لی اور کار سے اُتر کر دُکان کی طرف بڑھے۔ اچانک ایک شور اُٹھا، "پکڑو.... پکڑو.... جانے نہ پائے.... چور.... چور...." وہ بوکھلا گئے۔

دوسرے ہی لمحے دُکان سے وہی بچّہ تیر کی طرح نکلا۔ اس کے پیچھے دُکان دار شور مچاتا، چیختا چلّاتا بھاگا۔ ایک لمحے کو درانی صاحب بھی ہکّا بکّا رہ گئے۔ پھر انھوں نے تیزی سے دوڑ کر اس بچّے کو پکڑ لیا۔ "چھوڑو.... چھوڑ دو مجھے۔" درانی صاحب کے بازوؤں میں وہ کسمسانے لگا۔

"چوری کر کے بھاگے ہو؟" انھوں نے سختی سے پوچھا۔

"جج.... جی.... ہاں۔" وہ رو پڑا۔ اسی دوران دُکان دار اور راہ گیر ان دونوں کی طرف لپکے۔ دُکان دار نے جھپٹ کر اسے گردن سے پکڑ لیا اور پھر بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ درانی صاحب اس مصیبت سے پریشان ہو کر چیخ رہے تھے، سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر نقار خانے میں توتی کی آواز کون سنتا۔ لاچار وہ ہجوم کو چیرتے ہوئے بچّے تک جا پہنچے اور دُکان دار کا ہاتھ پکڑ کر غصّے سے بولے، "ظالم! پہلے اس سے یہ تو پوچھو کہ یہ کتنے پیسے چُرا کر بھاگا ہے۔"

دُکان دار نے درانی صاحب کو دیکھے بغیر ایک زور دار تھپڑ اس کے مار کر کہا، "جناب! رُپے پیسے کی بات نہیں، یہ بے غیرت تو علم چُرا کر بھاگ رہا تھا۔ یہ شیلف میں رکھی کتاب اُٹھا کر پڑھے چلا جا رہا تھا۔ منع کیا تو کتاب کاؤنٹر پر پھینک کر بھاگ گیا۔ اگر یہ مفلس ہے تو ہم کیا کریں.... مفت خورا.... جاہل۔

آزادی

کنول سلیم، میرپورخاص

ایک ننھی چڑیا۔ اس کے پَروں کا رنگ نیلا اور چونچ سنہری تھی۔ وہ اتنی خوب صورت اتنی خوب صورت تھی کہ اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ یہ چڑیا روزانہ درخت پر آکر بیٹھتی تھی اور خُرم میاں روزانہ اُسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے رہتے تھے۔ چڑیا بھی خرم میاں کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتی تھی۔ اسی طرح کافی دن گزر گئے نہ تو چڑیا کے معمول میں فرق آیا اور نہ خُرّم میاں کے۔ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوگئے تھے۔ جیسے ہی شام ہوتی چڑیا درخت پر بیٹھ کر چوں چوں کرتی۔ اس کی آواز سنتے ہی خُرّم میاں کھڑکی میں آجاتے اور چڑیا کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ خرم میاں روزانہ شام ہونے کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتے تھے۔ اب تو انھوں نے اپنی جیب سے دانہ دُنکا بھی خریدنا شروع کردیا تھا۔ شام ہوتے ہی چڑیا درخت سے اُڑ کر کھڑکی کے قریب منڈلانے لگتی۔ خرم میاں کھڑکی کی چوکھٹ پر باجرہ وغیرہ ڈال دیتے اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر چڑیا کو دیکھتے رہتے۔ ایسا لگتا تھا کہ چڑیا اور خرم میں دوستی پکّی ہوگئی ہے۔

ایک روز خرم میاں وقت پر اپنی جگہ پہنچے، مگر چڑیا کو اپنی جگہ نہ پا کر بے چین ہوگئے۔ وہ شدّت سے اس کا انتظار کرنے لگے، مگر چڑیا نہ آئی۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا۔ اب تو خرم میاں اُداس ہوئے۔ انھیں چڑیا کی فکر لگ گئی کہ کہیں کسی نے چڑیا کو پکڑ نہ لیا ہو! کہیں وہ زخمی نہ ہوگئی ہو! غرض ایسے ہی خیالات انھیں بے چین رکھتے۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کا بہت پیارا دوست ان سے بچھڑ گیا ہو۔ اسی فکر میں وہ بیمار پڑ گئے۔ بخار کی حالت میں بھی ہر وقت چڑیا کو یاد کرتے اور بس یہی رٹ لگائے رکھتے: "مجھے وہی چڑیا لا کر دیں۔ مجھے میری ننھی دوست لا کر دیں!"

گھر والے ان کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ ان کے ابّو نے انھیں بازار سے رنگ

برنگی طرح طرح کی چڑیاں لاکر دیں مگر انھیں اپنی پیاری سی چڑیا کے آگے کوئی چڑیا نہ بھائی۔ ابّو جب بھی گھر آتے کوئی نہ کوئی پنجرہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ اُس روز بھی ابّو کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا۔ وہ خرم کو آوازیں دیتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے:

"خرم بیٹا! دیکھو، ہم تمھارے لیے ایسی پیاری چڑیا لائے ہیں کہ تم اس چڑیا کو بھی بھول جاؤ گے۔" خرم نے ابّو کی بات پر دھیان نہ دیا۔ انھیں پتا تھا کہ ابّو انھیں بہلانے کے لیے پھر کوئی چڑیا لے آئے ہوں گے۔ ابّو سیدھے خرم کے کمرے میں آگئے اور پیار سے خرم کے سَر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے، "بیٹے! آنکھیں کھول کر دیکھو تو سہی کتنی پیاری چڑیا ہے۔" ابّو کی خاطر مجبوراً خرم کو آنکھیں کھولنی پڑیں۔ انھوں نے سرسری نگاہ چڑیا پر ڈالی تو ایک دَم اُچھل کر بستر پر بیٹھ گئے۔ "ارے! یہ تو وہی میری پیاری دوست ہے۔" چڑیا بھی خرم کو دیکھ کر خوشی سے پَر پھڑپھڑانے لگی۔ اس نے بھی اپنے ننّھے دوست کو پہچان لیا تھا۔ خرم نے بے اختیار پنجرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور چڑیا سے کہنے لگے، "میری پیاری دوست! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ دیکھو تو میں تمھارے بغیر کتنا اُداس ہو گیا تھا۔ میری پیاری دوست اب تو مجھے چھوڑ کر تو کہیں نہیں جاؤ گی نا؟" پھر خرم نے اپنے ابّو سے پوچھا، "ابو! آپ کو یہ چڑیا کہاں سے ملی؟"

ابو نے جواب دیا، "بیٹے! جب میں گھر آرہا تھا تو راستے میں ایک چڑیاں فروخت کرنے والا اسے بیچ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ تقریباً ایک ہفتے پہلے اس نے یہ چڑیا پکڑی تھی۔ میں نے جب اتنی خوب صورت چڑیا دیکھی تو اپنے بیٹے کے لیے خرید لایا۔"

یہ سُن کر خرم بولے، "ابّو! میں اب اس چڑیا کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اس کا پنجرہ اپنے کمرے میں ہی رکھوں گا۔" چڑیا ان سب باتوں سے بے خبر خوشی سے پنجرے میں پھڑپھڑا رہی تھی کہ اب اس کا ننّھا دوست اُسے اس قید سے نجات دلا دے گا اور وہ پھر آزاد فضاؤں میں پرواز کر سکے گی۔ وہ سارا دن اُمید بھری نظروں سے خرم کی طرف دیکھتی رہتی کہ ابھی میرا ننّھا دوست اُٹھتا ہے اور مجھے آزاد کرتا ہے مگر .... ننّھے خرم کا تو ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو خوشی سے پھولے نہ سَما رہا تھا اور منصوبے بنا رہا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو فخر سے دکھاؤں گا کہ میرے پاس کتنی خوب صورت چڑیا ہے۔ جب ایک دن گزر گیا اور خرم نے چڑیا کو آزاد

نہ کیا تو چڑیا اُداس ہو گئی۔ اب اُس نے چہچہانا بھی چھوڑ دیا۔ خرم جب دانہ پانی ڈالتا تو چڑیا اُسے منھ بھی نہ لگاتی۔ بس اُداس اُداس نظروں سے خرم کو دیکھتی رہتی۔ دو تین دن ایسے ہی گزر گئے۔ خرم میاں پریشان ہو گئے کہ نہ جانے میری دوست کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا یہ مجھ سے روٹھ گئی ہے؟ وہ چڑیا کے پاس جا کر کہتے، "میری ننھی دوست! مجھے بتاؤ تو سہی تمھیں ہوا کیا ہے؟ تم پہلے تو ایسی نہ تھیں۔ تم چپ چپ اور اُداس کیوں رہتی ہو؟" مگر چڑیا خرم کو دیکھتے ہی منھ پھیر لیتی تھی۔ ایک دن خرم ایسی ہی باتیں اپنی چڑیا سے کر رہے تھے کہ ان کے ابو آ گئے۔ انھوں نے جب خرم اور چڑیا دونوں کو اُداس دیکھا تو خرم سے وجہ پوچھی۔ جب انھیں اصل بات پتا چلی تو انھوں نے خرم سے کہا:

"بیٹے! مجھے معلوم ہے یہ چڑیا تم سے روٹھ گئی ہے۔ جب میں اس چڑیا کو خرید کر لایا تھا تب بھی یہ اداس اور غمگین تھی۔ مگر جب اس نے تمھیں دیکھا تو یہ کیسے خوشی سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس شخص کی قید میں یہ اُداس تھی۔ یہ کھلی فضاؤں میں دوبارہ جانا چاہتی تھی۔ مگر اسے رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جب اس نے تمھیں دیکھا تو پہچان لیا کہ تم وہی ہو جو اُسے دانہ دُنکا ڈالتے تھے۔ یہ تم سے مانوس بھی تھی۔ اُسے امید تھی کہ تم یقیناً اُسے اس قید سے نجات دلا دو گے۔ مگر تم نے بھی اس کے ساتھ اُس شخص جیسا ہی سلوک کیا۔ اس وجہ سے یہ تم سے بھی روٹھ گئی ہے۔" یہ سُن کر خرم میاں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انھوں نے چڑیا سے مخاطب ہو کر کہا، "میری پیاری چڑیا! مجھے معاف کر دو۔ واقعی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم کھلی فضاؤں میں ہی ہنستی مسکراتی اچھی لگتی تھیں۔ میں ابھی تمھیں آزاد کر دیتا ہوں۔ مگر تم مجھے روزانہ ملنے ضرور آنا، پہلے کی طرح۔" یہ کہہ کر خرم میاں نے پنجرے کا دروازہ کھول کر چڑیا کو آزاد کر دیا اور چڑیا خوشی سے چوں چوں کرتی پھر سے اُڑ گئی۔ اب روزانہ پہلے کی طرح دونوں دوست شام کو ضرور ملتے ہیں۔

> آپ کے لہجے کی شیرینی اور نرمی لوہے کو پگھلا سکتی ہے۔ جب کہ سخت گفتگو جلد ہی بے اثر ہو جاتی ہے اور تلخ تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ (ڈیل کارنیگی)

Glass users throughout Pakistan are pleasantly experiencing the ***RELIABLE*** difference.

BGL

Baluchistan Glass Limited

More than a name ...
A total commitment to quality, service and innovative leadership.

THAVER 1-86

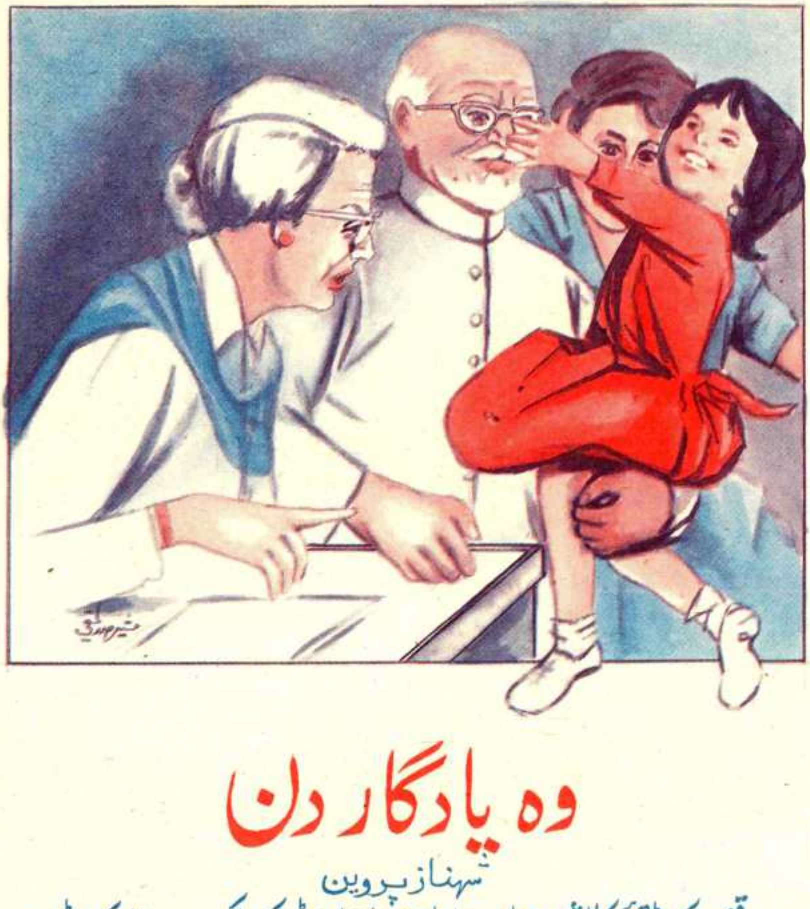

وہ یادگار دن

سہناز پروین

قصبے کے بڑھئی کا مشورہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ اسٹور کی مالکن جب شام کو اسٹور بند کرنے کے لیے چیزیں سمیٹ رہی تھی تو اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی کہ بڑھئی کا مشورہ مانا جائے یا نہیں۔

بات دراصل یہ تھی کہ اسٹور کی مالکن کی بیٹی مومی دو دن بعد پانچ سال کی ہونے والی تھی۔ وہ بہت شریر تھی۔ اگر صرف شرارت تک بات محدود ہوتی تو پھر بھی کوئی بات نہیں تھی، مگر مومی تو ایسی شرارتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتی تھیں۔ اس کے علاوہ

وہ کچھ بدتمیز بھی تھی۔ اسٹور کی مالکن اس کی ان عادتوں سے سخت پریشان تھی۔ آج جب قصبے کا بڑھئی اسٹور سے انڈے اور ڈبل روٹی خریدنے آیا تو اس نے اسے مشورہ دیا تھا کہ آپ مومی کو اسکول میں داخل کروا دیں۔ وہاں مولا بخش پڑھاتا ہے۔ وہ ایسے بچّوں کو سُدھارنا خوب جانتا ہے۔

"میں کوشش کروں گی۔ ویسے آج کل میں مومی کے ابّو چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ بحری جہاز پر کام کرنے والوں کو چھٹی اُسی وقت مل سکتی ہے جب اُن کا جہاز ساحل پر پہنچے۔" اسٹور کی مالکن نے کہا۔

بڑھئی نے خوش ہوتے ہوئے کہا، "اچھا! تو میرا دوست آرہا ہے۔ بھئی پھر تو خوب لطف رہے گا۔ مومی اپنے ابّو کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو مومی دو سال کی تھی۔ اُسے تو اپنے ابّو کی شکل بھی یاد نہیں ہوگی۔"

"جی ہاں! اب وہ کئی دن سے میرے پیچھے پڑی ہے کہ ابّو میری سال گرہ میں آئیں گے یا نہیں؟ ہزار مرتبہ اُسے بتا چکی ہوں کہ اُن کو چھٹی ملے گی تو آئیں گے۔ ویسے اس مرتبہ مومی کے ابّو نے مومی کی سال گرہ پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ ویسے آپ کل ہی مومی کو اسکول میں داخل کروا دیں۔"

بڑھئی رخصت ہوا اور اسٹور کی مالکن اس کے مشورے پر غور کرنے لگی۔ رات کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تو مومی کو اسکول داخل کروانے کا پکّا ارادہ کر چکی تھی۔

دوسرے دن اسٹور کی مالکن نے اپنے اسٹور پر "اسٹور دو پہر تک بند رہے گا" کی تختی لگائی اور مومی کو لے کر اسکول کی طرف چل دی۔ راستے میں مومی نے اسکول کے بارے میں سوال کر کر کے اپنی امّی کو عاجز کر دیا۔ اسکول کیسا ہوتا ہے؟ کتنا بڑا ہوتا ہے؟ اس میں کون کون ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تنگ آکر اسٹور کی مالکن نے سختی سے کہا:

"بس اب خاموشی سے چلو۔ ابھی تو تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں تم کو اسکول میں داخل کروانا چاہتی ہوں۔ جب تم کو داخلہ مل جائے گا تو تم کو سب معلوم ہو جائے گا اور ہاں، وہاں تمیز سے بیٹھنا اور ہیڈ مس جو بھی پوچھیں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" مومی نے بے پروائی سے کہا۔

جب وہ دونوں اسکول میں پہنچیں تو اس وقت وہاں ماسٹر مولا بخش بھی موجود تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بچّوں سے بہت پیار کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی بچّہ بار بار ان کی نافرمانی کرے تو وہ اُس کی خوب خبر لیتے ہیں۔ ماسٹر مولا بخش نے مومی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "کیسی خوب صورت اور بھولی بھالی ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے مومی کو پیار سے گود میں اُٹھا لیا اور کہا، "میری بیٹی اسکول میں پڑھنے کے لیے آئی ہے نا؟"

مومی نے کوئی جواب دینے کے بجائے جھپٹ کر ماسٹر مولا بخش کی سُنہری فریم والی عینک اُتار لی اور اپنے لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے! ارے! بھئی، عینک تو واپس کرو۔ یہ تمھارے لگانے کی نہیں ہے۔ شاباش! اچھے بچّے ایسا نہیں کرتے۔" ماسٹر مولا بخش نے پُچکار کر کہا اور مومی کے ہاتھ سے اپنی عینک لینے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر جب عینک اُن کے ہاتھ میں آئی تو اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔

ماسٹر مولا بخش نے مومی کو گود سے اُتار دیا اور اپنی عینک کا معائنہ کرنے لگے۔ ہیڈ مِس نے یہ دیکھ کر مومی کی امی سے کہا:

"لوگ سمجھتے ہیں کہ بگڑے ہوئے بچّوں کا واحد علاج اسکول ہے۔ حال آنکہ ماں باپ

کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو بگڑنے سے خود بچائیں۔ اسکول سے بچّوں کو ڈرانا نہیں چاہیے۔ اسی طرح بچّے پڑھنے سے بھاگتے ہیں۔ بہر حال میں آپ کے ساتھ اس لیے رعایت کر رہی ہوں کہ آپ کو اسٹور کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے اور مومی کے ابّو بھی قصبے سے باہر رہتے ہیں۔ میں مومی کو اسکول میں داخل کر رہی ہوں، مگر پہلے میں اس سے ایک دو باتیں کر لوں۔ ادھر آؤ مومی۔" ہیڈ مسٹریس نے مومی کو بُلایا۔ مومی جلدی سے ان کے پاس چلی گئی۔

"آپ ہمارے اسکول میں پڑھیں گی؟" ہیڈ مس نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

"اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے ابّو کا نام کیا ہے؟" ہیڈ مس نے دوسرا سوال کیا۔

"ابّو!"

"اچھا! آپ کو ابّو اچھے لگتے ہیں یا امّی؟"

"آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ ہمیں کوئی بھی اچھا لگے۔ آپ کو کیا؟" مومی نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

"دیکھو بیٹی! مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ ورنہ میں تمھیں اسکول میں داخلہ نہیں دوں گی۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کو کون سا پرندہ پسند ہے؟" ہیڈ مسٹریس نے پوچھا۔

"مجھے تو سارے پرندے پسند ہیں، کیوں کہ میں سب کو زمین پر گرا سکتی ہوں۔"

"بھلا کیسے؟" ہیڈ مسٹریس نے جلدی سے پوچھا۔

"ایسے۔" یہ کہہ کر مومی نے پھُرتی سے اپنی ایک جیب سے غُلیل اور دوسری سے پتّھر نکال کر کھڑکی سے باہر درخت پر بیٹھی چڑیا کا نشانہ لگایا۔ پتّھر نے چڑیا کو تو نہیں مارا، لیکن شیشہ ضرور ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔

ہیڈ مس نے حیرانی سے پہلے مومی کو اور پھر ٹوٹے ہوئے شیشے کو دیکھا۔ اسٹور کی مالکن اپنی بیٹی کی ان حرکتوں پر سخت شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے! آپ مومی کو کل سے اسکول بھیجیے۔ اس بچّی کو اچھی تربیت کی سخت ضرورت ہے۔" ہیڈ مسٹریس نے کہا۔

اور یوں مومی کو اسکول میں داخلہ مل گیا۔ دوسرے دن اسٹور کی مالکن نے مومی کو تیار کیا۔

ایک خوب صورت بیگ میں موحی کی کتابیں اور کاپیاں رکھیں اور پھر انھیں اچانک یاد آیا:

"او ہو! تمھارا لنچ تو رہ گیا!" یہ کہہ کر موحی کی امی نے جلدی سے موحی کا لنچ بکس باورچی خانے سے لاکر موحی کے بیگ میں رکھا اور کہا:

"دیکھو پیاری بیٹی! آج تمھارا اسکول میں پہلا دن ہے۔ تمھیں ماسٹر مولا بخش پڑھائیں گے۔ وہ جو بھی پڑھائیں دل لگا کر پڑھنا اور ان کا کہنا ماننا۔ جب ماسٹر مولا بخش سب بچّوں سے کہیں کہ اب اپنا لنچ بکس نکال کر کھانا کھالیں تو تم بھی کھا لینا۔ میں نے ڈبل روٹی پر مکھن بھی لگا دیا ہے۔ جب چُھٹی ہو گی تو تم سب بچّوں کے ساتھ ہی واپس آنا۔ اکیلی مت آنا۔ میں نے پولٹری فارم والے دارا صاحب سے کہہ دیا ہے۔ ان کے بچّے بھی اُسی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہ اسی راستے سے گزر کر اپنے گھر جاتے ہیں۔ وہ تم کو یہاں چھوڑ جائیں گے۔ تمھیں ڈر تو نہیں

لگ رہا نا؟"
"نہیں امی جان! اسکول قریب ہی تو ہے۔ میں تو اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔" مومی نے بہادری سے کہا۔
"نہیں نہیں! اکیلی مت جانا۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ دارا صاحب کے بچے آتے ہی ہوں گے۔ اُن کے ساتھ جانا۔ اور ہاں آج تمھاری سال گرہ بھی ہے۔ میں نے تمام مہمانوں کو شام چار بجے کا وقت دیا ہے۔"
جب پولٹری فارم والے دارا صاحب کے دونوں بچے آئے تو مومی بھی اُن کے ساتھ ہی اسکول چلی گئی۔ اسٹور کی مالکن دیر تک دروازے پر کھڑی مومی کو اسکول جاتا دیکھتی رہی۔
راستے میں نونی نے مومی سے پوچھا" تم کو رونا نہیں آرہا؟ میں تو جب پہلی دفعہ اسکول گیا تھا تو خوب رویا تھا۔"
"مجھے تو بہت مزہ آرہا ہے۔ پتا ہے امّی کہہ رہی تھیں کہ وہاں بچے کھیلتے بھی ہیں۔ تم کو لٹو چلانا آتا ہے؟"
"نہیں۔"
"کوئی بات نہیں! میں سکھا دوں گی۔" مومی نے فیاضی سے کہا۔
"مگر ماسٹر مولا بخش اسکول میں لٹو چلانے پر ڈانٹتے ہیں اور اگر تب بھی کوئی نہ مانے تو مارتے بھی ہیں۔" ٹیپو نے مومی کو بتایا۔
"تو بھلا مجھے بھی کوئی مار سکتا ہے؟ میرے پاس غلیل ہے۔" مومی نے اکڑ کر کہا۔
"کہاں ہے؟" دونوں نے اشتیاق سے پوچھا۔ مومی نے بڑے فخر سے غلیل نکال کر دکھائی جو اس نے اپنی امی سے نظر بچا کر بیگ میں چھپائی تھی۔
"کیسے چلاتی ہو تم اسے؟" نونی نے پوچھا۔ مومی نے ایک پتھر رکھ کر چلایا، مگر ٹیپو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پتھر کس طرح اتنے زور سے نشانے پر لگتا ہے۔ مومی نے دوبارہ اُسے سمجھایا اور یوں یہ تینوں بچے اسکول جانا بھول کر غلیل چلانا سیکھنے لگے۔
"اوہو! ہمیں دیر ہو چکی ہے۔ جلدی چلو ورنہ ماسٹر صاحب سخت سزا دیں گے۔" نونی نے اچانک چلّا کر کہا۔ ٹیپو بھی ہڑبڑا کر اٹھا اور تینوں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول پہنچے۔ مگر یہ

بھاگ دوڑ بھی بے کار رہی ۔ ماسٹر مولا بخش حاضری لے چکے تھے اور اب بچّوں کو گنتی سکھا رہے تھے ۔ ٹیپو نے جھانک کر دیکھا اور روتے ہوئے بولا "ہم کافی دیر سے پہنچے ہیں ۔ اب ہم اندر جائیں گے تو ماسٹر صاحب ضرور ڈانٹ پلائیں گے ۔ نونی ! پہلے تم اندر چلو ۔"

"واہ ! میں پہلے کیوں جاؤں ؟ تم بڑے ہو ، پہلے تم اندر جاؤ ۔ میں تمھارے پیچھے اندر جاؤں گا ۔" نونی نے چمک کر کہا ۔ اب تینوں میں جھگڑا ہونے لگا کہ پہلے کون اندر جائے ۔ موتی نے جب دونوں کو ڈرتے دیکھا تو وہ سوچنے لگی کہ ضرور کوئی خطرے والی بات ہوگی ، اسی لیے کوئی بھی پہلے جانے کو تیار نہیں ہے ۔ یا شاید پہلے اندر جانے والے بچّے کو ہی مار پڑتی ہوگی اور پیچھے والے بچّے آرام سے جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہوں گے ۔ اس وقت تینوں دروازے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو آگے دھکیل رہے تھے اور دبی دبی زبان میں اندر جانے کو کہہ رہے تھے ۔ آخر موتی سے ضبط نہ ہوا اور اس نے نونی کو زور سے دھکا دیا ۔ نونی بے چارہ ماسٹر مولا بخش کی کرسی کے پاس جا کر گرا ۔ ماسٹر مولا بخش نے چونک کر نونی کو دیکھا اور کلاس کے سارے بچّے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے ۔

"یہ کیا طریقہ نکالا ہے تم نے کلاس میں داخل ہونے کا ؟ تم نے اندر آنے سے پہلے اجازت

کیوں نہیں لی؟"

پھر اُن کی نظر مومی اور ٹیپو پر پڑی جو خاموشی سے اندر آکر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے حکم دیا، "تم تینوں ادھر آؤ اور بتاؤ کہ اتنی دیر کہاں لگائی؟"

ڈرتے ڈرتے تینوں نے ساری بات کہہ سنائی۔ ماسٹر صاحب نے ساری بات سُن کر کہا، "مومی سب سے پہلے تم مجھے غلیل دو۔" مومی نے بڑے ہاتھ پیر مارے مگر غلیل ماسٹر صاحب نے لے ہی لی۔

"آج تمھارا اسکول میں پہلا دن ہے۔ اس لیے آج میں تم کو چھوڑ رہا ہوں۔ جاؤ جا کر اپنی اپنی کُرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تم یہ میری سامنے والی کرسی پر بیٹھو گی مومی!" ماسٹر صاحب نے کہا۔

"اب ہم اردو پڑھیں گے۔" ماسٹر مولا بخش نے چاک سے بورڈ پر الف، ب، ت لکھتے ہوئے کہا، "مومی! سب سے پہلے تم پڑھو گی۔ میں جو کہوں گا تم اسے دُہرانا .... ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" مومی نے سَر ہلایا۔

"پڑھو الف۔" ماسٹر صاحب نے کہا۔

"پڑھو الف۔" مومی نے دُہرایا۔ سارے بچے منھ دبا کر ہنسنے لگے۔

"صرف الف کہو۔" ماسٹر صاحب نے بھنّا کر کہا۔

"صرف الف کہو۔" مومی نے پھر دہرایا۔

"بے۔" اس مرتبہ ماسٹر صاحب نے ہوشیاری سے کہا۔

"بے۔" مومی نے دہرایا۔ یوں 'ٹ' تک پڑھانے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے مومی کو بیٹھنے کو کہا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے مومی سے کہا، "بیٹھ جاؤ" تو وہ توتے کی طرح یہ بات بھی نہ دُہرا دے۔

وقفے تک اور کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ جب وقفہ ہوا تو ماسٹر صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، "اب سب بچے اپنے اپنے لنچ بکس نکالیں اور کھانا کھائیں۔ پھر جس کا دل چاہے وہ کھیلے۔ آدھے گھنٹے بعد دوبارہ پڑھائی شروع ہو گی۔"

مومی نے جلدی سے لنچ بکس نکالا۔ اس کے برابر میں ایک پیاری سی بچّی بیٹھی تھی۔ اس کا لنچ بکس بھی بالکل مومی کے لنچ بکس جیسا تھا۔ مومی نے لنچ بکس کھولا تو وہ خالی تھا۔ مومی

کی امی جلدی میں لنچ بکس میں ڈبل روٹی رکھنا تو بھول ہی گئی تھیں۔ مگر مومی سمجھی کہ میرا لنچ بکس اس لڑکی نے اُٹھا لیا ہے جو برابر میں بیٹھی ہے۔ بس اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی ساتھی بچّی کے ہاتھ سے لنچ بکس چھین لیا۔ وہ بچّی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ اس نے پہلے تو اپنا لنچ بکس واپس چھیننے کی کوشش کی پھر مومی کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔ مومی کو بڑی تکلیف ہوئی مگر وہ آسانی سے رونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے ایک طمانچہ اس بچّی کے مارا۔ اب تو وہ دھینگا مُشتی شروع ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔ بچّوں کو ایک نیا تماشا مل گیا۔ وہ چاروں طرف جمع ہو گئے اور یہ دل چسپ لڑائی دیکھنے لگے۔ شور کی آواز سُن کر ماسٹر مولا بخش بھاگے بھاگے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی سارے بچّے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ماسٹر صاحب نے دونوں بچّیوں کو بڑی مشکل سے الگ الگ کیا۔ انھوں نے اپنا غصّہ دباتے ہوئے نرمی سے کہا، ”کیا معاملہ ہے؟ تم دونوں کیوں لڑ رہی تھیں؟“

اس بچّی نے کہا کہ مومی نے بلاوجہ میرا لنچ بکس چھینا ہے۔ جب کہ مومی کا کہنا تھا کہ یہ میرا لنچ بکس ہے۔ ماسٹر مولا بخش نے دونوں کے لنچ بکس منگوائے۔

”مومی تمھارا لنچ بکس تو خالی ہے۔“ ماسٹر صاحب نے کہا۔

”یہ میرا لنچ بکس نہیں ہے۔ امی نے میرے لنچ بکس میں مکھن لگی ڈبل روٹی رکھی تھی۔“

”لاؤ ذرا مونا کا لنچ بکس دیکھیں اس میں مکھن لگی ڈبل روٹی تو نہیں ہے؟“ یہ کہتے ہوئے ماسٹر مولا بخش نے مونا کا لنچ بکس کھولا۔

”اس میں تو بسکٹ رکھے ہیں اور اس پر تو مونا کا نام بھی لکھا ہے۔ مومی بیٹے! تمھیں غلط فہمی ہوئی۔ دراصل تمھاری امی جان تمھارے لنچ بکس میں ڈبل روٹی رکھنا بھول گئیں، مگر دیکھو! اگر تم آرام سے مونا سے پوچھتیں تو اتنا جھگڑا نہ ہوتا۔ اب تم دونوں اچھی بچّیوں کی طرح ہاتھ ملاؤ شاباش!“ یوں ماسٹر مولا بخش نے صلح صفائی کروادی اور پھر مومی کو بسکٹ بھی کھلائے۔

جب دوبارہ پڑھائی شروع ہوئی تو ایک نئی پریشانی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ببلو جب گنتی لکھنے کے لیے بورڈ کی طرف بڑھا تو مومی نے ٹانگ اَڑا دی۔ ببلو دَھپ سے زمین پر گرا۔ مومی اپنی اس حرکت پر کھِل کھِلا کر ہنسی۔ ماسٹر مولا بخش کو سخت غصّہ آیا۔ ماسٹر مولا بخش نے ببلو کو اُٹھایا اور واپس اس کی جگہ پر بھیجا۔ پھر وہ مومی کو لے کر ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں گئے اور

اور ان کو ساری بات بتائی۔

"مومی کو بڑے پیار سے سمجھانا پڑے گا۔ ہلکی پھلکی ڈانٹ تو ٹھیک ہے، مگر مارنے سے کام بگڑ جائے گا اور مومی اور بدتمیز ہو جائے گی۔ میں اس کو یہاں اس لیے لایا ہوں کہ آپ اس کو آرام سے سمجھا دیں۔ آپ کی بات یہ شاید مان لے۔" یہ کہہ کر ماسٹر مولا بخش کلاس میں واپس چلے گئے۔

ہیڈمس نے مومی کو بُلایا اور اُسے پیار سے سمجھانے لگیں کہ اس طرح کی شرارتیں کرنے سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ وہ کافی دیر مومی کو سمجھاتی رہیں۔ آخر میں انھوں نے کہا: "مجھے پتا ہے کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ شرارتیں تو سب کرتے ہیں بلکہ بچے شرارتیں کرتے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں، مگر شرارت ایسی ہونی چاہیے جو کسی کا دل نہ دُکھائے اور کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ یہ بتاؤ کہ تم کو سب سے اچھا کون لگتا ہے؟"

"ابّو" مومی نے جھٹ کہا۔

"اگر ابّو کہیں کہ مومی تم دوسروں کو تنگ کرنا چھوڑ دو تو تم چھوڑ دو گی؟"

"اور کیا! میں فوراً چھوڑ دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آج تمھاری سال گرہ ہے۔ شاید تمھارے ابّو آج آجائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے کہیں گے تو تم ان کی بات مان لوگی۔ اب اپنی کلاس میں جاؤ۔"

ہیڈمسٹریس نے مومی کو کلاس میں بھیجا۔ مگر مومی کا کلاس میں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اسکول آکر سخت مایوس ہوئی تھی۔ یہاں پر تو ہر کوئی روک ٹوک کر رہا تھا۔ امّی نے تو کہا تھا کہ اسکول بہت اچھا ہوتا ہے۔

"اب میں ہرگز ہرگز اسکول میں نہیں جاؤں گی۔" یہ سوچتے ہی مومی اسکول کے دروازے کی طرف گئی۔ وہاں چوکی دار موجود تھا، مگر اس کی نظر بچا کر مومی بھاگ نکلی۔ باہر آکر اُس نے ندی کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر مومی بڑی خوش ہوئی۔ یہ ندی اس کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ سخت سردی کے باوجود مومی نے اپنے سَر سے اونی ٹوپی اُتار لی۔ پھر اس نے ندی کے کنارے لیٹ کر اپنی ٹوپی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر پانی میں تیرانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ٹوپی نکال کر اس نے دیکھا تو اس میں ننھی ننھی سی دو مچھلیاں پڑی تھیں۔ مومی بہت خوش ہوئی۔ اس نے

اُچھلتے ہوئے کہا:

"دو! آہا! پوری دو مچھلیاں!"

"دکھاؤ تو ذرا، میں بھی دیکھوں۔" پیچھے سے کسی نے کہا۔

مومی نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کمر پر سفری تھیلا تھا اور جوتوں پر مٹی جمی ہوئی تھی۔

"ڈرو نہیں۔ مجھے بھی دکھاؤ تم نے کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں۔" اجنبی نے پھر کہا۔

"یہ دیکھیں، پوری دو۔" یہ کہہ کر مومی نے اپنی ٹوپی اس شخص کے سامنے کر دی۔

"ارے واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ مگر تم اپنی ٹوپی میں مچھلیاں کیوں پکڑ رہی ہو؟ اتنی سردی میں تو ٹوپی تمھارے سر پر ہونی چاہیے۔ یہ بتاؤ تم یہاں کس کے ساتھ آئی ہو؟" اجنبی نے پوچھا۔

میں اکیلی آئی ہوں۔" مومی نے فخر سے کہا۔

"تم کو کسی کے ساتھ یہاں آنا چاہیے تھا۔ اس طرح تو تم گُم ہو سکتی ہو۔ آؤ میں تم کو تمھارے گھر چھوڑ آؤں۔"

"نہیں ابھی میں گھر نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا تمھارا نام کیا ہے؟"

"مومی۔"

"اچھا! تو تم مومی ہو۔ ارے واہ! میں تم کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ مجھے ایک بڑا اچھا جادو آتا ہے۔"

"کیسا جادو؟" مومی کو اب اس کی باتوں میں بڑی دل چسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں تمھارے اور تمھارے گھر کے بارے میں کئی باتیں بتا سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں تمھیں بتاتا ہوں کہ آج تمھاری سال گرہ ہے۔" مومی تو اُچھل ہی پڑی۔

"ارے واہ! آپ کو تو سچ مچ جادو آتا ہے۔ کوئی اور بات بتائیے۔" اجنبی نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر بعد اپنی آنکھیں کھول کر کہا:

"تمھاری امی کا قصبے میں ایک اسٹور ہے اور تمھارا گھر سُرخ اینٹوں سے بنا ہوا ہے۔"

"بالکل ٹھیک! بالکل ٹھیک!" مومی نے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب اپنے جادو کے زور سے یہ بتائیے کہ کیا ماسٹر مولا بخش کو پتا چل گیا ہے کہ میں اسکول سے بھاگ آئی ہوں؟" مومی بے خیالی میں کہہ گئی۔

"کیا؟ تم اسکول سے بھاگ کر آئی ہو! اور یہاں مزے سے بیٹھی ہو، یہ تو بہت بُری بات ہے۔ آؤ میں تم کو اسکول چھوڑ آؤں۔ میں ماسٹر مولا بخش سے کہہ دوں گا کہ وہ تم کو معاف کر دیں۔" اجنبی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے اسکول پسند نہیں ہے۔" مومی نے کہا۔

"اسکول تو بہت اچھا ہوتا ہے۔ میں تو تم کو اسکول لے جا کر ہی رہوں گا۔" اجنبی نے مومی کو پکڑنے کے لیے قدم بڑھایا۔ اس وقت وہ ندی کے کنارے پر تھا۔ مومی نے اسے زور سے دھکا دیا اور جادوگر ندی میں گر پڑا۔ بھاگتے بھاگتے مومی نے مُڑ کر دیکھا وہ پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔

راستے میں ماسٹر مولا بخش نے اس کو پکڑ لیا اور واپس اسکول لے گئے۔ سزا کے طور پر چھٹّی کے بعد ایک گھنٹے تک مومی کو اسکول ہی میں رہنا پڑا۔

آخر ماسٹر مولا بخش کو اس پر ترس آیا اور وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ انھوں نے اس کی امّی کو ساری کہانی بھی سُنا دی۔ آج مومی کی سال گرہ تھی اس لیے مومی کو کچھ نہیں کہا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد مومی کی سال گرہ کی تیاری شروع ہوئی۔ امی نے مومی کو تیار کر دیا اور کہا، "مومی! تم نے پوچھا نہیں کہ تمھارے ابّو آئے یا نہیں؟"

مومی نے افسردگی سے کہا، "آتے تو سامنے ہوتے!"

"تمھارے ابّو آ چکے ہیں۔ مگر ان کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے ان کو شام تک آرام کرنے کو کہا ہے۔" یہ بات سُن کر مومی بہت خوش ہوئی۔ وہ فوراً اپنے ابّو کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر اُسے پکڑ لیا اور کہا، "ڈاکٹر نے ان کو آرام کرنے کو کہا ہے، وہ دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہے ہیں۔ تم اندر کیسے جاؤ گی؟" یہ سُن کر مومی خاموش ہو گئی۔

شام کو سب مہمان آ گئے مگر ابّو کمرے سے باہر نہیں آئے۔ مومی بڑی بے چین تھی۔ جب کیک کٹنے لگا تو اچانک ابّو آ گئے۔ امّی نے کہا:

"مومی! دیکھو تمھارے ابّو آ گئے ہیں۔"

مومی نے سَر گھما کر دیکھا" ارے! یہ تو وہی جادوگر ہے جس کو میں نے ندی میں دھکا دیا تھا۔" اب تو مومی بڑی شرمندہ ہوئی۔

ابّو نے اس کو گود میں اُٹھا لیا اور بولے،" ارے مومی تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔" پھر چپکے سے مومی کے کان میں بولے" فکر نہ کرو۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ مجھے بخار کیوں ہوا؟ تمھاری امّی کو بھی نہیں بتایا کہ تم نے مجھے ندی میں دھکا دیا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ میری پیاری بیٹی آئندہ ایسی کوئی شرارت نہیں کرے گی۔"

"ابّو کتنے اچھے ہیں۔" مومی نے خوش ہو کر سوچا۔ ابّو کے ایک جملے نے وہ کام کر دیا تھا جو تمام قصبے والے اور ماسٹر مولا بخش بھی مل کر نہیں کر سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ آپ کو اتنا اچھا جادو آتا ہے۔" مومی نے ابّو کے کان میں کہا۔ اس بات پر ابّو بہت زور سے ہنسے۔ مومی بھی ہنسنے لگی۔ ابّو نے تحفے میں مومی کو بہت پیاری سی گڑیا دی تھی۔ اس کے بال اور کپڑے تھوڑے گیلے تھے۔ مومی کی امّی نے کہا" مومی! تمھارے ابّو کہہ رہے تھے کہ ان کا تھیلا ندی میں گر گیا تھا جس کی وجہ سے گڑیا گیلی ہو گئی ہے۔" مومی اس بات پر بہت زور سے ہنس پڑی۔

کتابِ دوستاں میں حکیم محمد سعید نے نونہالوں، جوانوں اور بڑوں سب کے لیے اپنے مطالعے کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ سیکڑوں عنوانات پر چھوٹے چھوٹے جواہر پارے، سادہ آسان اور دل نشیں زبان میں حکمت اور تجربے کی باتیں۔ زندگی کے ہر مسئلے میں یہ کتاب دوستی کا حق ادا کرے گی۔

کتابِ دوستاں

حکیم محمد سعید کے مشہور و مقبول کالم "جاگو جگاؤ" کو مسعود احمد برکاتی نے ایک خوب صورت لڑی میں پرو کر کتابِ دوستاں کی شکل دی ہے۔ اس کتاب کی نقل و اشاعت کے جملہ حقوق عام ہیں۔

کتابِ دوستاں ایک مفید اور خوبصورت کتاب ہے

قیمت تیس رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ـــ کراچی

ہمدرد انسائکلو پیڈیا

علی ناصر زیدی

س: فوارے کا پانی اوپر ہی اوپر کیوں اُچھلتا ہے؟ حسن مہدی خراسانی، کراچی
ج: فوارے کا اصول یہ ہے کہ اُس کے نیچے اندر ہی اندر پانی بہت زیادہ پریشر (دباؤ) کے ساتھ آتا ہے اور جدھر اُسے راستہ ملتا ہے اُدھر چڑھ جاتا ہے۔ چوں کہ فوّارے میں عام طور پر ایک ٹیوب سیدھی کھڑی کی جاتی ہے اور اس کے اوپر چھلنی لگی ہوتی ہے اس لیے پانی زور سے اُوپر جاتا ہے اور اس چھلنی میں سے پھُواروں کی شکل میں چاروں طرف بکھر جاتا ہے۔ فوارّے کی اونچائی ضرورت کے مطابق کچھ بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اب آپ نے دیکھا ہو گا کہ فوارے کا پانی اوپر ہی نہیں جاتا بلکہ دائیں بائیں اِدھر اُدھر بھی اُچھلتا ہے یعنی جدھر بھی اس کا راستہ بنا دیا جائے وہ اُسی طرف سے زور سے باہر نکلے گا۔ اب گھومنے والے پُرزے بھی بن گئے ہیں جن سے پانی گھوم گھوم کر پھواروں کی شکل میں باہر نکلتا ہے۔

س: سیاروں کی کل تعداد کتنی ہے؟ سیارے کہاں ہیں؟ ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟
شفیق احمد، کوٹ غلام محمد
ج: نظامِ شمسی کے کُل نو سیّارے ہیں۔ ان کی ترتیب اس طرح ہے کہ سورج کی طرف سے شمار کرتے ہوئے پہلا سیارہ (مرکری) عطارد آتا ہے، دوسرا (وینس) زہرا ہے، تیسرا سیّارہ خود ہماری زمین ہے۔ چوتھا سیارہ (مارس) مریخ ہے۔ پانچواں سیارہ سب سے بڑا ہے۔ اس کا نام (جوپیٹر) مشتری ہے۔ چھٹا سیّارہ (سیٹرن) زحل ہے۔ ساتواں سیارہ یورینس ہے۔ آٹھواں نیپچون اور نواں اور آخری سیّارہ پلوٹو کہلاتا ہے۔ یہ سب سیّارے سورج سے اور ہم سے مختلف فاصلوں

پر رہتے ہوئے سورج کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔ چوں کہ وہ ہم سے بہت دور ہیں اس لیے دوربین کے بغیر نظر نہیں آتے، لیکن دو سیارے زہرا اور مریخ شام کو دوربین کے بغیر بھی آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔ ان نو سیاروں کے قطر بھی مختلف ہیں۔ کچھ سیارے چھوٹے ہیں اور کچھ اتنے بڑے کہ ہماری جیسی سیکڑوں زمینیں اُن میں سما سکتی ہیں۔

س: الیکٹرو پلیٹنگ کسے کہتے ہیں؟

ج: بعض دھاتیں ایسی قیمتی ہیں کہ آپ اُن سے ٹھوس اشیا نہیں بنا سکتے۔ مثلاً سونا، چاندی، کرومیم وغیرہ، اس لیے معمولی دھاتوں پر ان قیمتی دھاتوں کا ملمع کر دیا جاتا ہے یا پانی چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو الیکٹرو پلیٹنگ کہتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے گندک کا تیزاب استعمال کیا جاتا ہے۔ جس چیز پر ملمع کرنا ہے اور جس دھات کا ملمع کرنا ہے، دونوں کو اس تیزاب میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس چیز پر ملمع کرنا ہوتا ہے اُسے کرنٹ کے نگیٹو سرے سے اور جس دھات کا ملمع کرنا ہے اُسے پوزیٹو یا مثبت سرے سے جوڑ دیتے ہیں۔ کرنٹ جاری ہوتے ہی ملمع سازی یا الیکٹرو پلیٹنگ شروع ہو جاتی ہے۔ مختلف اشیا پر مختلف دھاتوں کا ملمع کیا جاتا ہے مثلاً کاروں کے بمپروں پر کرومیم کی پلیٹنگ کی جاتی ہے۔ چوں کہ کرومیم مہنگی دھات ہے اس لیے پورے ٹھوس بمپر اس کے نہیں بنائے جا سکتے اور اس کا ملمع چڑھا دیا جاتا ہے جس سے بمپر خوب چمکتا ہے۔

س: خلائی رسد گاہ سے کیا مُراد ہے اور اس کے کام کیا ہیں؟

محمد یاسین مالک، کراچی

ج: وہ عمارت جس میں چاند ستاروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربین اور دوسرے آلات نصب ہوتے ہیں رسد گاہ کہلاتی ہے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسی رسد گاہیں قائم ہیں لیکن جب ہم زمین سے اجرام فلکی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہماری زمین کے چاروں طرف لپٹی ہوئی ہوا اور اس میں موجود گرد کے ذرات راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس لیے سائنس دانوں نے سوچا کہ خلا میں زمین سے کافی بلندی پر ایک رسد گاہ تعمیر کی جائے جس میں اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے کے لیے مختلف ضروری آلات لگائے جائیں۔ ظاہر ہے ایسی رسد گاہ خلا میں کہیں

ٹھیرائی نہیں جاسکتی۔ ٹھیرے گی تو وہ نیچے گر جائے گی، اس لیے اُسے مستقل طور پر ایک خاص بلندی پر ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین کے چاروں طرف گھماتے رہنا پڑے گا۔ ایسی رسدگاہ کو خلائی رسدگاہ کہتے ہیں۔ خلا سے اجرامِ فلکی کا زیادہ بہتر مشاہدہ ہوسکے گا۔

س: ہمارا خون فرش یا کسی دوسری چیز پر گرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی جم کیوں جاتا ہے جب کہ پانی یا کوئی اور مائع فرش یا کسی دوسری چیز پر گرنے کے بعد نہیں جمتی۔

ارشد علی ارشی، کراچی

ج: ہمارے خون میں کچھ تو پانی ہوتا ہے جسے پلازما کہتے ہیں۔ پلازما میں سُرخ خلیات ہوتے ہیں جو ہیموگلوبین پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہمارے رنگ کو سرخ رنگت دیتے ہیں۔ پھر خون میں سفید خلیے ہوتے ہیں جو ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور پلیٹ لٹ ہوتے ہیں جو خون کو جمنے میں مدد دیتے ہیں۔ آپ کے سوال کا تعلق اُن سے ہے۔ یوں بھی اگر جسم پر زخم ہوجائے اور خون نکلنے لگے تو خون ان کی وجہ سے بہنا بند ہوجاتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو انسان خون نکل جانے سے مرجائے۔

جب خون فرش پر یا کسی چیز پر گرتا ہے تو وہ مندرجہ بالا اجزا اور اپنے گاڑھے پن کی وجہ سے تھوڑی دیر بعد جم جاتا ہے جب کہ پانی کی بناوٹ کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ صرف ٹھنڈک سے جمتا ہے جیسے ریفری جریٹر میں جم کر برف بن جاتا ہے یا فرش پر پڑا ہوا تھوڑا پانی اَبخرات بن کر اُڑ جاتا ہے۔ وہ خون سے بالکل مختلف ہے۔

س: جب چھپکلی کو مارتے ہیں تو اُس کی دُم علاحدہ ہوکر کافی دیر تک حرکت کیوں کرتی رہتی ہے؟

شاہانہ تحسین، کراچی

ج: جان داروں کے جسم میں رگوں، ریشوں اور پٹھوں کا جال پھیلا ہوتا ہے۔ چھپکلی کی دُم الگ ہوکر بھی تھوڑی دیر حرکت اس لیے کرتی رہتی ہے کہ اُس میں جان باقی رہتی ہے۔ اور زندگی کے آثار موجود رہتے ہیں۔ اُسے رگوں ریشوں کے ذریعے سے وہ قوّت کچھ دیر ملتی رہتی ہے جس کے ذریعے سے دُم حرکت کرتی رہتی ہے۔

ہمدرد نونہال، جولائی ۱۹۸۹ء

بات ایک کتاب کی

میرزا ادیب

عزیز بچّو! میں نے آپ کے لیے بہت ساری کہانیاں لکھی ہیں جو آپ اپنے پیارے رسالے "نونہال" میں پڑھ چکے ہیں۔ آپ نے میرے ڈرامے بھی ضرور پڑھے ہوں گے۔ مگر میں آج آپ کے لیے نہ تو کوئی کہانی لے کر آیا ہوں اور نہ ڈراما، ان دونوں سے ایک مختلف چیز آپ کو دے رہا ہوں۔ یہ چیز کیا ہے؟ بتاتا ہوں۔ آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ ادب کی کئی شاخیں ہیں۔ ہر شاخ کو ادب کی ایک الگ صنف کہتے ہیں۔ کہانی ادب کی ایک صنف ہے، ناول بھی اور ڈراما بھی۔ ایک خاص صنف کا نام ہے سفرنامہ۔

فرض کیا آپ میں سے ایک بچّہ پاکستان کے کسی شہر یا پاکستان کے باہر کسی ملک میں جاتا ہے۔ وہاں وہ نئے نئے شہر، نئے نئے بازار، نئے نئے لوگ دیکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس نے اپنے اس شہر میں یا بیرونی ملک میں جو کچھ دیکھا ہے اور جو کچھ محسوس کیا ہے اسے لکھ دے تاکہ دوسرے بھی اس تحریر کی مدد سے اس شہر یا ملک کی سیر کریں۔ تو اس تحریر کو سفرنامہ کہیں گے۔

اُردو میں بیسیوں سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ خود ہمارے محترم حکیم محمد سعید صاحب نے کئی سفرنامے لکھے ہیں مثلاً یورپ نامہ، سوئٹزرلینڈ میں میرے چند شب و روز، ماہ و روز (سفرنامہ روس)، کوریا کہانی۔ یہ آخری سفرنامہ کوریا کا ہے۔ بڑے ہو کر آپ ان سفرناموں کو پڑھیں گے تو انھیں بہت دل چسپ پائیں گے۔

اس وقت جو سفرنامہ میرے سامنے ہے اور جس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا نام ہے "دو مسافر، دو ملک"۔ حکیم صاحب محترم اس سفرنامے میں بھی شامل ہیں۔ یعنی دو مسافروں میں سے ایک مسافر ہیں اور دوسرے مسافر ہیں آپ کے محبوب رسالے "ہمدرد نونہال" کے ایڈیٹر مسعود احمد برکاتی۔ ہر ماہ آپ کی ملاقات ان سے ہوتی ہے۔ برکاتی صاحب نے

آپ کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ کہانیاں، مضامین اور صحت کی باتیں۔ اب وہ آپ کو ایک سفرنامہ دے رہے ہیں۔

سب سے پہلے میں ایک بات آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ حکیم صاحب اور دوسرے اہلِ قلم نے جو سفرنامے لکھے ہیں وہ بڑوں کے لیے ہیں، مگر یہ سفرنامہ جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے آپ کے لیے ہے، یعنی بچّوں کے لیے۔ یہ اس سفرنامے کی ایک بڑی خوبی ہے کہ یہ بچّوں کے لیے پہلا سفرنامہ ہے۔ اب دو تین باتیں اور سن لیں:

یہ سفرنامہ بڑے خوب صورت انداز میں چھاپا گیا ہے۔ اس کے اندر انگلینڈ اور پیرس کی مشہور تاریخی عمارتوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ بعض نامور شخصیتوں کی تصویریں بھی ہیں۔ ان تصویروں کی وجہ سے یہ سفرنامہ بڑا دل چسپ ہو گیا ہے۔

اس سفرنامے کی ساری تحریر مسعود احمد برکاتی کے قلم سے ہے۔ برکاتی صاحب بچّوں کے ایک نہایت کام یاب رسالے کے بڑے کام یاب ایڈیٹر ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ بچوں کے لیے کیسے لکھنا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے یہاں جو کچھ لکھا ہے، بڑا سلیس، سادہ اور دل چسپ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ اس سفرنامے کے ذریعے سے جتنی زیادہ معلومات بچوں کو دے سکتے ہیں وہ دے دیں۔ اسی لیے یہ سفرنامہ طرح طرح کی معلومات سے بھرا پڑا ہے۔

انگلستان اور فرانس کا یہ سفر ۱۹۸۲ء میں کیا گیا تھا اور یہ سفر صرف سیاحت کے لیے نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ایک علمی سفر بھی تھا۔ چناں چہ برکاتی صاحب نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا: "اس علمی مگر دل چسپ سفر کا حال لکھتا ہوں۔ جو بات یاد آتی جائے گی لکھتا جاؤں گا۔"

یہ خوشی کی بات ہے کہ برکاتی صاحب نے اس سفر کے دوران جتنی بھی معلومات فراہم کی ہیں ان سب کو بڑے سلیقے سے اور دل چسپ انداز میں لکھ دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سفرنامہ علمی بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ پھر انھوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ کوئی بات بھی اپنے پڑھنے والوں سے نہ چھپائیں۔ جو بات بھی آتی گئی وہ لکھتے گئے ہیں، کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔

ایک دن پیرس میں حکیم صاحب برکاتی صاحب سے کہتے ہیں، آئیے آپ کو کچھ کھلا پلا لاؤں۔ دونوں کسی ریستوران کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کہیں بھی جگہ نہیں ملتی۔ برکاتی صاحب حکیم صاحب سے کہتے ہیں، جناب! آج میں آپ کی تقلید کروں گا۔ اس وقت

کچھ نہیں کھاؤں گا۔ دونوں اپنے ہوٹل میں واپس آجاتے ہیں۔ مگر بھوک آخر بھوک ہوتی ہے۔ حکیم صاحب تو اپنے کمرے میں گئے اور برکاتی صاحب جا پہنچے بازار میں اور کچھ کھانے کو لے آتے۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے، لیکن اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ برکاتی صاحب نے یہ جو لکھا ہے کہ جو بات آتی جائے گی، لکھتا جاؤں گا، انھوں نے اپنے آپ کو نہیں بخشا اور اپنی کم زوری بیان کر دی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ بھوک انسان کی مجبوری ہے، کم زوری نہیں ہے۔

برکاتی صاحب نے جہاں کہیں بھی گئے ہیں، ماحول کو سمجھا ہے، لوگوں کو پرکھا ہے، کسی عمارت کو دیکھا ہے تو اس کے بارے میں معلومات مہیا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ جو کچھ بھی دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، اس کا بے تکلفی سے اظہار کر دیا ہے۔

انھوں نے یہ سفرنامہ بچّوں کے لیے لکھا ہے۔ اس لیے معلومات فراہم کرنے اور انھیں محفوظ کرنے میں ایک تو انھوں نے ایسی باتوں کا انتخاب کیا ہے جن سے بچّوں کو دل چسپی ہو سکتی ہے اور پھر انھیں پیش بھی دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

کیمبرج یونی ورسٹی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ یونی ورسٹی کیمبرج شہر میں واقع ہے۔ برکاتی صاحب اس یونی ورسٹی کی طرف جاتے ہیں تو بتاتے ہیں:

"لندن سے کیمبرج کا شہر کوئی ستّر میل دُور ہے۔ لندن شہر ختم ہونے کے بعد سڑکیں زیادہ چوڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کو "موٹر ویز" کہتے ہیں۔ ان پر بڑے آرام سے کاریں اور دوسری سواریاں دوڑتی ہیں۔ لوگ قاعدے اور اُصول کی پابندی کے عادی ہیں اس لیے تیز چلانے کے باوجود گاڑیاں آپس میں ٹکراتی نہیں۔ لندن میں کار چلانے والے پیدل چلنے والوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی پیدل چلنے والا سڑک پار کرنے کے لیے سڑک پر قدم رکھ دے کاریں فوراً رُک جاتی ہیں اور جب تک پیدل چلنے والے دوسرے کنارے پر نہ پہنچ جائیں، کاریں رُکی رہتی ہیں۔"

برٹش میوزیم ایک بہت بڑا تاریخی عجائب گھر ہے۔ جو شخص بھی لندن جاتا ہے، برٹش میوزیم ضرور جاتا ہے۔ برکاتی صاحب نے اس کے متعلق لکھا ہے:

"برٹش میوزیم کہنے کو تو ایک بڑا عجائب گھر ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا اس کو کیا کہوں۔ تاریخ و تہذیب کا خزانہ! مگر مجھے تاریخ کا خلاصہ زیادہ صحیح معلوم ہوا ہے۔ اس

میں کیا کچھ نہیں ہے ۔ ہر وہ چیز محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے انسان کی جد وجہد کا علم ہوتا ہے۔ زندگی میں سہولت پیدا کرنے، زندگی کو خوب صورت بنانے اور علم و دانش کو آگے بڑھانے کی جد وجہد کے راستے میں جو جو مرحلے اور منزلیں آئیں ان کے نشانات کو محفوظ کیا ہے ۔ برٹش میوزیم کی عمارت ہی دیکھ کر اس کی وسعت ضخامت اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ بلند و بالا عمارت، بڑے بڑے کمرے، کمروں میں بڑے بڑے شوکیس، جن میں بڑی حفاظت سے نادر چیزیں رکھی ہیں ۔"

برکاتی صاحب نے پیرس کے ایفل ٹاور، لندن کے مشہور تاریخی بگ بین، ویسٹ منسٹر ایبے (جس میں انگلستان کی بڑی شخصیتیں دفن ہیں) ٹاور اوف لندن، مادام تساد کے عجائب گھر، شیلڈونین تھیٹر، پیرس کے سب سے حسین بازار شانزالیزے، پیرس کے مشہور تاریخی گرجا نوتردام، نپولین کا مقبرہ، ان سب کے متعلق اچھی خاصی باتیں بتائی ہیں۔ ان کے علاوہ جن بڑے لوگوں کا تعارف کرایا ہے اور جن کی تصویریں بھی دی ہیں، ان میں چند نام یہ ہیں: یونیسکو کے پہلے ڈائریکٹر جنرل جولین ہکسلے جو بہت بڑے سائنس داں تھے، ڈاکٹر سر ہینس سلون جنھوں نے برٹش میوزیم کو سب سے پہلے اپنا ذاتی ذخیرہ دیا تھا ۔ اس ذاتی ذخیرے میں بڑی نادر چیزیں تھیں۔ جناب گوون ٹائٹ یہ برٹش میوزیم لائبریری کے پہلے لائبریرین تھے ۔

مادام میری تساد، جنھوں نے لندن میں ایک ایسا عجائب گھر بنایا جس میں دنیا کی معروف شخصیتوں کے موم کے بنے ہوئے مجسّمے رکھے گئے ہیں۔ یہ مجسّمے مادام میری تساد نے بنائے تھے ۔

لیونارڈو داونچی۔ یہ وہ مصوّر ہے جس نے مونالیزا کی تصویر بنائی تھی۔ اس تصویر کو ایک غیر فانی شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ برکاتی صاحب نے ان سب کا تعارف کتاب پڑھنے والوں سے کرایا ہے ۔

برکاتی صاحب نے جہاں کہیں بھی کوئی اچھی چیز دیکھی ہے اس بہت خوب صورت سفر نامے میں اس کا ذکر ضرور کر دیا ہے ۔ اصل میں برکاتی صاحب کو اپنے ملک اور اپنی قوم سے بڑی محبت ہے۔ وہ جب کہیں کوئی اچھی چیز پاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ چیز ان کے اپنے وطن میں نہیں ہے تو انھیں بڑا دکھ ہوتا ہے ۔ ہمارے ہاں جب آدمی

رٹائر ہو جاتا ہے تو وہ عام طور پر اپنے آپ کو بے کار سمجھنے لگتا ہے مگر انگلستان میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی شخص رٹائر ہوتا ہے تو وہ حکومت سے کہتا ہے، مجھ سے لوگوں کی بہتری کے لیے کوئی کام لیجیے۔ چناں چہ حکومت اس کے لیے کوئی ایسی ڈیوٹی لگا دیتی ہے مثلاً ایک شخص کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ فلاں جگہ اسکول کے بچّوں کو سڑک پار کرا دیا کریں۔

برکاتی صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" اس طرح لوگوں کے ہاتھ پاؤں چلتے رہتے ہیں اور ان کو خوشی بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ میں اپنے شہر میں دیکھتا ہوں کہ بعض رٹائر لوگ صبح سے شام تک پلنگ یا کرسی توڑتے رہتے ہیں اور دوسروں کا وقت خراب کرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کو خدمت کی خوشی میسّر ہے اور نہ کام کا ٹانک ملتا ہے۔ حال آنکہ دونوں مُفت کی چیزیں ہیں۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

" انسان کی عمر تو محدود ہوتی ہے، لیکن ادارے ہمیشہ قائم رہ سکتے ہیں۔ اس لیے کسی قوم یا انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ ادارے بنائے جائیں اور ان کو ترقی دی جائے۔ جس شخص میں کوئی اچھا کام کرنے کا جذبہ موجود ہو اس کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ جتنی بھی ہمّت اور حیثیت ہو اس کے مطابق کام شروع کر دو۔ اس کے بعد دوسرے لوگ خود آجائیں گے۔"

لندن میں برکاتی صاحب چاند پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے ذہن میں فوراً یہ خیال آجاتا ہے :

" جس طرح چاند کا نور سب جگہ پہنچتا ہے اسی طرح محبت اور پیار کی روشنی بھی سب جگہ پھیل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ کتنا مزہ آئے۔ اگر ساری دنیا کے لوگ دلوں سے بُغض، حسد اور نفرت نکال دیں اور بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں اور اپنے علم اور اخلاق سے انسان کی بھلائی کے لیے کام کریں۔"

کاش ایسا ہو جائے !

یہ سفرنامہ بہت خوب صورت، بہت دل چسپ ہے، پڑھنے والے اسے بڑی دل چسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور زندگی کے بڑے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

آسان علاج

املی — ہضم کے لیے

ایک سال کی پُرانی املی کا گودا جگر، معدے اور آنتوں کے لیے خاص طور پر مفید ہوتا ہے۔ مستقل قبض کے مریضوں کو ۳۰ گرام پُرانی املی کا گودا استعمال کرانے سے چند دن میں شفا ہو جاتی ہے۔ املی دست آور ہونے باوجود بدہضمی کے دستوں کو فاسد مواد خارج کرکے روک دیتی ہے۔

بڑھی ہوئی تلّی کا علاج — پپیتا

پپیتا بڑھی ہوئی تلّی کو صحیح حالت میں لانے کے لیے ایک نہایت مفید دوا ہے۔ اس مقصد کے لیے پکّا پپیتا بھی استعمال کرتے ہیں اور کچّا بھی۔ کچّے پپیتے کے ٹکڑے کاٹ کر سرکے میں ڈال دیں۔ آٹھ دس دن کے بعد ایک دو ٹکڑے روزانہ کھائیں۔

بھوک کی کمی اور گیس — اَجوائن

خراب اور ناقص غذا کے استعمال سے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے اور وہ ڈھول کی طرح پُھول جاتا ہے۔ اجوائن کھانے سے ریاح کا اخراج ہو جاتا ہے اور طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ جس شخص کو بھوک کم لگتی ہو وہ اجوائن تھوڑی مقدار میں ہر کھانے کے بعد کھائے تو بھوک کُھل کر لگے گی۔

ایک مفید پھل — آملہ

جدید تحقیقات کی رُو سے آملے میں حیاتین ج (وٹامن سی) سنترے اور نارنگی

سے بھی زیادہ پایا جاتا ہے، اس لیے آملہ کا استعمال اسکروی کے مرض میں خصوصیت کے ساتھ بہت مفید ہے۔ اسکروی ایک ایسی بیماری ہے جس میں مسوڑے پلپلے ہوجاتے ہیں اور ان سے خون بہنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ آملے کا تیل بالوں کو بھی مضبوط کرتا ہے اور ان کو سفید ہونے سے روکتا ہے۔

خونی پیچش کے لیے — کالی ہڑ

کالی ہڑ (چھوٹی ہڑ) خونی پیچش کے لیے اکسیر ہے۔ کالی ہڑ کا سفوف بنا کر تین تین گرام صبح، سہ پہر اور رات کو پانی سے کھائیں۔ اس کے کھانے سے خون بھی بند ہو جاتا ہے اور پیچش کو بالکل آرام آجاتا ہے۔ پُرانی پیچش بھی اس سادہ نسخے کے استعمال سے جاتی رہتی ہے۔

آگ سے جلنے کا علاج — ارنڈ

اگر جسم آگ سے جل جائے تو ارنڈ کے پتّوں کو خوب باریک پیسیں اور تل کا تیل ملا کر جلی ہوئی جگہ پر لیپ کر دیں، فوراً ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ آبلہ بھی نہیں پڑے گا اور جلی ہوئی جگہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ جل جانے کے لیے آزمائی ہوئی دوا ہے۔

گُلِ بنفشہ

گُلِ بنفشہ نزلے کی مشہور دوا ہے۔ گُلِ بنفشہ ۱۲ گرام، کالی مرچیں گیارہ عدد اور چینی ۲۵ گرام۔ یہ سب ڈیڑھ پاؤ پانی میں جوش دیں، جب پانی آدھا رہ جائے تو چھان کر ہلکا گرم پلائیں۔ یہ نسخہ نزلہ زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور بخار کے لیے مفید ہے۔

پھوڑے پھنسیوں کا علاج — نیم

نیم کے پتے خون صاف کرنے کے لیے بے حد مفید اور مؤثر ہیں۔ اگر سارے جسم میں خارش کی شکایت ہو جائے تو نیم کے پتّوں کے جوشاندے سے نہانا چاہیے اور زخموں کو

اس کے جوشاندے سے دھونا چاہیے. تقریباً سات گرام نیم کی کونپلیں سات عدد کالی مرچوں کے ساتھ پیس چھان کر پینے سے خارش، داد، پھوڑے پھنسیاں اور گرمی دانے ختم ہو جاتے ہیں۔

زہروں کا تریاق — ریٹھا

ریٹھا نہایت عجیب و غریب دوا ہے۔ یہ مقوّی ہونے کے ساتھ ساتھ زہروں کا تریاق بھی ہے۔ ریٹھا سانپ، بچھو اور کن کھجورے (ہزار پا) تک کے زہر کا اثر ختم کر دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ریٹھے کے چھلکے کا سفوف (۶ گرام) پانی میں گھول کر پلانے سے قے اور دست آتے ہیں اور زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

معدے کی کم زوری سے پیچش

بعض لوگوں کے معدے کم زور ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا اور اگر وہ کبھی بد پرہیزی کر لیں تو پیچش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس پیچش کے علاج کے لیے یہ نسخہ استعمال کریں۔ پوستِ خشخاش، سونف اور چھوٹی ہڑ۔ تینوں برابر وزن کی لے کر گھی سے معمولی تر کر کے توے پر اتنا بھونیں کہ جلنے نہ پائے۔ اس کے بعد ان تینوں کو باریک پیس لیں۔ چھے چھے گرام کی مقدار میں یہ سفوف پانی کے ساتھ استعمال کرائیں۔

نیند نہ آنے کا علاج ۔ خشخاش

خشخاش کا استعمال دوا کے علاوہ بعض کھانوں میں مسالے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل بیج ہوتے ہیں جو عام دکانوں اور پنساریوں کے ہاں مل جاتے ہیں اور کئی بیماریوں میں کام آتے ہیں۔ اگر نیند نہ آتی ہو تو تخم خشخاش تین گرام اور میٹھے بادام سات عدد پانی میں پیس کر پینے سے دماغ کو قوّت حاصل ہوتی ہے اور نیند اچھی طرح آتی ہے۔

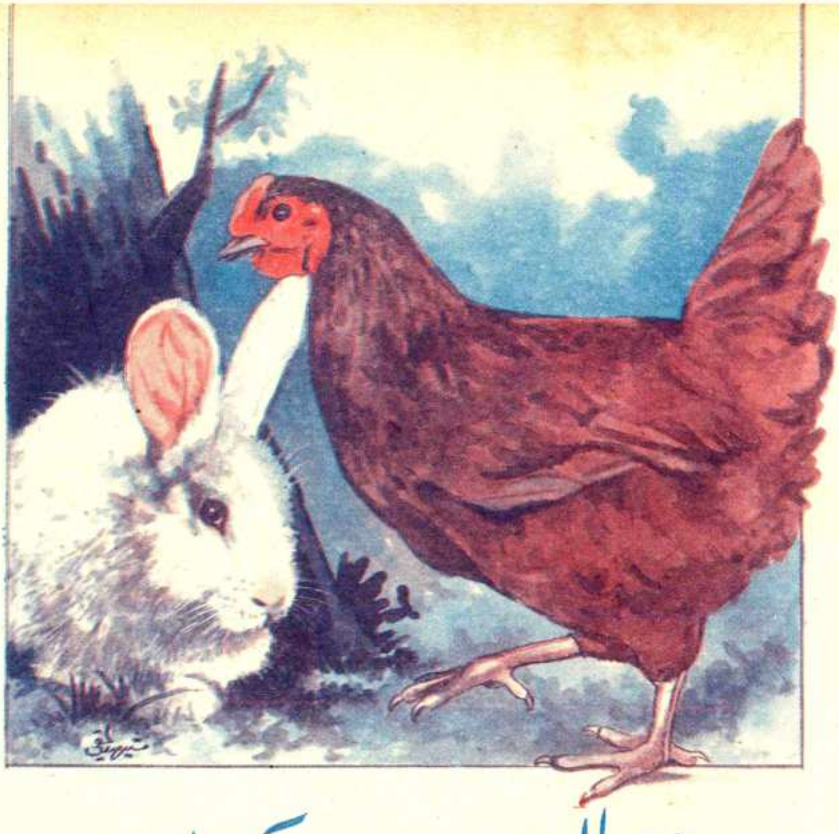

مہربان دوست کے نام

جاوید اقبال، لاہور

صبح سویرے بھورے پروں والی مرغی کرسٹی جنگل میں تالاب کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شبنم سے دُھلے پتوں والی ڈالیاں اِدھر اُدھر جھولا جھول رہی تھیں۔ کرسٹی بوڑھے برگد کے پاس پہنچی تو اس کے کھوکھلے تنے سے مانی خرگوش نے اپنا سفید منھ باہر نکالا اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا:

"کرسٹی! صبح سویرے کس کی تلاش میں نکلی ہو؟"

کرسٹی بولی، "مانی بھیا! میری کتاب چھپنے والی ہے۔ صبح سیر اور چہل قدمی سے ذہن تازہ

ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی کہانی بن جاتی ہے ۔"
مانی بولا، "بہت خوب! کب چھپ کے آرہی ہے کتاب؟"
"بس چند کہانیاں اور لکھ لوں پھر پریس میں دے دوں گی؟" کرسٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا کرسٹی! تمھاری کتاب کا انتساب کس کے نام ہوگا؟" مانی نے پوچھا۔
"یہ تو ابھی میں نے نہیں سوچا۔" کرسٹی نے کہا۔
ابھی دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گریٹی بطخ اور ہیتی گلہری وہاں آپہنچیں۔ "بھئی! کیا کس کے نام ہو رہا ہے؟" ہیتی نے آتے ہی پوچھا۔
"کرسٹی کی کتاب چھپنے والی ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ کتاب کا انتساب کس کے نام ہے۔" مانی نے کہا۔
"یہ انتساب کیا ہوتا ہے؟" گریٹی نے اپنا گول سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔
"جب کوئی ادیب کتاب لکھتا ہے تو وہ اپنی کتاب کسی پسندیدہ ہستی کے نام کر دیتا ہے، اُس ہستی کے نام جس سے اسے پیار ہوتا ہے، عقیدت ہوتی ہے۔ آئی بات سمجھ میں؟" کرسٹی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں سمجھ گئی۔ پھر تم کس کے نام کر رہی ہو اپنی کتاب؟" گریٹی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"بھئی جب کتاب چھپے گی تو تم خود ہی دیکھ لینا۔" کرسٹی نے کہا۔
ہیتی بولی، "اچھا بھئی، میں تو چلوں۔ جنگل کے باہر رَس بھریاں پک گئی ہیں۔ میں وہ لینے جا رہی تھی۔"
"ہیتی کو تو بس کھانے کی پڑی رہتی ہے۔" گریٹی نے کہا اور سب ہنستے ہوئے اپنے اپنے گھر کو چل دیے۔
اس ملاقات کے دوسرے دن بڑے زور کے جھکّڑ چلے اور زبردست برف باری ہوئی۔ زرد پتّوں والے درخت سفید سفید برف سے ڈھک گئے۔ جھاڑیاں، میدان اور پہاڑوں کی چوٹیاں چاندی جیسی برف تلے دب گئیں اور آسمان پر بادلوں کی سہمی ہوئی ٹولیاں چکرانے لگیں۔ اس برف باری کے لیے جنگل کے جانور پہلے سے تیار نہ تھے اور انھوں نے ابھی خوراک کا ذخیرہ بھی نہیں کیا تھا۔ جو تھوڑی بہت خوراک گھروں میں تھی وہ دو تین دن میں ختم ہو گئی اور پھر فاقے

شروع ہو گئے۔

ایک صبح کرسٹی بھوک سے تنگ آکر خوراک کی تلاش میں گھر سے نکلی۔ مگر جنگل میں ٹھنڈی برف اور سوئیوں کی طرح چبھنے والی ہوا کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد گریٹی کے گھر کی طرف آنکلی۔ گریٹی کے پاس بھی کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گریٹی نے کرسٹی کو بتایا کہ صبح مانی خرگوش آیا تھا۔ دو دن سے بھوکا تھا۔ میرے پاس تھوڑا سا شہد تھا۔ وہ میں نے اسے دے دیا۔

کرسٹی وہاں سے مایوس لوٹی۔ جب وہ بوڑھے برگد کے پاس پہنچی تو اسے ہینی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس کے پاس کچھ ہو۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ برگد کی شاخ پر ہینی کا گھر برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرسٹی نے اُسے آواز دی، مگر اس کی آواز تیز ہوا کے شور میں دب گئی۔ اسی وقت برف باری تیز ہو گئی۔ چناں چہ وہ اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ شام کو کرسٹی نے یہ دیکھنے کے لیے کہ برف باری رُکی یا نہیں اپنے گھر سے باہر جھانکا تو اُسے اپنے گھر کے دروازے

کے پاس ایک خوبانی پڑی نظر آئی۔ کرسٹی نے وہ خوبانی اُٹھائی اور اس سے اپنی بھوک مٹائی۔ دوسری صبح اسے اپنے گھر کے باہر ایک رَس بھری پڑی ملی۔ وہ اسے کھانے لگی تو اسے گریٹی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ پتا نہیں گریٹی کو کچھ کھانے کو ملا یا نہیں۔ کرسٹی وہ رَس بھری لے کر گریٹی کے گھر پہنچی۔ گریٹی اپنے گھر میں ایک اخروٹ توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کرسٹی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ اخروٹ اسے اپنے گھر کے باہر پڑا ہوا ملا ہے۔ کرسٹی بہت حیران ہوئی۔ اس نے اخروٹ توڑنے میں گریٹی کی مدد کی اور دونوں نے آدھا آدھا اخروٹ کھایا۔ پھر کرسٹی نے کہا، "گریٹی! یہ خوبانی میں مانی کو دے آتی ہوں۔ بے چارہ بھوکا ہوگا۔" وہ خوبانی لے کر مانی کے گھر گئی تو وہ بیٹھا مٹر کی پھلیاں کھا رہا تھا۔ یہ پھلیاں اسے اپنے گھر کے باہر سے ملی تھیں۔ یہ دیکھ کر کرسٹی کی حیرت اور بڑھ گئی۔ اس نے مانی کو ساتھ لیا اور گریٹی کے گھر جا پہنچی اور تینوں سوچنے لگے کہ وہ کون مہربان ہستی ہے جو چپکے چپکے ان کی مدد کر رہی ہے۔ لیکن وہ تینوں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

اگلے دن کرسٹی اپنے گھر کے سامنے ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپ کے بیٹھ گئی اور اس ہستی کا انتظار کرنے لگی جو چپکے چپکے ان کی مدد کر رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد اسے کوئی اپنے گھر کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ ہینی گلہری تھی۔ ہینی چپکے سے اس کے گھر کے باہر کچھ رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کرسٹی درخت کے تنے سے باہر آئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے دروازے پر چند بادام پڑے ہوئے تھے۔ "اچھا! تو یہ مہربانیاں ہینی کی تھیں!" اس نے دل میں کہا۔

بغیر موسم والی برف باری جلد ہی ختم ہو گئی۔ دھوپ نکلنے لگی اور زندگی کی گہما گہمی پھر شروع ہو گئی۔ جنگل کے سب جانور آنے والے موسم کے لیے خوراک جمع کرنے لگے۔ کرسٹی کی کتاب چھپنے کے لیے پریس جا چکی تھی اور سب بے چینی سے کتاب کے چھپنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر ایک سُہانی صبح کرسٹی نے پیاری پیاری کہانیوں اور رنگ برنگے سرورق والی کتاب کی ایک ایک کاپی اپنے دوستوں کو دی۔ سب نے بے تابی سے اسے کھول کے دیکھا۔ کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا تھا:

"مہربان دوست ہینی کے نام۔"

دو بھائی

علی اسد

اسکول ماسٹر کا نام بارڈ تھا۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کا نام تھا اینڈرُس۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دونوں فوج میں ساتھ ساتھ بھرتی ہوئے۔ شہر میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ جنگ میں بھی دونوں ساتھ ساتھ شریک ہوئے اور ایک ہی پلٹن میں رہے اور دونوں ترقی کر کے کارپورل ہو گئے۔ جب یہ دونوں جنگ سے واپس آئے تو لوگ ان کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ دونوں کتنے سجیلے جوان ہیں۔

پھر ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بہت سی جائداد چھوڑی تھی جس کو تقسیم کرنا بڑا مشکل تھا۔ لہٰذا دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ وہ جائداد کو اپنے درمیان نہ آنے دیں گے۔ اس کے بجائے جائداد کو نیلام پر چڑھا دیں گے تاکہ دونوں جس چیز کو خریدنا چاہیں خرید لیں اور پھر دونوں نیلام سے حاصل

کی ہوئی رقم کو آپس میں بانٹ لیں گے۔ چناں چہ اسی طرح کیا گیا۔ لیکن ان کے والد کی ایک بڑی سی سونے کی گھڑی تھی جس کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ بات یہ تھی کہ اُس زمانے میں اس جگہ کے لوگوں نے سونے کی صرف یہی گھڑی دیکھی تھی۔ جب یہ گھڑی نیلام پر چڑھائی گئی تو بہت سے دولت مند لوگوں نے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر جب ان دونوں بھائیوں نے بولی لگانی شروع کی تو پھر سب لوگ چُپ ہو گئے۔

اب سُنیے کہ بارڈ کا یہ خیال تھا کہ اینڈرس اس کو یہ لے لینے دے گا۔ اسی طرح اینڈرس یہ سوچ رہا تھا کہ بارڈ اس کو یہ حاصل کر لینے دے گا۔ دونوں باری باری بولیاں لگاتے رہے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے رہے۔ نیلامی بولی بولتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو خوب گھورتے رہے۔ جب گھڑی کی بولی بیس ڈالر پر پہنچی تو بارڈ سوچنے لگا کہ اس کا بھائی اس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ چناں چہ اس نے اس سے زیادہ قیمت لگا دی، یہاں تک کہ بولی تیس ڈالر تک پہنچ گئی۔ جب اینڈرس بولی لگانے سے باز نہ آیا تو بارڈ نے سوچا کہ اینڈرس یہ بھول گیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرتا رہا ہے اور یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس کا بڑا بھائی ہے۔ گھڑی کی بولی تیس ڈالر سے بھی آگے نکل گئی۔ اینڈرس دام بڑھاتا چلا گیا۔ اس پر بارڈ نے ایک دَم سے چالیس ڈالر بولی لگا دی اور اب اپنے بھائی کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔

نیلام گھر میں سناٹا چھا گیا۔ صرف نیلام کرنے والا آہستہ آہستہ بولی کی رقم دُہراتا رہا۔ اینڈرس نے سوچا کہ اگر بارڈ چالیس ڈالر لگا سکتا ہے تو وہ بھی یہی کر سکتا ہے اور اگر بارڈ اُسے گھڑی نہیں لینے دینا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ قیمت لگا دے اور گھڑی لے لے۔ بارڈ کو اس میں اپنی بے عزتی دکھائی دی۔ لہٰذا اس نے آہستہ سے پچاس ڈالر کہہ دیے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ اینڈرس نے اپنے دل میں کہا کہ وہ ان سب لوگوں کے سامنے اپنے

بھائی کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس نے بولی اور آگے بڑھادی۔
بارڈ کھلکھلا کر ہنسنے لگا، "ایک سو ڈالر، اور اسی کے ساتھ بھائی کے ساتھ میرا رشتہ بھی۔" وہ بولا اور گھوم کر کمرے کے باہر چلا گیا۔
کچھ دیر بعد جب بارڈ اپنے گھوڑے پر زین رکھ رہا تھا جسے اس نے ذرا دیر قبل نیلام میں خریدا تھا تو ایک آدمی اس کے پاس آگیا اور بولا: "گھڑی تمھاری ہوگئی ہے، اینڈرس نے ہار مان لی ہے۔"
جوں ہی بارڈ نے یہ سُنا تو اس کو افسوس ہوا۔ وہ گھڑی کے بجائے اپنے بھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ زین گھوڑے پر رکھی جاچکی تھی۔ وہ ذرا رُکا۔ اس کا ہاتھ گھوڑے پر تھا۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ گھوڑے پر بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ بہت سے لوگ باہر آگئے۔ ان میں اینڈرس بھی تھا۔
اینڈرس نے جب اپنے بھائی کو جانے کے لیے تیار دیکھا تو اس کو یہ معلوم ہوسکا کہ بارڈ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ چلّایا، "بارڈ! گھڑی کا شکریہ۔ اب تمھارا بھائی آئندہ کبھی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا!"

"اور میں بھی تمھارے دَر پر کبھی نہ آؤں گا!" بارڈ نے جواب دیا۔
یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔
اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی اس گھر میں نہیں آیا جہاں دونوں اپنے باپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ کچھ دِنوں بعد اینڈرس نے شادی کر لی مگر بارڈ کو نہیں بلایا۔ ادھر بارڈ کبھی گرجا گھر نہیں گیا۔ شادی کے بعد پہلے ہی سال اینڈرس کی گائے مر گئی۔ اس کی یہی ایک گائے تھی۔ ایک دن صبح کو مکان کے شمالی حصّے میں وہ مُردہ پائی گئی۔ کوئی بھی یہ نہ بتا سکا کہ وہ کیسے مر گئی۔
لیکن سب سے بڑا صدمہ اس وقت ہوا جب کھلیان میں آگ لگ گئی اور جو کچھ وہاں تھا وہ جَل کر تباہ ہو گیا۔ کسی کو یہ پتا نہ چل سکا کہ آگ کیسے لگ گئی۔
اینڈرس نے دل میں کہا، "یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جو مجھے تکلیف دینا چاہتا ہے۔" اور وہ رات بھر روتا رہا۔ وہ بالکل غریب ہو گیا۔ اس کا دل ہر کام سے بے زار ہو گیا۔
جس رات کو آگ لگی بارڈ اپنے بھائی کے گھر آیا۔ اینڈرس پلنگ پر پڑا

ہوا تھا مگر جوں ہی بارڈ داخل ہوا وہ کود کر کھڑا ہو گیا۔
"یہاں کیا لینے آئے ہو؟" اس نے پوچھا اور چُپ ہو کر اپنے بھائی کو دیکھنے لگا۔
"اینڈرس، میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم بہت پریشان ہو۔ بارڈ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔
"تم جتنی تباہی میرے لیے چاہتے تھے وہ مجھے مل گئی ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ ورنہ شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں۔"
"اینڈرس، تم کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"
"بارڈ، چلے جاؤ۔ اللہ ہم دونوں پر رحم کرے!"
بارڈ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ "تم اگر گھڑی لینا چاہتے ہو تو لے سکتے ہو۔" اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔
"بارڈ، چلے جاؤ۔" اس کا بھائی چلایا۔
چناں چہ بارڈ مجبوراً چلا گیا۔
اس عرصے میں بارڈ کے ساتھ یہ ہوا کہ اس نے جوں ہی اپنے بھائی کی مصیبتوں کا حال سُنا تو اس کے دل میں تبدیلی رونما ہوئی۔ مگر خودداری کی وجہ سے وہ رُکا رہا۔ اس کے دل میں گرجا گھر جانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ گرجا گھر جا کر اس نے بہت سی دعائیں مانگیں اور قسم کھائی مگر اس میں اتنی طاقت نہ پیدا ہو سکی کہ وہ صحیح کام کر سکتا۔ وہ کئی بار اپنے بھائی کے گھر کی طرف گیا مگر ہر بار ایک نہ ایک بات ایسی ہو گئی کہ وہ آگے نہ جا سکا۔ لیکن ایک اتوار کو وہ سردی کے موسم میں گرجا گھر جو گیا تو وہاں اینڈرس بھی موجود تھا۔ بارڈ نے اسے دیکھا۔ وہ بہت کم زور اور دُبلا ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ عبادت کے دوران اینڈرس مسلسل پادری کو دیکھتا رہا۔ بارڈ کو وہ نہایت رحم دل اور شریف معلوم ہوا۔ اسے اپنے بچپن کے دن یاد آ گئے اور یہ بھی یاد آیا کہ اینڈرس نہایت نیک لڑکا تھا۔ اس دن بارڈ نے قسم کھائی

کہ وہ اپنے بھائی سے صلح کر لے گا چاہے اس سے کتنی ہی تکلیف ہو۔ اس نے اینڈرس کے قریب جانا چاہا مگر درمیان میں دوسرے لوگ آ گئے۔ گرجا گھر سے نکلنے کے بعد بھی وہ اینڈرس سے نہ مل سکا۔ اینڈرس کی بیوی اس کے ساتھ تھی۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ گھر جا کر اطمینان سے اس سے بات کرے۔

جب رات ہوگئی تو بارڈ روانہ ہوا۔ وہ دروازے تک پہنچ گیا۔ وہاں وہ رُکا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اسے اپنا نام سُنائی دیا۔ اینڈرس کی بیوی کہہ رہی تھی، "آج وہ گرجا گھر میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمھارے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

اینڈرس نے کہا، "نہیں، وہ میرے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔"

پھر بڑی دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ بارڈ کو کھڑے کھڑے پسینا آ گیا، حال آں کہ سردی کا موسم تھا۔ اندر بیوی نے کیتلی کو آگ پر رکھا۔ آگ کے جلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک بچہ کبھی کبھی رونے لگتا تھا۔ اینڈرس اس کا جھُولا جھُلا دیتا تھا۔ آخر بیوی بولی، "میرا خیال ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہتے ہو مگر تم اس کا اقرار نہیں کرتے۔"

"کچھ اور بات کرو۔" اینڈرس نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ باہر جانے کے لیے اُٹھا۔ بارڈ کو لکڑی کے سائبان میں چھُپ جانا پڑا۔ مگر اینڈرس بھی لکڑیاں لینے کے لیے وہاں آ گیا۔ بارڈ جہاں کھڑا تھا وہاں سے وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ اینڈرس نے اپنا پھٹا ہوا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ بارڈ کے پاس بھی اسی طرح کی فوجی وردی تھی۔ دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ اس وردی کو کبھی نہ پہنیں گے بلکہ اسے اپنے بچّوں کے لیے ترکے میں چھوڑ جائیں گے۔ اینڈرس کی وردی میں اب پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کا جسم چیتھڑوں میں لپٹا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اِدھر بارڈ کو اپنی جیب میں اس سونے کی گھڑی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

اینڈرس لکڑیاں اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا مگر جھکنے کے بجائے وہ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"یا اللہ ! یا اللہ !"

بارڈ جب تک زندہ رہا ان الفاظ کو نہ بھول سکا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر اس کا بھائی کھانسنے لگا۔ لہٰذا اس کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہوگیا۔ اینڈرس نے لکڑی کے چند ٹکڑے اُٹھا لیے اور وہ باہر جانے لگا تو بارڈ کے اتنے قریب سے گزرا کہ ٹہنیاں اس کے چہرے سے ٹکرا گئیں۔

وہ دس منٹ تک کھڑا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زمین میں اس کے پَیر دھنس گئے ہوں۔ نہ جانے وہ کب تک اسی طرح کھڑا رہتا اگر اسے کپکپی نہ ہونے لگتی۔ وہ کانپنے لگا۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس کو اپنی بزدلی کا یقین ہوگیا۔ لہٰذا اس نے ایک دوسری ترکیب سوچی۔ اس نے کوئلے کے چند ٹکڑے اُٹھا لیے اور کھلیان میں چلا گیا۔ وہاں مچان پر بیٹھ کر اس نے آگ جلائی اور مشعل کو لٹکانے کے لیے اس کیل کو تلاش کرنے لگا جس میں اینڈرس اپنی لالٹین لٹکایا کرتا تھا۔ بارڈ نے پھر اپنی سونے کی گھڑی نکالی اور اسے کیل پر لٹکا دیا۔ مشعل کو بجھا دیا اور چلا گیا۔ اس کو اتنا سکون حاصل ہوا کہ وہ بچّوں کی طرح برف پر دوڑنے لگا۔

دوسرے دن اس نے سُنا کہ رات کو کھلیان میں آگ لگ گئی۔ غالباً گھڑی لٹکاتے وقت اس کی مشعل کی چنگاریوں سے آگ لگ گئی۔ بارڈ پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ دن بھر اکیلا پڑا رہا۔ پھر دعاؤں کی کتاب لے کر پڑھنے لگا۔ لیکن شام کو وہ باہر چلا گیا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے گھر کی طرف چلا گیا اور جہاں رات کو آگ لگی تھی وہاں راکھ کو کھودنے لگا۔ اس کو وہاں پگھلا ہوا سونا مل گیا۔ سونے کی گھڑی کا یہ حشر ہوا۔

وہ اسی کو لیے ہوئے اپنے بھائی کے گھر گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ساری

باتیں بتادے اور صلح کرلے۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جو کچھ ہوا وہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔

ایک چھوٹی سی لڑکی نے اسے راکھ کو کھودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح چند لڑکے کسی جگہ محفلِ رقص میں شریک ہونے جارہے تھے انھوں نے اس کو اتوار کی شام اپنے بھائی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جہاں وہ رہتا تھا وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ پیر کے دن وہ عجیب وغریب حرکتیں کرتا رہا تھا اور چوں کہ سب کو یہ معلوم تھا کہ اس کے اور اس کے بھائی کے تعلقات کشیدہ ہیں اس لیے یہ تفصیلات حکّام کو بتادی گئیں اور تفتیش شروع ہوگئی۔ کوئی اس کا جُرم تو ثابت نہیں کرسکتا تھا مگر اس کی طرف سے ہر ایک کو شکوک پیدا ہوگئے۔ اب اس کے لیے اپنے بھائی کے پاس جانا اور بھی مشکل ہوگیا۔

جب کھلیان میں آگ لگی تو اینڈرس کو بارڈ کا خیال آیا، مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ دوسرے دن شام کو جب بارڈ اس کے گھر آیا تو اینڈرس سوچنے لگا کہ بارڈ کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی ہے مگر اتنے بڑے جُرم کو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد اینڈرس نے سُنا کہ لوگوں نے بارڈ کو اس کے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ حال آں کہ تفتیش کے دوران کوئی بات ثابت نہ ہوسکی پھر بھی اینڈرس کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کا بھائی مجرم ہے۔ تفتیش کے دوران دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اینڈرس کے کپڑے بالکل بوسیدہ تھے۔ بارڈ نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ اینڈرس کو یہ احساس ہوا کہ اس کے بھائی کی نظروں سے التجا ٹپک رہی ہے اور جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا اسے اپنے بھائی پر شک ہے تو وہ بڑے زور سے چلّایا، "نہیں!"

اس روز کے بعد اینڈرس دن رات نشہ کرنے لگا۔ چند ہی دنوں میں اس کی حالت خراب ہوگئی۔ ادھر بارڈ کی حالت اس سے بھی بدتر ہوگئی۔ وہ اس قدر بدل گیا کہ لوگوں کو اسے پہچاننے میں دشواری ہونے لگی۔ پھر

ایک دن شام کو ایک غریب عورت اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئی جس میں بارڈ کرائے پر رہ رہا تھا۔ اس عورت نے بارڈ سے چلنے کو کہا۔ وہ اس کے بھائی کی بیوی تھی۔ بارڈ سمجھ گیا۔ کپڑے بدل کر اس کے ساتھ چُپ چاپ روانہ ہو گیا۔ اینڈرس کے گھر کی مَدّھم مَدّھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دونوں اس روشنی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ بارڈ جب گھر میں داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ ایک بچّہ بیٹھا کو ٹلا کھا رہا تھا۔ پلنگ پر اینڈرس پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے اپنے بھائی کو گھورتا رہا۔ بارڈ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اینڈرس نے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ آخر اس نے اپنی بیوی سے باہر جانے کو کہا۔ بارڈ نے اسے ٹھیرنے کا اشارہ کیا۔ پھر دونوں بھائی ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ دونوں نے اپنے اپنے حالات بتائے۔ آخر میں بارڈ نے سونے کی وہ ڈلی نکالی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ باتوں سے پتا چلا کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔ اینڈرس نے زیادہ باتیں نہیں کہیں، کیوں کہ وہ بہت کم زور ہو چکا تھا۔ لیکن بارڈ برابر وہیں رہا۔ ایک دن صبح کے وقت اینڈرس نے کہا، ”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھائی! اب ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے جیسے پہلے رہا کرتے تھے۔“ لیکن اسی دن اینڈرس مر گیا۔

بیوہ اور بچّے کو بارڈ اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا رہا۔ رات کو دونوں بھائیوں میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ اس وادی کے تمام لوگوں کو معلوم ہو گئیں۔ بارڈ بعد میں بڑا باعزّت آدمی ہو گیا۔ ہر شخص اس کے غم سے متاثر ہوا اور بارڈ کو بھی لوگوں کی غم گساری سے بڑی تسلّی ملی۔ وہ ایک اچھا آدمی بن گیا اور دوسروں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر ایک اسکول کا ماسٹر ہو گیا۔ وہ برابر بچّوں کو محبّت اور ہمدردی کی تعلیم دیتا رہا اور خود بھی اسی پر عمل کرتا رہا۔ بچّے بھی اسی سے محبّت کرنے لگے۔

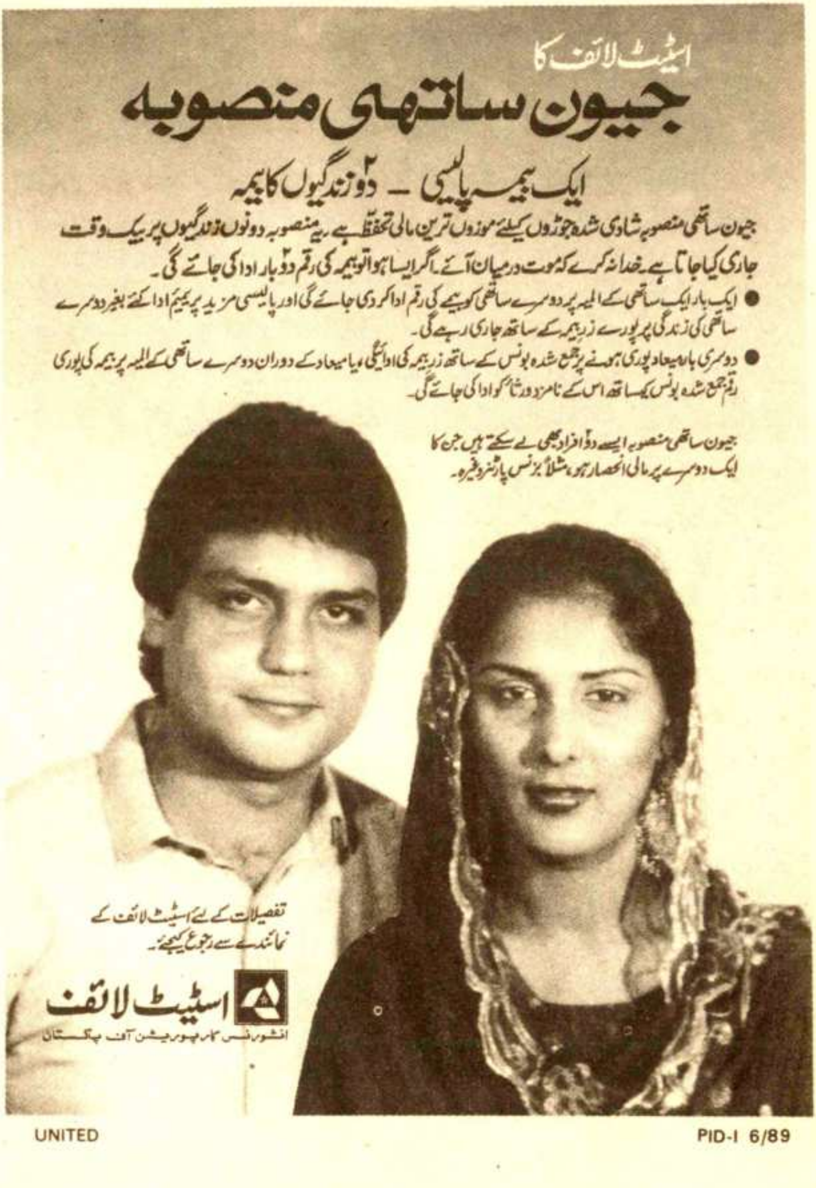

UNITED

PID-I 6/89

کیا کہنے

عنایت علی خاں

ابنڈے بینڈے شعر سُنائیں، کیا کہتے — اُوپر سے سَر بھی مٹکائیں کیا کہنے
گھر کا سارا کام کریں بچّے بالے — امّی ابّو پڑھتے جائیں کیا کہنے
جن کو چوکی دار بنایا ہو ہم نے — ہم سے پہلے وہ سو جائیں کیا کہنے
بالر گون پہن کر امپائر بن جائیں — اور امپائر بال کرائیں کیا کہنے
ہم کو تو بس مشکل مشکل کام بتائیں — اور خود بیٹھی چھولے کھائیں کیا کہنے
گارڈ تو ویٹنگ روم میں جاکر سو جائیں — اور مسافر ریل چلائیں کیا کہنے
ٹنکی میں بھروائیں ہوا اور پہیّوں میں — ڈیزل اور پٹرول ڈلائیں کیا کہتے
کھانا رکھ کر اپنی اپنی کرسی پر — میز کے اوپر بیٹھ کے کھائیں کیا کہنے
ٹافی میری چھین کے باجی کھا جائیں — اور مجھی پہ رعب جمائیں کیا کہنے
بچّوں کو تو ڈانٹ پلائیں امّی جی — خود کھانسی میں قُلفی کھائیں کیا کہنے
امّی بل بھرنے جائیں اور ابّو سے — بچّوں کے کپڑے دھلوائیں کیا کہنے
نقل میں پکڑے جاتے پر کچھ شرم نہ ہو — بلکہ اُلٹا شور مچائیں کیا کہنے
اپنے شعر عنایت صاحب پڑھوائیں — اور پھر خود ہی کہتے جائیں کیا کہتے

عیدِ قرباں اور گوشت

مشہور ماہرِ قلب ڈاکٹر سید اسلم (ایم بی بی ایس، ایف آر سی پی)
عیدِ قرباں کے حوالے سے ہماری غذا پر روشنی ڈالتے ہیں

آج سے نو سو سال پہلے مشہور سلجوقی حکمرانوں ملک شاہ اور سنجر (۱۱۵۷ء۔ ۱۰۷۲ء) کے زمانے میں ہرات میں مشہور طبیب، عالم، فلسفی، حکیم اسماعیل رہا کرتے تھے، جن کے علم کی شہرت دُور دُور تک تھی۔ ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے حکیم اسماعیل نے دیکھا کہ ایک نوجوان قسائی ہاتھ ڈال کر بکرے کی چربی نکالتا ہے، بھونتا ہے اور کھا جاتا ہے۔ حکیم اسماعیل نے یہ دیکھ کر سامنے والے دکان دار سے کہا:

"مجھے اس قسائی کی صحت کے بارے میں تشویش ہے کہ یہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بہرحال، جب بھی اس کا آخری وقت آئے مجھے ضرور اطلاع کر دینا۔ میرے معائنے کے بغیر اس کو دفن نہ کرنا۔"

اس واقعے کے چھے مہینے بعد کی بات ہے۔ اس نوجوان قسائی کے محلّے والوں نے اس خبر کو بڑی حیرت سے سُنا کہ رات کو وہ اچھا بھلا سویا اور صبح کو مُردہ پایا گیا۔ دُکان دار کو حکیم اسماعیل کی بات یاد تھی۔ وہ دوڑ کر ان کے گھر پہنچا اور ان کو اطلاع دی۔ حکیم اسماعیل پر بہ ظاہر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ وہ میرے اندازے سے زیادہ دن جیا۔ پھر حکیم اسماعیل اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے قسائی کے گھر پہنچے۔ انھوں نے مُردہ قسائی کا کفن ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا، نبض پر ہاتھ رکھا اور معائنے کے بعد حاضرین کو حکم دیا کہ اس کے پاؤں کی مالش کریں۔

اُن کی تشخیص تھی کہ یہ شخص مَرا نہیں، بلکہ فالج کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ تین دن انتہائی طبّی توجہ اور علاج کے بعد نوجوان قسائی کو ہوش آ گیا اور اس واقعے کے بعد وہ برسوں مفلوج حالات میں زندہ رہا۔ یہ واقعہ امریکا کے مشہور کثیر الاشاعت اور

وسیع الاثر طبی رسالے سے ماخوذ ہے۔ اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ حیوانی چربی اور دل کی بیماریوں اور فالج کا تعلق آج کی بات نہیں اور نہ مغرب کے اہلِ قلم نے اس کو دریافت کیا ہے بلکہ اس کا احساس اور شعور تو پُرانے زمانے سے ہے۔ گوشت خوری کے معاملے میں زمانہ ہمیشہ سے افراط و تفریط میں مُبتلا رہا ہے۔ مغرب کے لوگ تقریباً ہر جانور کو کھا جاتے ہیں مگر اب ردِّ عمل کے طور پر ہر قسم کی حیوانی غذا کے خلاف تحریکیں چل رہی ہیں اور وہاں یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ اپنی غذا میں گوشت کم کر دیں خصوصاً ان جانوروں کا گوشت کھانے کو منع کیا جارہا ہے جو بچّے دیتے ہیں۔ انڈے دینے والے جانوروں (مچھلی اور مُرغی) کے اس قدر خلاف نہیں ہیں۔

ہمارے مشرق میں دال خوروں کی آبادیاں ہیں جن کی تن درستی تاریخ کے کسی دور میں بھی معیاری نہیں رہی۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان گوشت خوری میں اعتدال چاہیے۔ باذوق لوگوں میں خالص چکنائی کبھی بھی پسند نہیں کی گئی۔ قورمے کے تار کے بجائے نیچے کا گاڑھا مسالا ہمیشہ لوگوں کو پسند رہا ہے۔ پُرانے زمانے کے حکیم بکری کا شوربا اور چوزے کی یخنی اسی لیے تجویز کرتے تھے کہ اس میں چکنائی کم ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ گائے کا بغیر چکنائی والا روکھا اور صاف گوشت تن درست آدمی کے لیے بکری کے گوشت سے بہتر ہے۔ اس لیے گائے کے گوشت کو صرف اس وجہ سے رَد نہیں کرنا چاہیے کہ یہ گوشت ہے، لیکن اعتدال ضروری ہے۔

ہمارے کھانے کے طریقوں میں ایک انقلاب آگیا ہے ورنہ پُرانے زمانے میں گوشت کے ساتھ سبزی پکا کر اس کو معتدل رکھتے تھے اور دن میں ایک وقت تیل میں پکی ہوی یا بگھاری ہوئی دال اور سبزی کھانے کا رواج تھا۔ اس زمانے میں گوشت صرف گوشت بلکہ کڑھائی گوشت مرغوب ہوتا جا رہا ہے۔ یہ تن درستی کے نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ ممکن ہے لوگوں کے مُنھ اس کو قبول کر لیں، مگر ان کی رگیں اس کو قبول نہیں کریں گی اور روغن سے اَٹ جائیں گی۔

اس زمانے میں قربانی ایک فرض کی بجا آوری سے زیادہ حیثیت اور امتیاز کا نشان

ہے۔ یہ بڑی ضروری بات ہے کہ قربانی کا گوشت با حیثیت لوگوں کو دینے کے بجائے ان لوگوں کو دیا جائے جن کو سارا سال گوشت نہیں ملتا۔" دست خود دہان خود" کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ دنیا میں بہت سی قومیں ایسی ہیں مثلاً افریقہ کے مسائی جن کی غذا صرف گوشت اور خون ہے، لیکن یہ لوگ دن میں تیس تیس میل چل لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر لمبی عمر کو نہیں پہنچتے، بلکہ جوانی میں ہی مر جاتے ہیں۔

پھولوں کی گھڑی

نیاگرا دُنیا کا مشہور ترین آبشار ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر کینیڈا اور امریکا کی حکومتوں نے مل کر ایک بجلی گھر بنایا ہے۔ اس بجلی گھر میں نیاگرا کے پانی کے تیز بہاؤ کے زور سے ڈائنیمو کے طریقے پر بڑے بڑے پنکھوں کو گردش دی جاتی ہے اور ان سے بجلی تیار کی جاتی ہے۔ امریکا اور کینیڈا کے اس مشترکہ بجلی گھر کے پاور اسٹیشن ۱ کے قریب چبوترے پر ایک بہت بڑی گھڑی بنائی گئی ہے۔ اس گھڑی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پورا ڈائل اور ہندسے مختلف رنگوں اور مختلف قسموں کے چوبیس ہزار پھولوں اور پودوں سے بنے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس گھڑی کے ہندسے اور ڈائل کا ڈیزائن ہر موسم میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اس عجیب و غریب گھڑی کی سوئیاں اسٹین لیس اسٹیل کی بنی ہوئی ہیں۔ اس گھڑی کے گھنٹے، منٹ اور سکینڈ کی سوئیوں کا کل وزن تیرہ من کے لگ بھگ ہے۔ یہ گھڑی وقت بھی بتاتی ہے اور وہ بھی بالکل ٹھیک۔

مرسلہ: ثمرین فاطمہ، کراچی

اخبار فروش کہتا ہے

میں ایک پاکستانی ہوں

مسعود احمد برکاتی

میں ایک پاکستانی اخبار فروش ہوں۔ مجھے ہاکر بھی کہا جاتا ہے۔ میں روزانہ صبح، بالکل صبح، مُنھ اندھیرے آپ کو تازہ اخبار پہنچاتا ہوں۔ میں بہت معمولی آدمی ہوں۔ اخبار کا بِل جو آپ ہر مہینے مجھے دیتے ہیں اس میں سے بہت تھوڑا سا حصّہ میرا ہوتا ہے، جس سے میں اپنا پیٹ پالتا ہوں اور اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں، لیکن میں خوش ہوں کہ میں اپنے پیارے پاکستان کے لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔

میں بہت صبح بلکہ صبح سے بھی پہلے اُٹھتا ہوں۔ جلدی جلدی تیار ہو کر گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ تیار ہونا تو میں نے یوں ہی لکھ دیا، تیاری کیا ہے۔ بس منھ ہاتھ دھو کر ناشتا کیے بغیر چل پڑتا ہوں۔ اتنی جلدی نہ ناشتے کا وقت ہوتا ہے اور نہ گھر کے لوگوں کو تکلیف دینا اچھا لگتا ہے۔ بس جناب، اپنی سائکل سنبھال کر سیدھا ڈپو پہنچتا ہوں۔ ڈپو اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مجھ جیسے بہت سے اخبار فروش جمع ہوتے ہیں اور وہاں اخبار کے دفتر سے ٹرکوں میں اخبار آتے ہیں۔ بڑے شہروں میں، جیسے کراچی اور لاہور میں کئی ڈپو ہوتے ہیں۔ وہاں سے اخبار لے کر ان کو تہ کر کے اور سائکل پر تھیلوں میں لٹکا کر میں چل پڑتا ہوں اور گھر گھر اخبار پہنچاتا ہوں تاکہ آپ صبح چائے پینے کے ساتھ پڑھ سکیں اور تازہ واقعات سے باخبر ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو سکیں۔

سردی ہو، گرمی ہو یا برسات، میں پروا نہیں کرتا، وقت پر گھر سے نکلتا ہوں اور وقت پر آپ کو اخبار پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ پاکستانی فرض شناس ہوتا ہے۔ بعض دنوں میں شہر یا علاقے میں کرفیو لگا ہوتا ہے اور گھر سے نکلنے کی ممانعت

ہوتی ہے، لیکن مجھے تو ہر حال میں اخبار پہنچانا ہوتا ہے، بلکہ کرفیو کے زمانے میں تو لوگ اور زیادہ بے چینی سے اخبار کا انتظار کرتے ہیں۔ کرفیو اسی وقت لگتا ہے جب حالات معمول کے مطابق نہ ہوں۔ گڑبڑ ہو۔ اس لیے جو لوگ اخبار عام دنوں میں نہیں پڑھتے وہ بھی ایسے زمانے میں اخبار پڑھنے لگتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں ابھی تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی ہے، پھر سب کے حالات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اخبار خرید سکیں۔ بہت سے لوگ تو دوسروں سے مانگ کر اخبار پڑھتے ہیں۔ اخبار کی قیمت بھی بہت ہو گئی ہے۔ ایک اخبار کی ماہانہ قیمت لگ بھگ اسّی رُپے ہوتی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ جب پاکستان بنا تھا تو ایک اخبار ڈیڑھ دو آنے کا ہوتا تھا اور مہینہ بھر میں تین چار رُپے کا بِل بنتا تھا۔

خیر صاحب، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ سرد برفانی ہوائیں اور کرفیو کی سختیاں بھی مجھے اپنا فرض ادا کرنے سے نہیں روک سکتیں۔ بعض وقت تو کرفیو کی خلاف ورزی کے الزام میں مجھے ڈانٹ بھی سُننا پڑی، حال آں کہ میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ کوئی اچھا

پاکستانی چاہے اس کا پیشہ کچھ بھی ہو، قانون کو توڑنا نہیں چاہتا۔ اخبار فروشوں پر بھی کرفیو میں گھر سے باہر نکلنے کی پابندی نہیں ہوتی اور بعض دوسرے سرکاری کارکنوں اور ملازموں کی طرح اُن پر بھی کرفیو کی پابندی نہیں ہوتی، لیکن بعض افسر غور نہیں کرتے یا اُن کو یقین نہیں آتا کہ میں ہاکر ہوں اور وہ مجھے سخت سُست کہتے ہیں۔ مجھے بعض وقت بُرا بھی لگتا ہے، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ غلطی کسی کی اور تکلیف کوئی اُٹھائے۔ اخبار خریدنے اور پڑھنے والوں کا کیا قصور ہے۔ ان کو اخبار پہنچنا چاہیے۔ اخبار پڑھ کر ہی وہ پاکستان اور دنیا کے حالات سے باخبر ہوں گے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اپنے ملک کے لوگوں کو خبریں اور اطلاعات پہنچانے کے ضروری اور اہم کام میں میرا بھی تھوڑا بہت حصّہ ہے۔

مسعود احمد برکاتی

صِحّت کی الف بے

کیا کوئی پھول کی خوش بُو اور رنگ جُدا کر سکتا ہے؟ جس طرح خوش بُو اور رنگ یک جا ہوتے ہیں اسی طرح کردار اور صحت بھی یک جان ہوتے ہیں جس طرح کردار کی بنیاد چند بنیادی صفات مثلاً سچائی دیانت وغیرہ پر قایم ہے۔ صحت کے اصول سادہ اور آسان ہیں، صرف انھیں ذہن نشین کرلنے اور اُن پر عمل کی ضرورت ہے۔ صحت کی الف بے میں صحت و تن درستی کی بنیادی باتیں آسان اور دل کش انداز میں پیش کی گئی ہیں بچّوں کے مشہور ادیب کے قلم سے۔

باتوں باتوں میں کام کی باتیں، بچّوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی مفید۔
جو شخص بھی یہ کتاب پڑھے گا وہ اپنی ایک قیمتی دَولت کی قدر اور حفاظت کر سکے گا۔

قیمت: ۵ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

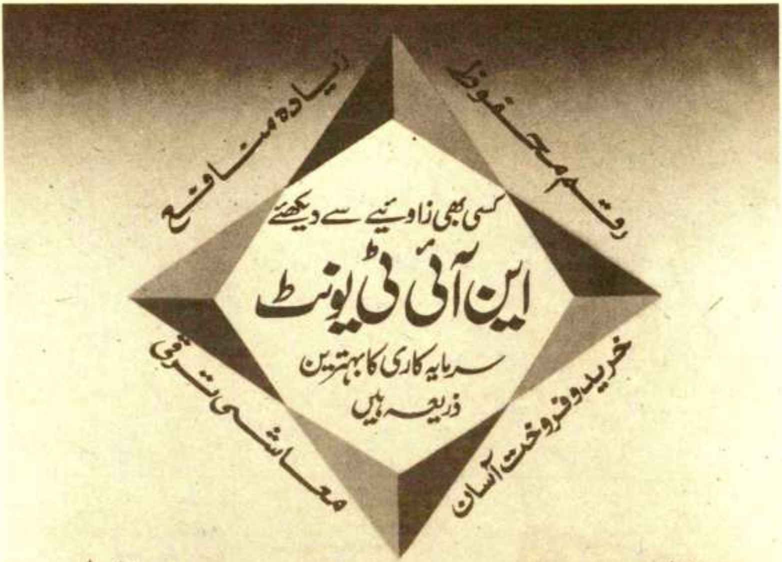

این آئی ٹی گذشتہ ۲۵ سال سے قومی بچت کو بروئے کار لاکر منتخب صنعتی اور تجارتی اداروں کے منافع میں این آئی ٹی میں سرمایہ کاری کرنے والوں کو شرکت کے بہترین مواقع مہیا کر رہا ہے۔

منافع برائے ۸۸-۱۹۸۷ء

۱۶۸۲ روپے فی یونٹ

اب تک تقسیم کیا جانے والا سب سے زیادہ منافع

این آئی ٹی یونٹ باآسانی خریدے اور بھنائے جا سکتے ہیں۔ سی آئی پی اسکیم کے تحت یونٹ خریداروں کو منافع کے بدلے مزید یونٹ رعایتی شرح پر حاصل کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں این آئی ٹی رجسٹرڈ یونٹوں میں لگائے ہوئے سرمائے پر قوانین کے مطابق انکم ٹیکس میں رعایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ این آئی ٹی یونٹ کا منافع (کمپنیوں کے علاوہ) تمام خریداروں کے لئے انکم ٹیکس سے مکمل طور پر مستثنیٰ ہے

این آئی ٹی بیئرر یونٹ

یہ باآسانی بغیر کسی کاغذی کارروائی کے خریدے اور بھنائے جا سکتے ہیں۔ رجسٹرڈ اور بیئرر یونٹوں پر ملنے والے منافع کی شرح یکساں ہے۔ منافع کی ادائیگی یونٹ سرٹیفکیٹ سے منسلک منافع کوپن پیش کرنے پر کی جاتی ہے۔

این آئی ٹی سرمایہ کاری کا قابل اعتماد ادارہ
نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

UNITED

PID-I-2-2/89

مُسکراتی تحریر

خوشی ٹیک خوشی نوٹیک

شوکت تھانوی کی ایک نایاب تحریر

لندن پہنچ کر ایک صاحب کو سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ عجیب تعلیم یافتہ جگہ ہے یہ بھی کہ یہاں کا بچّہ بچّہ فر فر انگریزی بولتا ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ بچّے مادر زاد گریجویٹ ہوتے ہیں۔ ان انگریزی بولنے والے بچّوں کو دیکھ کر ان صاحب کو بے حد شرم آئی کہ ہم سے اچھے تو یہ بچّے ہیں کہ ہم انگریزی کے "اے" کے نام "بی" بھی نہیں جانتے اور مُنھ اُٹھائے چلے آئے ہیں اس شہر میں جہاں دودھ پیتے بچّے انگریزی میں تُتلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ منھ میں زبان رکھتے ہوئے بھی گونگوں کی طرح اشاروں سے اپنا مفہوم سمجھانا پڑتا ہے۔ نہ کسی کی بات سمجھ سکتے ہیں نہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکتے ہیں۔ سُنی سُنائی انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اور بھی ہنسی اُڑتی ہے کہ کسی عورت سے "یس سر" کہہ دیا تو وہ چونک پڑی اور کسی مرد کو نہایت ادب سے "میڈم" کہہ دیا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "یس" کی جگہ "نو" اور "نو" کی جگہ "یس" کہہ رہے ہیں۔ خاموش فلموں کے زمانے کے اداکار بنے ہوئے ہیں، مگر آفت میں جان ہے۔ کہتے زمین کی ہیں اور سمجھی جاتی ہے آسمان کی بات۔ جانا چاہتے ہیں اوکسفرڈ اسٹریٹ اور ٹیکسی والا پہنچائے دیتا ہے ٹیوی اسٹاک اسکوائر میں۔ دُکاندار سے مانگ رہے ہیں تولیا اور وہ تھمائے دیتا ہے رومال۔ کھانے کو مانگ رہے ہیں مرغی اور فراہم کیا جارہا کیکڑا۔ نہ کسی سے کسی جگہ کا پتا پُوچھ سکتے ہیں نہ کسی کا بتایا ہوا پتا سمجھ سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ سب کچھ سُن کر جان بچانے کے لیے "یس سر" کہہ کر خود ہی سرگرداں رہیں۔

سُنا ہے کہ اسی قسم کے ایک منشی فاضل صاحب انگریزی کی دو تین ریڈریں پڑھ کر

انگلستان جا پہنچے اور وہاں پہنچ کر ان کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ جتنی انگریزی وہ جانتے ہیں وہ تو یہاں کے لیے اس قدر نا کافی ہے کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور اللہ جانے اپنے کو کس طرح ڈاکٹر تک پہنچایا، مگر اب ڈاکٹر کو اپنی تکلیف سمجھائیں تو کس طرح۔ خیال یہ تھا کہ ہمارے نبّاض طبیبوں کی طرح کے وہ ڈاکٹر بھی ہوں گے جو نبض دیکھتے ہی سب کچھ خود سمجھ لیتے ہیں اور مریض کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر وہاں ڈاکٹر اپنی زبان میں سوال کر بیٹھا کہ تم کو کیا شکایت ہے اور اب جو انھوں نے اُردو میں انگریزی بولنا شروع کی ہے تو ڈاکٹر بھی چکرا کر رہ گیا کہ اس مریض کو آخر کس مرض کی دوا دے۔ کہنے لگے، "سَر لاسٹ نائٹ ہیڈک اِن اسٹامک شروع ہوا، پھر فور آر فائیو ٹائمز چھینکیں کیم اور اس کے بعد خراش اِن تھروٹ محسوس ہوئی۔ آفٹر دیٹ لرزہ سے فی وَر ہو گیا"۔

ڈاکٹر کے پلّے جب کچھ نہ پڑا تو اس نے ان کو بہ مشکل سمجھایا کہ علاج کرانا ہے تو اپنے کسی انگریزی جاننے والے ہم وطن کو لے کر آؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ اختلاجِ قلب کی شکایت ہو اور مراق کی دوائیں تمھارے لیے تجویز کر دی جائیں۔

ایسے تو نہ جانے کتنے لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں جو ہوٹلوں میں مرغی مانگنے کے لیے انڈا دکھا کر سمجھاتے ہیں کہ "اس کی مُدَر چاہیے"۔ تصویر دکھا دکھا کر مطلوبہ اشیا دکانداروں سے طلب کرتے ہیں۔ آٹا درکار ہوتا ہے تو گیہوں دِکھا کر اپنے ہاتھ کو گردش دے کر کہتے ہیں کہ اس کا یُوں یُوں چاہیے۔ یہ انگریزی تقریباً اسی قسم کی ہوتی ہے جیسی ہمارے ہاں کے خوانچہ فروش انگریزوں کی عمل داری میں گوروں سے انگریزی بولا کرتے تھے کہ "صاحب یہ آرنج ون آنہ ملے گا خوشی ٹیک خوشی نو ٹیک"۔ مگر اس قسم کی انگریزی لندن میں بولنے والوں کو یہی جواب مِلتا ہے کہ "تم جو کچھ مانگ رہے ہو اس کو ہم اتنا ہی سمجھتے ہیں "خوشی ٹیک خوشی نو ٹیک"۔

یاد رکھیے!

صحت مند نونہال میں ہم صرف دس سال کی عمر تک کے بچّوں کی تصویریں شائع کرتے ہیں۔

دادی امّاں

شازیہ نور، لاہور

بہ قول دادی اماں ہم پوری گھوڑی ہونے کے باوجود کسی بچھڑی ادے نہیں، بلکہ کسی بچّی کا دماغ رکھتے ہیں۔ خیر رکھتے ہوں گے، رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ دادی جان کی باتیں تو ہم کڑوی گولی کی طرح آنکھیں بند کر کے حلق سے اُتار لیتے ہیں۔

اس میں ہمارا کیا قصور ہے کہ ہمیں نیند بہت آتی ہے۔ نیند ہمیں آتی ہے، ہم تو نیند کو نہیں آتے نا! رات گیارہ بجے جاسوسی ناول بند کر کے ہم نے زور دار جمائی لی اور بتّی بند کر کے بستر پر دراز ہو گئے۔ دادی جان تو نو بجے آکر ہی بتّی بند کر گئی تھیں اور ہم سو بھی گئے تھے مگر وہ سونا تو جھوٹ موٹ کا تھا۔ دادی جان کے جانے کے دس منٹ بعد ہی ہم نے بتّی دوبارہ جلائی اور ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ اب خواب میں ہم مجرم کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور مجرم ہاتھ آنے ہی والا تھا کہ اچانک کان سے کوئی چیز ٹکرائی۔ ہم نے سوچا کہ مجرم نے گولی چلائی ہے۔ ہم

نے بھی جلدی سے پستول نکالا اور مجرم کو گولی مار دی۔ اس طرح ہمارا یہ کارنامہ مکمل ہو گیا۔
اب ہم دوسرا خواب دیکھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ پھر وہی سنسناتی ہوئی چیز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ اس بار ہم اس چیز کو پہچان گئے۔ یہ تو دادی جان کی آواز تھی۔ ہم نے ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُسے باہر نکال دیا، کیوں کہ یہی تو وقت تھا سونے کا۔ اسی وقت تو بستر گرم ہوتا ہے۔ ہم نے لحاف کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اب ہمیں دادی جان کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"فجر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے اور تو ابھی تک نہیں اُٹھی؟" آواز تیز ہوتی گئی۔ "تبھی تو دن بھر چہرے پر پھٹکار برستی رہتی ہے۔ ہائے یہ لڑکیاں، نہ نماز کی نہ روزے کی۔ بستروں میں پڑی اینڈتی رہتی ہیں۔ ذرا ان پرندوں کو تو دیکھو۔ صبح صبح اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔ یہ انسان کی بچیاں ہو کر اللہ کے ذکر سے محروم رہتی ہیں۔ کیسی بد نصیبی ہے یہ!"

ہم نے لحاف کو کچھ اور لپیٹ لیا تاکہ دادی جان کی آواز ہمارا خواب درہم برہم نہ کرے، مگر دادی تو ہمارے سَر پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہمارا لحاف زور سے کھینچا۔ چُندھی ہوئی آنکھوں سے جب ہم نے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دادی جان غصّے میں بھری کھڑی ہیں۔ ہمارے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جلدی سے اُٹھ کر نماز پڑھی اور پھر دادی جان کی صلواتیں اس تسلسل سے شروع ہوئیں کہ اگر میر حسن زندہ ہوتے تو ہرگز اپنی مثنوی کے بارے میں نہ کہتے:

نہیں مثنوی ہے یہ پھلجڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

جوتیاں گھسیٹتے ہوئے ہم باورچی خانے میں داخل ہوئے۔ امی نے ناشتا تیار کر دیا تھا۔ ناشتا لا کر میز پر لگا دیا۔ ابھی تک ہماری آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ بس بیٹھے بیٹھے کرسی پر اونگھنے لگے۔

"اے لڑکی! سر پھر گیا ہے تیرا!" دادی جان کی آواز ہمیں ہوش میں لے آئی اور ہم نے جلدی سے اپنے سَر پر ہاتھ پھیرا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا سَر سیدھا تھا۔

"ناشتا کرو۔" وہ گرجیں۔ ہم نے جلدی سے ڈبل روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر افسوس ہماری نظریں دادی جان کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں اور ہمارا ہاتھ اسپرنگ کی طرح واپس آ گیا۔ دادی جان

بولیں، "تُو کب سمجھے گی، کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔"

"کھانے سے پہلے پڑھتے ہیں نا! ہم تو ناشتا کر رہے ہیں۔" ہم نے ہمیشہ کی طرح دل میں کہا۔ بھلا زبان میں اتنی قوت کہاں!

اسکول سے آکر ابھی گرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کے لیے ہم لیٹے ہی تھے کہ دادی جان سر پر سوار ہو گئیں۔ بہ قول ان کے ہم دو گھنٹے سے پڑے سو رہے ہیں۔ دادی جان کی آواز سُن کر اتنی سردی میں بھی ہمیں پسینا آگیا۔ ہمارا دل چاہا کہ پلنگ سمیت ہوا میں اُڑ جائیں، مگر ایسا ہوا نہیں۔ مجبوراً اُٹھ بیٹھے۔ اردگرد نظر ڈالی تو حیرت زدہ رہ گئے۔ واقعی اب تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ اب ہم کیا کریں۔ ہم نے تو پلک صرف جھپکی تھی اور دادی جان سمیت عصر کا وقت بھی سر پر آ گیا تھا۔

اس روز غضب ہی تو ہو گیا۔ مغرب کے وقت ہم سو گئے۔ دادی جان غصّے سے غُرّائیں، بجلی کی طرح چمکیں اور ہم پر ٹوٹ پڑیں، "ہائے کیا زمانہ آگیا ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور یہ صاحب زادی بستر پر پڑی خرّاٹے لے رہی ہیں۔ اس وقت سونا اچھا نہیں ہوتا۔ دماغ کم زور ہو جاتا ہے۔ سارا دن سوتی ہے۔ پھر بھی نیند پوری نہیں ہوتی دیوانی کی۔"

رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم اُٹھنے ہی والے تھے کہ دادی جان نے ایک اُنگلی کے اشارے سے ہمیں روک لیا۔ معلوم ہوا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کیے بغیر اُٹھ گئے ہیں۔ ہم نے جلدی سے کپکپاتے ہونٹوں اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا۔ خلافِ توقع آج دادی جان کا موڈ صحیح تھا۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔

اگلے روز پتا چلا کہ آج دادی جان تایا جان کے پاس کراچی جا رہی ہیں۔ ہمیں کچھ خوشی ہو رہی تھی کہ چلو اب آزادی سے سوئیں گے۔ مگر جب دادی جان چلی گئیں تو ہم خوب روئے۔ گھر میں اتنا سناٹا تھا کہ ہم گھبرا گئے۔ اپنے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کی، مگر یوں لگا کہ آج سونے کا مزہ نہیں آئے گا۔ نیند ہی نہ آئی۔ اگلے روز عین اذانوں کے وقت ہماری آنکھ کھل گئی۔ دادی جان کا خیال آیا اور ہم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نماز پڑھی، ناشتا کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ دن کے وقت تو نیند آنکھوں سے بالکل ہی اُڑ گئی۔ لاکھ کوشش کی مگر جناب یوں لگتا تھا کہ جیسے دادی جان ہماری نیند اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ پندرہ دن گزر گئے تھے دادی جان کو گئے ہوئے اور نیند ہم سے بھاگتی رہی۔ روزانہ خود بخود آنکھ کھل جاتی اور ہم وہ تمام احکام بجا لاتے جنھیں کروانے کے لیے پہلے دادی جان کو لمبی چوڑی تقریر کرنی پڑتی تھی۔

دادی جان اب بہت یاد آنے لگی تھیں۔ ہم نے فوراً ایک خط لکھ ڈالا، "دادی! آپ واپس آجائیں۔ اب ہمارا دل نہیں لگتا اور اب ہم روزانہ فجر کے وقت اُٹھتے ہیں۔ نماز بھی پڑھتے ہیں اور دن کے وقت تو ہمیں بالکل ہی نیند نہیں آتی۔"

دادی جان کو ہمارا خط ملا تو ان کی محبت نے جوش مارا اور وہ بہ قول تمام خاندان کے اپنی لاڈلی پوتی کے پاس آنے کو تیار ہو گئیں۔ دادی جان صبح ہی آگئیں۔ ہم ان کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔ دوپہر تک خوب باتیں ہوئیں۔ دادی جان ہمارے لیے جو تحفے لائی تھیں ہم نے بڑی خوشی سے قبول کیے۔ پھر ظہر کی نماز پڑھ کر کھانا کھا چکنے کے بعد ہم اپنے تحفوں کا جائزہ لیتے اپنے کمرے میں آئے اور اپنے بستر پر تحفے سجا کر بیٹھ گئے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا؟ ہوش اس وقت آیا جب حسبِ معمول دادی جان کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی:

"دونوں وقت مل رہے ہیں لڑکی! اور تو سوئی پڑی ہے۔ واہ کیا دعوے کیے تھے خط میں ..." دادی جان بول رہی تھیں مگر ہم لحاف میں منھ چھپا رہے تھے۔

ایک ادیبہ

نظم پارہ نظمی، شہدادپور

ملک کی سب سے نام ور ادیبہ کو ایوارڈ مل رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کاش میں بھی اتنی بڑی ہوتی اور مجھے بھی اِسی طرح ایوارڈ ملتا۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا، کبھی نہیں نہ میری اتنی معلومات تھی اور نہ مجھ میں اتنی صلاحیتیں تھیں۔

میں تصوّر میں اس ادیبہ کی جگہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی اور ابھی مجھے ایوارڈ ملنے ہی والا تھا کہ کسی نے میرا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ مُڑ کر دیکھا تو میری دوست سیما تھی۔ کہنے لگی، "کن سوچوں میں گم ہو؟" میں نے اُسے بتایا کہ میں ملک کی نام ور ادیبہ بننا چاہتی ہوں مگر مجھ میں اتنی صلاحیتیں نہیں ہیں اور نہ میں اتنی ذہین ہوں، لیکن میری دِلی خواہش ہے کہ مجھے اسی طرح شُہرت ملے اور داد ملے۔

سیما نے مجھے سمجھایا کہ ادیبہ بننے کے خواب چھوڑ دو۔ اس میں بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، گھر چلو۔ پھر اس موضوع پر باتیں کریں گے۔

گھر آکر میں یہی سوچتی رہی کہ سیما نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے اور اسی لیے میں بالکل افسردہ ہو گئی تھی۔ اتنے میں باجی آئیں اور انھوں نے پوچھا، "محفل کیسی رہی؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

باجی نے پھر پوچھا تو میں نے بے دلی سے دو تین باتیں بتا دیں۔ میرے اس رویّے کو دیکھ کر باجی حیران ہوئیں اور بولیں "کیا وہاں تمھاری پٹائی ہوئی ہے یا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے جو تم پھولی مرغی بنی ہوئی ہو؟" میں نے کہا "باجی! میں بھی ادیبہ بننا چاہتی ہوں۔" اس کے بعد اپنی دلی خواہش تفصیل سے انھیں بتا دی۔

باجی نے کہا "افسردہ کیوں ہوتی ہو؟ تم نے اپنے دل میں یہ کیسے سوچ لیا کہ تم لکھ نہیں سکتیں۔ کوشش کرو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔" باجی کے سمجھانے پر میں نے لکھنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوی اور غصّے میں آکر کاپی اور پنسل پھینک دی۔

باجی نے پوچھا کہ اب کیا ہوا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کہنے لگیں، "اچھی گڑیا! مجھ سے کیوں ناراض ہوتی ہو؟" میں نے کہا "باجی! میں کہانی لکھ ہی نہیں سکتی۔" باجی نے کہا "اچھا اگر کہانی نہیں لکھ سکتیں مگر تم شہرت بھی حاصل کرنا چاہتی ہو تو ضروری تو نہیں کہ تم ادیبہ ہی بنو۔ تم ڈاکٹر بھی بن سکتی ہو یا کچھ اور بن سکتی ہو۔"

"مگر میں تو ادیبہ بننا چاہتی ہوں۔" میں نے ضد کی۔ باجی نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا یہ بتاؤ تم جب کہانی لکھنے بیٹھیں تو تمھیں یقین تھا کہ تم کہانی لکھ لوگی؟" میں نے کہا "نہیں، مجھے تو بالکل یقین نہ تھا کہ میں کہانی لکھ لوں گی۔" باجی نے کہا، "جب تمھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں، یقین نہیں تو تم کوئی بھی کام کیسے کر لوگی؟ اچھا اب غصہ ٹھنڈا کرو اور یہ ٹافیاں کھاؤ۔" مجھے ان کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا، "میں بچّی تو نہیں کہ ٹافیوں سے بہل جاؤں۔"

"اچھا بچّی نہیں ہو تو کہانی لکھو اور پورے یقین کے ساتھ۔"

اب میں بھی کہانی لکھنے بیٹھ گئی۔ اب تو میری عزت کا سوال تھا اور یقین کا کرشمہ بھی دیکھنا تھا اور پھر واقعی میں نے کہانی لکھ لی۔ یقین کے عنوان سے جو کہانی میں نے لکھی تھی وہ باجی کو دکھائی۔ انھیں بہت پسند آئی اور انھوں نے مجھے خوب شاباش دی۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ تم کسی دن بڑی ادیبہ بن جاؤ گی۔ اس کے بعد میں نے ایک ایک کر کے کئی کہانیاں لکھ ڈالیں۔ پھر افسانے بھی لکھے اور آج میں اُس ادیبہ کی طرح خود بھی ایوارڈ حاصل کر رہی تھی جس نے مجھے ادیبہ بننے پر اُکسایا تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ میری منزل تک پہنچانے میں اس ادیبہ، یقین اور باجی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان تینوں کی وجہ سے ہی میں نے گوہرِ مقصود حاصل کر لیا ہے۔

نیا سبق

حیدر راحت

وقفے کی گھنٹی بجتے ہی سب بچّے اپنی اپنی کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ راشد نے بھی اپنی کتابیں اور کاپیاں اُٹھائیں اور باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے اسکول کے گیٹ کی طرف لپکا جہاں کریمو گول گپّے اور پکوڑوں کا خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ دو دن سے راشد نے گول گپّے نہیں کھائے تھے۔ ایک دن تو اس کی پھٹی جیب سے اٹھنّی گر گئی تھی اور دوسرے دن جیب خرچ ملا ہی نہیں تھا۔

آج اس کی جیب میں اٹھنّی تھی۔ کریمو کی دُکان پر پہنچ کر اس نے اپنی کتابیں اس کے خوانچے کے ایک خالی کونے پر رکھ دیں اور کریمو سے گول گپّے بنانے کو کہا۔ اس وقت کریمو کی دُکان پر بچّوں کی بہت بھیڑ تھی۔ کوئی گول گپّے مانگ رہا تھا، کوئی آلو چھولے اور کوئی پکوڑے۔ سب لڑکے اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے ہوئے تھے۔ اور کریمو ایک ایک کرکے سب کو دیتا جارہا تھا۔ راشد کے کئی بار مانگنے پر کریمو نے اسے پکوڑے تو دے دیے، لیکن چٹنی نہیں دی۔ راشد نے گول گپّے مانگے تھے، لیکن بھیڑ کی وجہ سے وہ پکوڑے کھانے کو تیار ہو گیا۔ وقفہ ختم ہونے والا تھا، اس لیے راشد نے کتابیں اُٹھالیں اور ایک بار پھر اس نے کریمو سے چٹنی مانگی۔ لیکن کریمو دوسرے بچّوں کو گول گپّے دے رہا تھا، اس لیے وہ راشد کی طرف دھیان نہ دے سکا۔

کریمو کو بچّوں کی بھیڑ میں گھرا دیکھ کر اچانک راشد کے ذہن میں ایک نئی بات بجلی کی طرح کوند گئی۔ کریمو کو دی جانے والی اٹھنّی اگر وہ بچالے تو؟ اتنی دیر میں کریمو کو کیا یاد رہے گا کہ اس نے پیسے دیے یا نہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ کریمو دوسرے بچّوں کو سودا دینے میں لگا ہوا ہے تو وہ چپکے سے کھسک گیا اور اپنی کلاس میں جاکر بیٹھ گیا۔ مفت میں پکوڑیاں کھانے اور اٹھنّی بچ جانے کی اسے بڑی خوشی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چھٹّی کے وقت باہر نکلتے ہوئے کریمو نے اس سے پیسے مانگے تو وہ کہہ دے گا کہ اس نے تو پیسے دے دیے تھے۔

آہستہ آہستہ سب بچّے کلاس میں آگئے۔ حساب کا پیریڈ تھا۔ ماسٹر صاحب بھی آپہنچے۔ انھوں نے لڑکوں سے حساب کے سوال حل کرنے کو کہا۔ راشد نے جب اپنی کتابیں دیکھیں تو اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ حساب کی کتاب کہیں گر گئی تھی۔ اس نے اچھی طرح دیکھی، لیکن اسے کتاب نہیں ملی۔ کلاس کے سارے لڑکے اپنی اپنی کتاب سے حساب کے سوال حل کر رہے تھے، مگر راشد سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں ماسٹر صاحب ٹہلتے ہوئے اس کے پاس آگئے۔ راشد کو خاموش بیٹھے دیکھ کر بولے، "حساب کی کتاب کہاں ہے؟ کام کیوں نہیں کر رہے ہو؟"

کتاب نہ ہونے پر راشد کو ڈانٹ کھانی پڑی۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وقفے میں اس نے اپنی کتابیں کریمو کے خوانچے پر رکھ دی تھیں۔ لیکن اب اُس سے پوچھنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی، کیوں کہ اس نے پکوڑوں کے پیسے نہیں دیے تھے۔

چھٹّی کے وقت جب وہ اپنے دوست انور سے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا تو کریمو نے اسے زور سے پُکارا، لیکن وہ اس کی آواز سن کر بچ کر نکلنے کی کوشش میں آگے بڑھتا گیا۔ آخر کریمو خود اس کے پاس پہنچ گیا اور بولا، "راشد، اپنی کتاب تو لیتے جاؤ۔ وقفے میں یہ میرے پاس ہی رہ گئی تھی۔" راشد نے کتاب کریمو کے ہاتھ سے لے لی۔ پیسے بچا لینے کی ذلیل حرکت پر اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ بڑی ہمّت کر کے اس نے جیب سے اٹھنّی نکال کر کریمو کو دیتے ہوئے کہا، "یہ لو کریمو چاچا! میں وقفے میں پکوڑوں کے پیسے دینا بھول گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں! میں سمجھا کہ شاید پیسے نہیں لائے ہو۔ پیسے تو کل یا پرسوں مجھے مل ہی جاتے، کہاں جاتے!" راشد کچھ نہیں بولا۔ ایمان داری کا اسے ایک نیا سبق ملا تھا۔ آج اس نے ہمیشہ کے لیے بے ایمانی سے توبہ کر لی تھی۔

انوکھی دُنیاؤں کی سیر

سیّد ندیم یوسف

وہ کمرا ہر طرف سے ایک جادوئی ڈبّے جیسا لگ رہا تھا۔ اندر کا منظر بہت ہی عجیب و غریب تھا۔ سب چیزیں بالکل بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ آپ کے ہاتھ سے قلم اچانک چھوٹ گیا لیکن وہ فرش پر بالکل نہیں گرا بلکہ آپ کے سامنے ہوا میں ہی ٹھیرا رہا۔ آپ خود کسی سہارے کے بغیر فرش اور چھت کے بیچوں بیچ ہوا میں معلق ہیں اور بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر تیر سکتے ہیں۔ آپ خود کو بہت ہی ہلکا پُھلکا محسوس کر رہے ہیں جیسے آپ کاغذ کے بنے ہوتے ہوں۔ آپ کی کرسی بھی ہوا میں اُلٹی لٹکی ہوئی ہے۔ کتابیں، کاپیاں سب نہایت آرام سے کمرے میں دائیں بائیں تیرتی پھر رہی ہیں۔ کوئی چیز بھی فرش پر نہیں گر رہی ہے۔ ایک طرف پانی کی بوتل ہوا

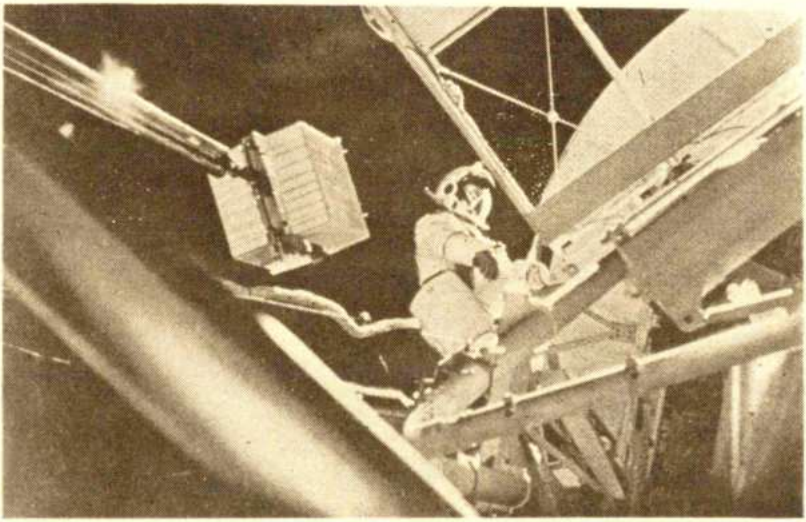

ضرورت پڑنے پر خلاباز اپنے جہاز سے نکل کر باہر خلا میں بھی کام کرتے ہیں

میں رُکی ہوئی نظر آتی ہے اور آپ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیتے ہیں۔ بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے لیکن آپ کو بوتل کا اپنا وزن بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اچانک ایک گلاس آہستہ آہستہ تیرتا ہوا ایک کونے سے نمودار ہوتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے آپ اس گلاس کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ اب آپ بڑے اطمینان سے بوتل کا منھ کھول کر پانی اُنڈیلتے ہیں۔ مگر یہ کیا؟ پانی کی دھار گلاس میں نہیں گرتی بلکہ پانی بوتل سے نکل کر مزے سے ہوا میں تیرتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔

کیا یہ کوئی حیرت انگیز اور مزے دار خواب ہے؟ کہیں آپ کسی طلسمی دنیا میں تو نہیں پہنچ گئے ہیں؟ آپ گھبرا کر کھڑکی کی طرف جاتے ہیں۔ شیشے کے اُس پار تاریک آسمان پر بہت سے ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں لیکن یہ رات کا وقت ہرگز نہیں ہے۔ ایک جانب سورج بھی تو بہت تیز روشنی کے ساتھ چمک رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ آسمان نیلا کیوں نہیں اور دن میں تارے کس طرح صاف نظر آرہے ہیں؟ آپ آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے دوسری کھڑکی کا رخ کرتے ہیں۔ نیچے زمین ایک بہت بڑے جغرافیائی نقشے کی طرح دور تک پھیلی ہوئی نظر آرہی ہے۔ پہاڑ، دریا، سرسبز وادیاں اور نیلے سمندر سب ایک ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔ اب سارا معاملہ آپ کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس وقت آپ زمین پر نہیں ہیں بلکہ اپنی دنیا سے سیکڑوں کلو میٹر اوپر خلا میں پہنچ گئے ہیں اور آپ کا خلائی جہاز ہزاروں کلو میٹر فی گھنٹے کی زبردست رفتار سے زمین کے گرد اپنے مدار میں چکّر لگا رہا ہے۔

خلا کیا ہے؟

ہماری زمین کے چاروں طرف اوکسی جن، نائٹروجن اور دوسری گیسوں پر مشتمل ہوا کا ایک بہت بڑا غلاف لپٹا ہوا ہے جسے ہوائی کرہ کہتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم بلندی کی طرف جاتے ہیں، ہوا کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اونچے پہاڑوں پر چڑھنے والے کوہ پیما اسی لیے اوکسی جن کے سلنڈر اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ پہاڑ تو بس چند کلو میٹر ہی اونچے ہوتے ہیں، لیکن اگر ہم زمین سے کئی سو کلو میٹر اوپر پہنچ جائیں تو وہاں پر ہوا

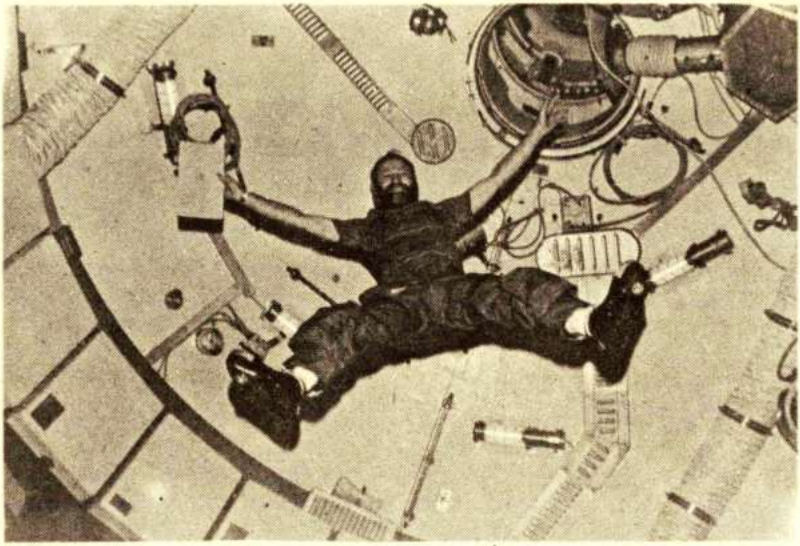

اسکائی لیب خلائی اسٹیشن میں ایک خلا باز بے وزنی کی حالت میں

بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ گیسوں کے چند سالمے (مالیکیول) اگر وہاں موجود بھی ہوں تو وہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور ہوتے ہیں۔ ایسی جگہ کو خلا (SPACE) کہتے ہیں، جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ہوا بھی نہیں ہوتی۔

زمین اور چاند کے درمیان کئی لاکھ کلو میٹر کی جگہ میں اور زمین اور سورج کے بیچ میں کروڑوں کلو میٹر تک بس خلا ہی ہے۔ تمام سیّارے اسی خلا میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ خلا میں کہیں کہیں پتھروں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بہت تیزی سے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ جب وہ زمین کی کشش کی وجہ سے ہوا کے غلاف میں تیزی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں تو زبردست رگڑ کی وجہ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ یوں ہمیں رات کے وقت آسمان پر اچانک روشنی کی ایک لکیر سی نظر آتی ہے۔ یہ شہاب ثاقب ہوتے ہیں۔ ہوائی کرہ ہمیں سورج سے آنے والی خطرناک بالائے بنفشی شعاعوں اور کائناتی شعاعوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ ایک خاص قدرتی پردہ ہے جس میں سے سورج کی زبردست توانائی چھن چھن کر زمین تک آتی ہے۔ یہ ہوا کا

غلاف ہی ہے جو سورج کی روشنی کو خاص انداز میں منتشر کر دیتا ہے جس کی بدولت دن کے وقت ہمیں آسمان نیلگوں اور خوب صورت لگتا ہے۔

خلا کی نئی باتیں

جب ہم ہوا کے اس غلاف سے باہر نکل کر خلا میں قدم رکھتے ہیں تو ہم ایک نرالی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں نہ ہوا ہے نہ پانی اور نہ کھڑے ہونے کی کوئی جگہ ہے۔ وہاں آپ ہر وقت تیز رفتاری سے حرکت کر رہے ہوتے ہیں ورنہ واپس زمین پر گر جائیں گے۔ خلا ہمیشہ سے سنسان اور خاموش ہے۔ وہاں آپ چاہے جتنی زور سے بولیں آپ کو خود اپنی ہی آواز سنائی نہیں دے گی، کیوں کہ آواز کی لہریں خلا میں سفر نہیں کر سکتیں۔ وہاں جا کر آپ اپنے آس پاس کا منظر زمین سے بالکل مختلف پائیں گے۔ خلا میں نہ دن ہوتے ہیں اور نہ رات آتی ہے۔ آسمان نیلا نہیں رہتا بلکہ سیاہ اور تاریک ہو جاتا ہے۔ سورج، چاند اور ستارے سب ایک ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ سورج اس طرح نہیں لگتا جیسا کہ زمین پر سے محسوس ہوتا ہے۔ وہاں سورج کی روشنی بہت ہی تیز ہوتی ہے اور اس کی چکا چوند ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے مگر پھر بھی ستارے ماند نہیں پڑتے بلکہ بہت بڑی تعداد میں سیاہ آسمان پر روشن نقطوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہاں ستارے چمکتے تو ہیں مگر جھلملاتے نہیں اور ان کی نوکیں بھی غائب ہو جاتی ہیں۔

خلا کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ وہاں گرمی اور سردی کا معاملہ ایسا نہیں جیسے کہ زمین پر ہوتا ہے۔ زمین کے گرد پھیلا ہوا ہوائی کرہ سورج کی شعاعوں کو بہت موزوں طریقے سے وصول کرتا ہے جس کی بدولت ہمارا سیارہ (زمین) توانائی سے مالا مال رہتا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ ہوا کے غلاف کے اندر جیسے جیسے ہم اونچائی کی طرف جاتے ہیں سردی بڑھنے لگتی ہے۔ بہت بلندی پر جا کر درجۂ حرارت صفر سے بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ خلا میں پہنچ کر کسی جسم کے جس حصے پر سورج کی

شعاعیں براہِ راست پڑ رہی ہوں وہ بہت گرم ہو سکتا ہے اور جس طرف سورج کی روشنی نہ پہنچ سکے وہ بہت ہی سرد ہو سکتا ہے۔

خلا کی سیر بہت ہی عجیب و غریب اور پُر لطف ہے مگر اس حیرت انگیز سفر پر جانے کے لیے زبردست تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ ہوا، پانی، غذا اور دوسری حفاظتی چیزیں سب کچھ یہیں سے لے جانا پڑتا ہے۔ پُر اسرار خلا میں چہل قدمی کے لیے خاص دباؤ والے خلائی سوٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ زمین کی عظیم کشش پر قابو پاکر انسان بردار خلائی جہاز کو راکٹ انجنوں کی مدد سے ہوائی کرے کو چیرتے ہوئے خلا میں لے جانا اور پھر بہ حفاظت زمین پر واپس لے آنا، جدید سائنس کا ایسا بے مثال کارنامہ ہے جو بیسویں صدی سے پہلے بالکل ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

خلا میں وزن صفر ہو جاتا ہے

خلا کی نرالی دنیا کی سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ ہم جس چیز کو بھی خلا میں لے جاتے ہیں وہ اپنا وزن کھو دیتی ہے اور اِدھر اُدھر تیرنے لگتی ہے۔ زمین پر ہر چیز کا اپنا وزن ہوتا ہے۔ ہم مختلف چیزیں اٹھا کر ان کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ زمین پر چلتے ہوئے ہمارا وزن ہمیشہ ایک ہی جیسا رہتا ہے۔ لیکن اگر آپ ایک لفٹ میں سوار ہوں جو تیزی سے اوپر جا رہی ہو تو آپ کا وزن ذرا سا بڑھ جائے گا اور ہلکی سی بے چینی محسوس ہونے لگے گی۔ اگر لفٹ تیزی سے نیچے آ رہی ہو تو آپ خود کو ذرا ہلکا پھلکا محسوس کریں گے، کیوں کہ وزن کم ہو جائے گا۔ اسی طرح جب کوئی شخص موت کے کنویں میں تیزی سے موٹر سائکل چلا رہا ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اس کا وزن تین چار گنا بڑھ جاتا ہے۔

دراصل وزن وہ قوّت ہے جس سے زمین کسی بھی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ کشش ثقل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ایک جگہ پر رُکی ہوئی ہو تو اس کا خاص وزن ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہی چیز اچانک کسی خاص سمت میں تیزی سے جانے لگے طبیعاتی قانون کے تحت اس چیز کے وزن میں کسی خاص سمت کی طرف جانے والی

رفتار بھی شامل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا وزن کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔
آج کل کے تیز رفتار لڑاکا طیارے جب تیزی سے ایک طرف کو مُڑتے ہیں یا تیزی سے غوطہ لگاتے ہیں تو پائلٹوں کو اپنے وزن میں بہت زیادہ تبدیلی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کبھی وہ خود کو بہت زیادہ بھاری محسوس کرتے ہیں اور کبھی بالکل بے وزن۔ اگر انھیں خاص تربیت نہ دی جائے تو ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جائے گا اور کچھ دیر تک ان کے حواس ٹھیک کام نہیں کر سکیں گے۔
جب ایک خلائی جہاز یا راکٹ بہت تیز رفتاری سے ساتھ زمین سے روانہ ہوتا ہے تو کچھ دیر کے لیے خلابازوں کا وزن کئی گنا بڑھ جاتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وزن میں اچانک تبدیلیوں کو برداشت کرنے کے لیے وہ خاص خلائی لباس پہنے ہوتے ہیں تاکہ جسم کے اندرونی اعضا پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ جب وہ خلا میں پہنچ جاتے ہیں اور خلائی جہاز زمین کے گرد اپنے مدار میں چکّر لگانے لگتا ہے تو انھیں ایک عجیب صورتِ حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ نہ وہ کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں نہ بستر پر لیٹ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرش پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ یوں لگتا ہے جیسے خلا باز اور اس کے آس پاس کی چیزوں کا کوئی وزن نہ ہو۔ یعنی خلا میں وزن صفر ہو جاتا ہے۔
ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خلا میں زمین کی کشش ختم ہو گئی ہے۔ کششِ ثقل ہر وقت خلائی جہاز پر عمل کرتی رہتی ہے لیکن جب خلائی جہاز تیزی سے زمین کے چاروں طرف گھوم رہا ہو تو اس کی تیز حرکت کی وجہ سے ایک اور خاص قوّت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ کششِ ثقل کے برابر ہو کر اس کا اثر ختم کر دیتی ہے اور خلائی جہاز بے وزن ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو یوں سمجھیے کہ جب ایک بار جہاز کو راکٹ کی مدد سے خلا میں اس کے مدار میں پہنچا دیا جائے تو پھر وہ اپنے انجنوں کی طاقت سے نہیں چل رہا ہوتا ہے بلکہ وہ تو مسلسل ایک خاص راستے پر گرتا رہتا ہے۔ چوں کہ زمین گول ہے اس لیے وہ سیدھا زمین پر نہیں گرتا بلکہ ایک خاص بلندی پر تیرتا رہتا ہے۔ خلائی جہاز کے بالکل آزادی سے ایک جانب گرتے رہنے کی وجہ سے اس کے اندر موجود

سب چیزیں اپنا وزن کھو دیتی ہیں اور اِدھر اُدھر معلّق ہو جاتی ہیں۔ یہ منظر بڑا دل چسپ اور عجیب وغریب ہوتا ہے۔

بے وزنی کے انوکھے اثرات

خلا میں بے وزنی کی وجہ سے آپ وہاں اس طرح سے نہیں رہ سکتے جیسے زمین پر رہتے ہیں۔ وہاں آپ چلنے پھرنے کے بجائے بس تیرتے ہیں۔ اب اوپر نیچے اور دائیں بائیں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ خلائی جہاز کے جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں آپ موجود ہیں وہاں کی چھت، فرش اور دیواروں کو پہچاننا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ پھر آپ جس طرف بھی منھ کرلیں، خواہ سیدھے رہیں یا اُلٹے ہو جائیں، سمت میں تبدیلی سے کوئی نیا احساس نہ ہو گا! ذرا سوچیے کہ پھر خلا میں رہتے ہوئے کھانا پینا کس طرح سے ہوتا ہے؟ آپ کُھلے منھ کے برتن میں کھانا نہیں لے سکتے۔ ادھر آپ نے کسی پیالے میں دودھ یا شوربے والی کوئی چیز ڈالنے کی کوشش کی اور وہ ہوا میں بہ گئی! وہاں نیم ٹھوس غذا کو مختلف پیکٹوں میں اور خانوں میں بند کرکے رکھا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر احتیاط سے کھایا جاتا ہے۔ بے وزنی کی کیفیت میں ہر کام میں ایک نیا مزہ ہے۔

اگر آپ کو کسی خلائی اسٹیشن میں کئی دن گزارنے کے لیے بھیج دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کھانے پینے کے علاوہ آپ کو آرام اور نیند کی بھی ضرورت ہوگی۔ لیکن خلا میں سونا بھی ایک عجیب کام ہے۔ آپ فرش پر بستر ڈال کر نہیں لیٹ سکتے ورنہ آپ بستر سمیت ہوا میں تیرتے نظر آئیں گے۔ زمین پر جب ہم سوتے ہیں تو ہمارا جسم بستر سے مَس ہوتا ہے اور ہمارے اعصاب دماغ کو اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ جسم کا ہر حصّہ بالکل محفوظ اور آرام وسکون کی حالت میں ہے۔ اس طرح ہمیں اچھی نیند آتی ہے، مگر خلا میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں آپ بستر پر اپنا وزن نہیں ڈال سکتے اور اِدھر اُدھر کروٹیں بدلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ خلا میں آرام کرنے کے بجائے کام کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ پھر بھی ایک خلاباز کو آرام کرنا ہی

پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آتی ہے، اسی طرح نیند تو خلا میں بھی آجاتی ہے۔ وہاں سونے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ کسی بھی کونے میں تیر کر جائیے اور خود کو کسی دیوار سے بیلٹ کے ذریعہ سے باندھ کر، آنکھیں بند کر کے آرام کیجیے۔ آج کل کی خلائی شٹل میں فرش پر خاص قسم کے سفری تھیلے یا سلیپنگ بیگ بندھے پڑے ہوتے ہیں اور خلا باز ان میں داخل ہو کر آرام کر لیتا ہے۔

بے وزنی کے چیلنج کا مقابلہ

ہم زمین پر ایک خاص ماحول میں رہتے ہیں۔ ہوا، پانی، غذا اور خاص درجۂ حرارت کی بدولت ہی ہمارا جسم اور دماغ ٹھیک ٹھیک کام کرتے ہیں، مگر خلا میں جا کر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ خلائی جہاز کے اندر ایک بند کمرے میں زمین ہی جیسا ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے۔ خاص دباؤ کے تحت ہوا بھر دی جاتی ہے اور اس کا درجۂ حرارت مناسب رکھا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بے وزنی کی کیفیت تو اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ اگر کسی انسان کو خاص تربیت کے بغیر ہی خلا میں بھیج دیا جائے تو اس عجیب و غریب صورتِ حال میں اس کا دماغ بالکل کام نہیں کرے گا۔ اس کے تمام حواس فوراً جواب دے جائیں گے اور وہ اُلٹی سیدھی اور بے ربط حرکتیں کرنے لگے گا۔

بے وزنی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے خلا بازوں کو بہت دِنوں تک زمین پر تربیت دی جاتی ہے۔ وہ تیز رفتار طیاروں میں سوار ہو کر غوطے لگاتے ہیں اور قلابازی کھاتے ہیں تاکہ وزن میں زبردست کمی بیشی کو برداشت کر سکیں۔ سائنس داں زمینی تجربہ گاہوں میں خاص طرز کے تیزی سے گھومنے والے کمروں میں خلا بازوں کی ہمت اور قوتِ برداشت کا کڑا امتحان لے کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ وزن میں اضافے یا کمی کو اچھی طرح برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اب تک جتنے بھی لوگوں پر بے وزنی کے تجربات کیے گئے ہیں ان میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں نے اس کیفیت کو بہت مزے دار پایا۔ مسلسل مشق، تجربے اور حوصلے سے انسان

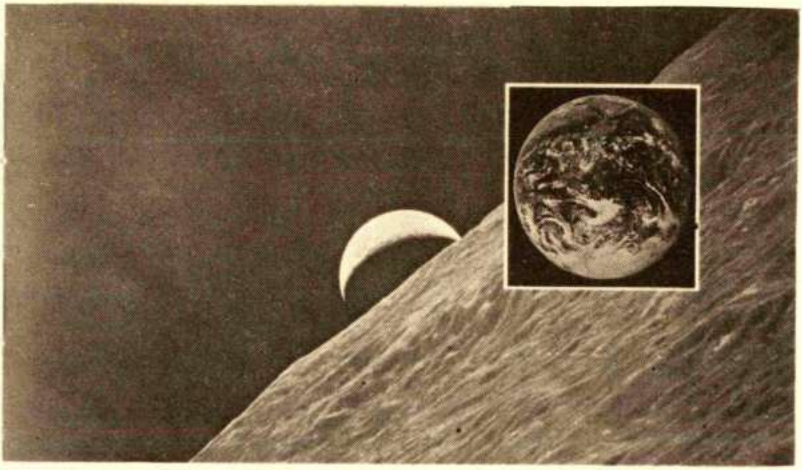

چاند پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے زمین خود ایک چاند کی طرح نظر آرہی ہے۔

جلد ہی ہر طرح کے ماحول کا عادی بن سکتا ہے۔

اس زبردست تربیت کے باوجود جو لوگ پہلی مرتبہ خلا میں جاتے ہیں انھیں سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ روانگی کے وقت جب وہ اچانک ہزاروں کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اوپر اُڑے جا رہے ہوں تو تھوڑی دیر تک وزن اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ خلا باز آواز تک نہیں نکال سکتا۔ پھر خلا میں پہنچ کر وزن صفر ہو جانے کے باعث انسانی جسم پر خاص اثرات پڑتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جسم کے سارے مائع اور خون وغیرہ سینے اور سر میں جمع ہو رہے ہیں۔ کمر میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ سر میں بھی کچھ بے چینی سی لگتی ہے۔ بے وزنی کے عالم میں آپ فرش پر کھڑے نہیں ہو سکتے اس لیے پیروں پر کوئی وزن نہیں پڑتا اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کے پیر بے کار ہو گئے ہوں۔ خون کی گردش کا نظام بدل جاتا ہے جس کی وجہ سے چہرہ بہت نمایاں اور پھیل جاتا ہے جب کہ کمر ذرا سکڑ جاتی ہے۔ بے وزنی جوڑوں اور عضلات پر بھی کچھ اثر ڈالتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے لچک دار مُہرے ذرا دور دور ہو جاتے ہیں اور خلا باز کو اپنا جسم دو انچ لمبا لگتا ہے۔ بعض

خلاباز یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ انھیں کوئی خلائی بیماری ہو گئی ہے۔

خلائی پرواز کے شروع شروع میں تو ان عجیب باتوں کی وجہ سے خلابازوں کو کچھ پریشانی ضرور ہوتی ہے لیکن دو دن گزارنے کے بعد وہ ان کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنے ماحول کا پورا پورا لطف اُٹھاتے ہیں۔ وہ خلائی جہاز کے اندر اِدھر اُدھر تیرتے ہوئے اپنا سارا کام انجام دیتے ہیں اور اہم سائنسی تجربات کرتے ہیں۔ نئے نئے تجربے کرنے کے لیے آج کل کے خلاباز اپنے جہاز سے باہر نکل کر بالکل اکیلے ہی خلا میں اِدھر اُدھر تیرتے ہوتے چہل قدمی بھی کر سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ سب خلاباز اپنے دورانِ خون کو درست رکھنے اور ہر وقت چاق چوبند رہنے کے لیے روزانہ خاص قسم کی ورزشیں بھی کرتے رہتے ہیں۔

خلاباز واپسی پر

خلاباز چند دنوں میں خلائی ماحول کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن آخر انھیں زمین پر واپس آنا ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز کے اُترتے وقت حفاظتی بیلٹ باندھ لی جاتی ہے اسی طرح خلاباز بھی واپسی پر خاص قسم کے "ضدِ کشش" لباس پہن لیتے ہیں، کیوں کہ زمینی کشش پر واپس آتے ہی اپنا وزن دوبارہ محسوس ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے خون کا دباؤ سر سے نیچے ٹانگوں کی جانب ہو جاتا ہے۔ اگر یہ خاص لباس نہ پہنا جائے تو دماغ کو خون ملنے میں عارضی خلل پڑ سکتا ہے اور خلاباز بے ہوش ہو سکتا ہے۔

زمین پر آکر بھی خلائی ماحول کا اثر ڈیڑھ دو دن تک رہتا ہے۔ اس کے بعد خلاباز آہستہ آہستہ زمینی کشش کے پھر سے عادی ہو جاتے ہیں۔ جتنے زیادہ دن آپ خلا میں رہیں گے آپ کو زمینی ماحول سے پوری مطابقت پیدا کرنے میں اتنی زیادہ دیر لگے گی۔ اگر آپ زمین پر آتے ہی عام لباس پہن کر چلنے پھرنے کی کوشش کریں گے تو آپ یقیناً گر جائیں گے، کیوں کہ اتنا عرصہ جو آپ نے خلا میں گزارا ہے اس میں آپ کے پیروں نے جسم کا ذرا بھی وزن نہیں سنبھالا تھا۔ شاید

آپ کو کچھ دیر تک پھر سے چلنا سیکھنا پڑے گا جیسے آپ نے بچپن میں پہلی مرتبہ سیکھا تھا۔ سب سے مزے دار بات یہ ہوگی کہ اگر آپ کو واپسی پر فوراً پانی کا گلاس پیش کیا جائے تو آپ پانی پی کر گلاس کو ہوا میں ہی ہاتھوں سے آزاد چھوڑ دیں گے جیسا کہ آپ خلائی جہاز میں کرتے ہیں لیکن آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ یہاں گلاس ہوا میں قائم نہیں رہتا بلکہ فرش پر تیزی سے گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔

ایک دن میں سولہ دن

یہ حقیقت ہے۔ اگر آپ زمین سے کئی سو کلو میٹر اوپر گردش کرنے والی کسی خلائی گاڑی میں موجود ہوں تو آپ صرف چوبیس گھنٹے میں سولہ مرتبہ طلوع آفتاب اور سولہ دفعہ غروب آفتاب کا منظر دیکھیں گے۔ آپ ہر ڈیڑھ گھنٹے میں زمین کا ایک چکر لگا رہے ہوں گے۔ آدھے چکر میں پینتالیس منٹ تک آپ زمین کے اس حصے کو دیکھ سکیں گے جو سورج کے سامنے روشن ہے اور جہاں دن ہے۔ اگلے پینتالیس منٹ آپ باقی آدھے حصے پر سے گزریں گے جہاں رات ہوگی۔ اس وقت سورج زمین کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور آپ ایک طرح سے "زمین گرہن" میں رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں زمین کے ایک کنارے سے سورج نکل آتا ہے اور آپ اسے دوسرے کنارے کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ آپ خود انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد سورج دوسری طرف جا کر پھر غائب ہو جائے گا۔ زمین اور سورج کا یہ دل چسپ کھیل آپ کے خلائی سفر کے دوران ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

اپنی دنیا کی تیز ترین سیر

ہم نظامِ شمسی کے ایک سیّارے زمین پر رہتے ہیں۔ ہماری دنیا بہت ہی خوب صورت ہے۔ سیاحت کے شوقین لوگ لاکھوں روپے خرچ کر کے دنیا کے کونے کونے کی سیر کرتے ہیں تاکہ وہ اس حیرت انگیز اور شان دار سیّارے کو پوری طرح دیکھ سکیں لیکن ہماری زمین کا ایک بہت ہی عظیم الشان منظر اور بھی ہے جسے اب

تک صرف ڈیڑھ سو کے قریب لوگ ہی دیکھ پاتے ہیں۔ خلائی سائنس اور ٹکنالوجی میں شان دار کام یابیوں کے بعد اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ آپ زمین سے ہزاروں کلومیٹر اوپر خلا میں جاکر اپنی آنکھوں سے پوری دنیا کا یادگار اور بے مثال نظارہ کر سکتے ہیں۔

ہم زمین پر کھڑے ہوکر اس کا بہت چھوٹا سا حصّہ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو نیچے آپ کو بہت سے علاقے ایک ساتھ نظر آئیں گے مگر خلائی جہاز کی بات ہی کچھ اور ہے۔ زمین سے کئی سو کلومیٹر اوپر خلا میں گردش کرتے ہوئے خلائی جہاز کے ذریعے سے آپ چند منٹوں میں کرۂ ارض کے بڑے بڑے علاقوں کی بھرپور اور تیز ترین سیر کر سکتے ہیں۔ بڑی بڑی وادیاں، سرسبز جنگلات، اونچے پہاڑ اور لمبے دریا، سب چیزیں بہت چھوٹی مگر صاف نظر آئیں گی۔ ضرورت پڑنے پر آپ دوربین کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ آپ بادلوں سے بہت ہی اوپر ہوں گے اور اپنے اس تیز ترین سفر کے دوران بڑے بڑے سمندروں، اونچے پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں اور جزیروں کے اوپر سے گزریں گے۔ جب آپ زمین کے اس حصّے پر سے گزریں گے جہاں رات ہے تو آپ شہروں میں جلنے والی روشنیوں کا خوب صورت نظارہ کر سکتے ہیں۔ زمین کا قطر بارہ ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے صرف چند سو کلومیٹر اوپر جاکر آپ کو پوری گول زمین دکھائی نہیں دے گی بلکہ کچھ چپٹی سی نظر آئے گی۔ پوری گول زمین دیکھنے کے لیے ہمیں خلا میں اپنی زمین سے ہزاروں کلومیٹر دور جانا پڑے گا۔

زمین سے بہت دور، زمین کا نظارہ

ہم خلا میں جتنا اوپر جائیں گے۔ زمین کا اتنا ہی زیادہ حصّہ بیک وقت دیکھ سکیں گے۔ چار سو کلومیٹر کی بلندی پر سے ہم اپنی دنیا کے سترہ فی صد رقبے کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر ساڑھے چھے ہزار کلومیٹر اوپر چلے جائیں تو کرۂ ارض کا تینتالیس فی صد حصّہ ایک ساتھ نظر آنے لگے۔ بلندی بڑھنے کے ساتھ ساتھ زاویۂ نظر بھی بڑھتا جاتا ہے۔

ہزاروں کلومیٹر دور ایک مقام ایسا بھی آئے گا جہاں سے زمین کا مکمل آدھا حصہ بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ اکیاون کروڑ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہماری اتنی بڑی دنیا خلا میں بہت دور جا کر دیکھنے پر نیلے، سفید اور سبزی مائل رنگ کی ایک بہت خوب صورت گیند کی طرح نظر آتی ہے۔ وہاں سے بالکل صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ زمین گول ہے اس کے تین چوتھائی حصے پر سمندر پھیلے ہوئے ہیں جس کے باعث یہ نیلگوں دکھائی دیتی ہے۔ نیلے رنگ کے اس سیّارے کو جا بجا سفید بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ خشکی کے ٹکڑے، برفانی علاقے اور براعظم بھی پہچانے جاتے ہیں۔

ذرا تصوّر کیجیے کہ آپ خلا میں ہزاروں کلومیٹر دور ایک خاص مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اپنے سیّارے کے بارے میں جتنی باتیں آپ نے سائنس کی کتابوں میں پڑھی تھیں وہ سب یہاں سے کھلی آنکھوں سے نظر آ رہی ہیں۔ ہماری زمین بھی سورج کی روشنی کو منعکس کرتی ہے اور اسی وجہ سے خلا سے دیکھنے پر خوب چمک دار لگتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ پوری گول گیند ہی نظر آئے۔ زمین کا صرف وہی حصہ نظر آتا ہے جو سورج کے سامنے روشن ہو۔ بہت دل چسپ بات یہ ہے کہ اگر آپ خلا میں اسی مقام پر کئی گھنٹوں تک رُکے رہیں تو آپ یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ زمین اپنے محور پر آہستہ آہستہ مغرب سے مشرق کی طرف گردش کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوب صورت گیند ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹے کی زبردست رفتار سے سورج کے گِرد اپنے مدار پر بھی رواں دواں ہے۔ لیکن آپ زمین کی یہ حرکت محسوس نہیں کر سکتے، کیوں کہ آپ کا خلائی جہاز بلکہ کوئی بھی شے خلا میں کہیں کسی خاص مقام پر بالکل ساکن نہیں رہ سکتی۔ ورنہ زمین، چاند، سورج یا کسی اور سیّارے کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔ آپ کا خلائی جہاز مسلسل حرکت میں ہے اور زمین کے گِرد گھوم رہا ہے۔ یوں آپ کو زمین کی محوری گردش یا سورج کے گرد اس کے سالانہ سفر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، کیوں کہ زمین کے ساتھ ساتھ آپ خود بھی تو مسلسل حرکت میں ہیں۔

جب ایک خلا باز زمین کے گرد اپنے پہلے ہی چکّر میں اپنے ملک اور اپنے علاقوں

پر سے گزرتا ہے تو اسے بہت سے خوشی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھی خلابازوں سے کہتا ہے،

"دیکھو، وہ رہا میرا ملک!"

دن کا وقت ہو تو وہ اپنے وطن کے چپّے چپّے پر غور کرتا ہے اور رات کو اپنے علاقوں کی روشنیاں دیکھ کر لطف اٹھاتا ہے۔ مگر جب دو تین روز گزر جاتے ہیں اور خلاباز زمین کے تیس چالیس چکّر لگا لیتا ہے تو اس کی توجہ بس برّاعظموں تک رہ جاتی ہے۔ پانچ چھے دن بعد وہ ذہنی طور پر برّاعظموں کو بھی فراموش کر دیتا ہے اور پھر سب خلاباز مل کر کہتے ہیں:

"وہ دیکھو ہماری زمین، کتنی خوب صورت گیند کی طرح لگ رہی ہے!"

ہماری دنیا سیاسی طور پر تو ملکوں اور ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے مگر جغرافیائی ماحول کے لحاظ سے تمام حصے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ زمین کو بہت بلندی سے دیکھنے پر تمام ملکوں کی سرحدیں گم ہو جاتی ہیں۔ تمام چھوٹی چھوٹی علاقائی اور قومی حد بندیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ خلا میں جا کر آپ ایک جگہ سے پوری دنیا کو دیکھ سکتے ہیں اور ہر جگہ کے لوگوں سے باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ پھر یقیناً آپ کو دنیا بھر کے جھگڑے اور ملکوں کے درمیان لڑائیاں بہت ہی عجیب سی لگیں گی، کیوں کہ وہاں سے تو زمین ایک اکائی، ایک گھر کی طرح نظر آتی ہے۔ خلا سے امن کا بے مثال پیغام ملتا ہے جسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

آئیے دعا کریں کہ آنے والے دور میں تمام دنیا کے لوگ کم از کم ایک مقصد کے لیے ضرور متحد ہو جائیں اور وہ عظیم مقصد ہے:

"خلا تک رسائی، بنی نوعِ انسان کے فائدے کے لیے۔"

اخبار نونہال کے لیے خبریں اور معلومات بھیجنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خبر یا معلومات جس اخبار یا رسالے وغیرہ سے لیتے ہیں اس کا تراشہ یا کم سے کم اخبار یا رسالے کا نام اور تاریخ ضرور لکھیں۔ بعض نونہال من گھڑت یا غیر معتبر خبریں بنا کر بھیج دیتے ہیں جو شائع نہیں کی جا سکتیں۔

طب کی روشنی میں

حکیم محمد سعید

منھ پر دانے

س: عمر تیرہ سال ہے۔ میرا رنگ کچھ دنوں سے تیزی کے ساتھ کالا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ منھ پر چھوٹے بڑے دانے بھی نکل آتے ہیں جن پر ہاتھ لگانے سے جلن محسوس ہوتی ہے۔ آصفہ شمیم قریشی، کراچی

ج: کالے، اللہ میاں کے پیارے! ہم نے تو بزرگوں سے اپنے بچپن میں ایسا ہی سنا ہے۔ کالا پن کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔ افریقہ میں تو یہ حسن مانا جاتا ہے۔ انگلستان وغیرہ کے لوگ دھوپ میں بیٹھ کر خود کو براؤن بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ افریقی کالے خود کو گورا کرنے کی کوشش کرتے ہوں! خیر بھئی، تم ایسا کرو کہ گل منڈی منگوالو۔ ۶ گرام گل منڈی رات کو گرم پانی میں بھگو دیا کرو۔ صبح اسے مَل چھان لو اور پی جاؤ۔ ۱۵-۲۰ دن تک پیتی رہو۔ اس سے فائدہ ہو جائے گا۔

آنکھوں کا رنگ پیلا

س: عمر ۱۶ سال ہے۔ میرے چہرے پر بے شمار چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے ہیں اور آنکھوں کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا ہے۔ محمد طارق علی، کراچی

ج: آپ کو چاہیے کہ اپنے معدے اور آنتوں پر توجہ کریں۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں آنتوں میں سڑے ہوئے فضلات چہرے کو بے رونق کر دیتے ہیں۔ قبض رہنا اچھا نہیں ہے۔ مگر قبض کو قبض کشا دواؤں سے دور کرنا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ بغیر

چھنا آٹا کھانا چاہیے۔ سبزیاں اور ترکاریاں زیادہ کھانی چاہییں۔ جو لوگ خواہ مخواہ روز گوشت کھاتے رہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ہفتے میں دو بار گوشت کو انسانی ضرورت کے لیے کافی سمجھنا چاہیے۔ آپ رات کو گل منڈی ۶ گرام گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح اسے مَل چھان کر پینا شروع کر دیجیے۔ اس سے آنتیں بھی صاف رہیں گی خون بھی صاف ہو جائے گا۔ اور چہرہ بھی نکھر آئے گا۔

سر میں درد

س: عمر ۱۲ سال ہے۔ پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میرے سر میں دن میں ایک بار ضرور درد ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر اسکول بھی نہیں جا سکتا۔
رمضان احمد مغل، جھڈو

ج: بات واضح نہیں ہے۔ میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ آپ کو کسی اچھے مقامی معالج سے مشورہ کرنا چاہیے۔

دل میں درد

س: میں چھٹی کلاس میں پڑھتی ہوں۔ میرے دل میں اکثر درد رہتا ہے۔ کوئی ایسی دوا تجویز فرما دیجیے جس سے درد دور ہو جائے۔ رفیعہ سلطانہ

ج: یہ تو بڑا ٹیڑھا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ مناسب ہے کہ کسی اچھے معالج سے مشورہ کریں تاکہ پہلے یہ طے ہو جائے کہ درد واقعی دل میں ہوتا ہے۔ اگر دل ہی میں تکلیف ہے تو ہو سکتا ہے کہ بچپن میں موتی جھرا (ٹائیفائڈ) ہوا ہو اور وہ بگڑ گیا ہو۔ اس سے دل متاثر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جوڑوں میں درد کی کیفیت ہو، گلے خراب ہوں، اس سے بھی دل کے عضلات سخت متاثر ہوتے ہیں۔

چہرے پر دانے

س: عمر ۱۸ سال ہے۔ میرے چہرے پر ۸ ماہ سے دانے ہو رہے ہیں۔ مہینے میں

۲-۳ دن کم ہو جاتے ہیں لیکن لال چھوٹے دانے پھر بھی رہتے ہیں۔

محمد اسلم عادل شہزاد، کراچی

ج: اکثر و بیشتر صورتوں میں عمر کے اس حصے میں ہارمونی نظام میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اور چہرے پر دانے یا مہاسے نکل آتے ہیں۔ اس کے لیے لعابات پر توجہ کرنی چاہیے جو جسم کے انزائم کے نظام کو متاثر کرتے ہیں۔

نیم گرم پانی میں بہدانہ ۶ گرام ڈال کر چمچے سے خوب ملائیے۔ پانی میں لعاب اس کا آجائے گا۔ یہ لعاب صبح کو پینا چاہیے۔ اس سے دانے، مہاسے ختم ہو سکتے ہیں۔ رات سوتے وقت حسبِ ضرورت صافی دو چمچے پی سکتے ہیں۔

ہاتھ پاؤں میں درد

س: میری خالہ کی عمر ۳۵ سال ہے ان کے ہاتھ پاؤں جلتے ہیں۔ سردی میں یہ تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے۔

عابدہ عبدالقادر بلوچ، کراچی

ج: احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ محترمہ خالہ صاحبہ اپنا پیشاب اور خون ٹیسٹ کرالیں۔ ہو سکتا ہے کہ شکر کا توازن بگڑ گیا ہو۔ اس وجہ سے بھی ہاتھ پیر جلتے ہیں۔ اگر ایسی صورت نہیں ہے تو پھر جگر کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ پہلی بات تو یہ کہ غذا میں گوشت کا استعمال کم سے کم کر دیں۔ گائے کے گوشت سے مکمل پرہیز کریں۔ ایک انسان کو ہفتے میں ایک دو بار سے زیادہ گوشت کی ضرورت نہیں۔ پراٹھے اور حلوائیوں کی مٹھائیاں چھوڑ دیں۔ سادہ غذا اور زیادہ تر سبزیاں کھائیں۔ دوا کے طور پر سونف، پودینہ تازہ ۲-۶ گرام پانی میں جوش دے کر صبح اور رات کئی دن پی لیں۔

> طبِ کی روشنی میں نونہال ایسے سوال بھی بھیج دیتے ہیں جن کے جواب رسالے میں شائع نہیں کیے جاسکتے۔ ایسے سوالوں کے جوابات ڈاک کے ذریعہ سے دیے جاتے ہیں مگر اکثر نونہال اپنا پتا نہیں لکھتے، چاہے آپ اپنا جواب ڈاک کے ذریعہ سے چاہتے ہوں یا رسالے میں شائع کرانا چاہتے ہوں۔ دونوں صورتوں میں پتا لکھنا ضروری ہے۔

موسمِ بہار
نئی اُمیدوں کی نوید دیتا ہے

اَب کے موسمِ بہار ہم وطنوں کی بے پایاں اُمنگوں
اور ارادوں کے اظہار کا وسیلہ بنا ہے۔
نیشنل بینک آف پاکستان نے قومی ترقی
میں ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

ہیڈ آفس: آئی آئی چندریگر روڈ کراچی، پاکستان
ٹیلیفون: ۲۴۱۶۷۸۰-۱۰ لائنز۔ ۲۴۱۴۰۴۱-۵ لائنز۔
ٹیلیکس: ۲۳۷۲۳-۲۳۷۳۳-۸۰۹۷-۲۷۳۴ این بی پی-پی کے
ٹیلی فیکس: ۹۲-۹۱-۲۴۱۶۷۶۹ ہیڈ آفس کراچی۔

UNITED

PID-I-8/89

چھُٹّی کی گھنٹی

فیض لودھیانوی

مرحبا چھُٹّی کی گھنٹی مرحبا
کس قدر مرغُوب ہے تیری صدا

ہم نے اکثر مختلف باجے سُنے
تیرا سُر وہ ہے کہ دنیا سَر دُھنے

تیری ٹن ٹن میں ہے وہ جادو بھرا
ذرّہ ذرّہ مست ہے اسکول کا

صبح کی گھنٹی بھی بجتی ہے مگر
خاک ہوتا ہے طبیعت پر اثر

وہ سدا گھر سے بُلاتی ہے ہمیں
تُو سدا چھُٹی دِلاتی ہے ہمیں

اُس کے سنتے ہی نکل جاتی ہے جان
تیرے سُنتے ہی سنبھل جاتی ہے جان

اُس کا بجنا ہے پڑھائی کا پیام
تیرا بجنا ہے رہائی کا پیام

صبح کی گھنٹی سے ڈرتے ہیں سبھی
تجھ کو سُن کر وجد کرتے ہیں سبھی

کر رہے ہیں کان کب سے انتظار
تیرے نغموں کے لیے ہیں بے قرار

جلد بج جائے تو ہو اتنی خوشی
پاس ہو کر بھی نہ ہوتی ہو کبھی

دیکھنے میں دھات کا ٹکڑا ہے تُو
اپنے حق میں چاند سا مکھڑا ہے تُو

اور کوئی ساز تجھ جیسا نہیں
ریڈیو کچھ بھی سہی ایسا نہیں

آج ہم پر یہ حقیقت کُھل گئی
کیوں غلامی سے ہے آزادی بھلی

فیض کو بچپن کی فطرت یاد ہے
ننھے بچّوں کی مسرّت یاد ہے

میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں

روٴف پاریکھ

میری عمر چھے ماہ ہے۔ میرا نام ماں باپ نے اللہ جانے کیا رکھا ہے۔ شاید خود ان کو بھی یاد نہ ہو، کیوں کہ سب لوگ مجھے عجیب عجیب ناموں سے پکارتے ہیں۔ کوئی ببلو کہتا ہے، کوئی پپو اور کوئی گُڈو تو کوئی لڈو۔ اللہ جانے ان بڑوں کو نام بگاڑنے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح پیار کا اظہار ہوتا ہے۔ عجیب وغریب ناموں سے پُکارنے کے علاوہ یہ بڑے میرے سامنے اُلٹی سیدھی حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ کبھی کوئی بزرگ گال پُھلا کر اور بھویں اُچکا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کوئی صاحب کُتے بلیوں کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کچھ حضرات مجھے بہلانے کے لیے اُچھل کود سے بھی باز نہیں آتے۔ ایک حضرت نے تو ایک دفعہ حد ہی کر دی۔ مجھے روتا ہوا پا کر وہ سر کے بَل کھڑے ہو گئے۔ مجھے ان کی اس اوٹ پٹانگ حرکت پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اُدھر وہ حضرت بہت

خوش ہوئے کہ دیکھا میں نے روتے بچّے کو چُپ کرا دیا۔ وہ کئی روز تک اپنے دوستوں میں اس بات کا چرچا کرتے رہے۔ کچھ بڑے ہم چھوٹے بچّوں کو چھوٹ مُوٹ توتلی زبان میں "پالا پالا بتا" یعنی پیارا پیارا بچّہ کہہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ چھوٹے بچّوں کو اس پر ہنسی آتی ہو، لیکن میں اس پر بہت حیران ہوتا ہوں کہ ایک سمجھ دار اور معقول آدمی کو جان بوجھ کر توتلا بننے کی کیا ضرورت ہے؟ لاحول ولا قوّۃ۔

میں تو دن رات ان بڑوں کے تماشے دیکھتا ہوں اور اپنا سر پیٹتا ہوں کہ اتنے بڑے ہو گئے مگر رہے وہی گھامڑ کے گھامڑ۔ ایسے لوگوں میں ہمارے بھائی جان قبلہ خاص طور پر شامل ہیں۔ موصوف خیر سے پانچ سال کے ہیں۔ اونٹ جتنے لمبے ہو گئے ہیں مگر حرکتیں وہی بچّوں والی ہیں۔ میری تو جان جل جاتی ہے کہ یا اللہ! ان کو کب تمیز آئے گی۔

مثال کے طور پر کل کا ذکر ہے کہ یوں ہی لیٹے لیٹے میرا دل ذرا رونے کو چاہا۔ ہاں صاحب، آخر میں بھی انسان ہوں۔ میرا دل بھی رونے کو چاہتا ہے۔ لیٹے لیٹے تھک جاتا ہوں۔ پڑے پڑے بور ہو رہا تھا۔ ان لوگوں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اخبار یا رسالہ ہی مجھے تھما دیں۔ دو گھڑی تصویریں دیکھوں گا تو جی بہلا رہے گا۔ لیکن خیر۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ خوب یاد آیا۔ لیٹے لیٹے تھک گیا تو رونے کو جی چاہا۔ چناں چہ میں نے پنگھوڑے میں لیٹے لیٹے ہلکے سُروں میں غوں غاں شروع کی۔ میرا خیال تھا کہ گھر میں اتنے لوگ ہیں کوئی نہ کوئی توجہ کرے گا، لیکن کسی نے دھیان نہ دیا۔ اب مجھے ذرا بے چینی ہونے لگی۔ میں نے اپنی آواز ذرا اونچی کر دی اور اس میں ہلکی ہلکی چیخیں شامل کر دیں۔ لیکن توبہ کیجیے جو کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اس طرح ٹی وی دیکھنے میں لگے ہوئے تھے جیسے وہی دُنیا کا سب سے اہم کام ہو۔ ابّو البتّہ اخبار میں کھوئے ہوئے تھے اور بھائی جان قبلہ چشمِ بد دور مرغیوں کی دُم کھینچنے اور بکریوں کے کان اینٹھنے سے فارغ ہوں تو ننّھے بھائی کی خبر لیں۔

آخر مجھے اپنی آواز ٹی وی کی آواز کے برابر کرنی پڑی۔

چند لمحوں بعد میری آواز ٹی وی کی آواز سے بھی بلند ہوگئی اور اس میں ہولناک چیخیں بھی شامل ہوگئیں۔ تب کہیں جاکر کسی کو ہوش آیا کہ شاید مُنّا رو رہا ہے۔ نہ پوچھیے اس "شاید" پر مجھے کتنا غصہ آیا۔ یہاں چلّاتے چلّاتے گلے میں خراشیں پڑ گئیں اور وہاں ابھی تک شبہ ہی ہے کہ کوئی رو رہا ہے۔ کیا خوب، میں کوئی گانے کی مشق کر رہا تھا یا ریڈیو سے فرمائشی پروگرام نشر کر رہا تھا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے بے چاری امّی کا۔ باورچی خانے سے دوڑی دوڑی آئیں اور مجھے فوراً بانہوں میں اُٹھا کر چُپ کرانے لگیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ امّی کی گود میں تھوڑا سا رو لیا جائے تو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ چُمکارنے پچکارنے کے علاوہ دودھ یا بسکٹ ملنے کا بھی پورا پورا امکان رہتا ہے۔ جی ہاں میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔ شرمایئے نہیں آپ خود بھی یہی کرتے رہے ہیں۔ اب بڑے ہوگئے ہیں تو کیا ہوا۔ تو جناب اللہ آپ کا بھلا کرے، میں نے ذرا دیر چُپ رہ کر پھر تانیں اُڑانی شروع کیں۔ ایں ایں ایں۔ ریں ریں ریں۔

اس پر امّی جان نے مجھے بھائی جان کے ہاتھوں میں تھمایا اور خود بسکٹ لینے چلی گئیں۔ جی آپ نے بالکل صحیح پہچانا یہ ہمارے وہی بھائی جان ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ پانچ سال کے ہو چکے ہیں مگر ابھی تک چاند کو برفی کا ٹکڑا یا بتاشا سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے گود میں اس طرح دبوچ لیا جیسے میں کوئی فٹ بال ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہر شریف آدمی اپنے آپ کو ایسی حالت میں پاکر شور مچاتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی شور کرنا شروع کر دیا۔ اس پر وہ حضرت مجھے آپا کے پاس بٹھا کر خود ہوا ہوگئے۔ اب آپا کا جی ٹی وی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ مجھے کیا دیکھتیں خاک۔ ٹی وی دیکھنے سے ہی فرصت نہ تھی۔ آپا نے مجھے سر پر آئی بلا سمجھ کر ٹالنا چاہا اور فرش پر بٹھا دیا۔ اتنا بھی خیال نہ کیا کہ میں ذرا سا بچّہ ہوں، گر گیا تو چوٹ لگے گی، جب کہ

میں ابھی پوری طرح بیٹھنا بھی نہیں سیکھا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی میں دھڑام سے گر پڑا۔ اور اتنی زور سے رونا شروع کیا کہ سب گھبرا گئے۔

کہاں تو یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی نہ تھے اور کہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس جمع ہو گئے۔ کاش یہ میرے گرنے سے پہلے ایسا کرتے! لیکن بڑے جو ٹھیرے۔ خیر صاحب، اب ان لوگوں کے درمیان مجھے چُپ کرانے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ چاچا جی کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے چُپ کرانے کے لیے کرکٹ کی گیند کی طرح ہوا میں اُچھالنا اور کیچ کرنا شروع کر دیا۔ مگر ایک چھے ماہ کے بچّے اور کرکٹ کی گیند میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر میں گر جاتا تو میرا سر اس طرح کُھل جاتا جیسے تربوز کی پھانکیں رکھی ہوں اور چوں کہ میں اپنے سر کو تربوز کی پھانکیں بنانا پسند نہیں کرتا اس لیے خطرہ بھانپ کر حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اب سب لوگ گھبرا گئے اور لگے اوندھی سیدھی حرکتیں کرنے۔ کوئی مُنھ سے طرح طرح کی آوازیں نکال رہا ہے تو کوئی بندروں کی نقل اُتار رہا ہے۔ کسی نے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور کوئی اپنی بھدّی آواز میں لوریاں گانے لگا۔ ایک چھوٹا بچّہ جسے چوٹ لگ گئی ہے اور جو ڈر گیا ہے اسے چُپ کرانے کا بھلا یہ کون سا طریقہ ہے کہ سب مل کر شور مچانے لگیں۔

روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ ناک سے پانی بہنے لگا۔ آپا کو اور کچھ نہ سوجھا تو انھوں نے ہمدرد نونہال کا خاص نمبر اُٹھا کر میری ناک کے آگے نچانا شروع کیا۔ مجھے اتنا غصّہ آیا کہ مت پوچھیے۔ ویسے اگر میں آپا کا کوئی رسالہ اُٹھا لوں تو وہ چلّانے لگتی ہیں کہ "ہائیں ہائیں پھاڑ ڈالے گا۔" انسان دو گھڑی دل بہلانے کے لیے کوئی رسالہ بھی نہ دیکھے؟ آپا رسالہ میرے ہاتھ سے چھین کر مجھے روتا ہوا چھوڑ کر جایا کرتی ہیں۔ اور یہ وہی آپا تھیں کہ اب میں رو رہا تھا تو مجھے رسالہ تھما رہی تھیں۔ اللہ جانے ان بڑوں کی عقلوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹوں کو رُلائے بغیر کوئی چیز نہیں دیتے اور اگر کوئی

چیز بچّوں کو دینے کی نہیں ہے تو ہر گز نہیں دینی چاہیے۔ چاہے بچّہ ہنسے یا روئے یا گائے۔

امی جو میرے لیے بسکٹ لینے گئی تھیں شاید کسی کام میں اُلجھ گئی تھیں فوراً بھاگی بھاگی آئیں اور وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا یعنی مجھے لپٹا لیا اور پیار کرنے لگیں۔ میرا سر سہلایا اور مجھے صحن میں لے گئیں۔ پرندے دکھانے لگیں اور میرے ہاتھ میں بسکٹ دے دیا۔ میں سب کچھ بھول کر پرندوں کو دیکھنے لگا اور اپنے پوپلے مُنھ میں بسکٹ رکھ کر چوسنے لگا۔

ادھر وہ سب کے سب دوبارہ اپنے اُنھی کاموں میں اس طرح لگ گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جو مجھے چُپ کرانے کے لیے سو سو جتن کر رہے تھے اور اب ایسے بن گئے تھے جیسے مجھے جانتے ہی نہ تھے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اسے کیا کہا جائے؟ یہ کیسے بڑے ہیں؟ یہ صرف روتے بچّوں کا خیال کیوں رکھتے ہیں؟ کیا انھیں ہنستے مسکراتے قلقاری مارتے بچّے پسند نہیں؟ آپ بھی تو کہیں ایسے بڑوں میں شامل نہیں ہیں؟ کہیں آپ میرے بھائی جان یا آپا جیسے تو نہیں؟ آپ کا کوئی چھوٹا بھائی یا چھوٹی بہن ہے؟

اچھی باتیں

- مت چلو : ان کے ساتھ جو راستے میں دغا دیتے ہیں
- مت جاؤ : ایسی جگہ جہاں برائیاں جنم لیتی ہوں۔
- مت بیٹھو : ایسی جگہ جہاں خرابیاں ہی خرابیاں ہوں۔
- مت چکھو : ایسا ذائقہ جو زندگی کے مزے کو تلخ کر دے۔
- مت پیو : ایسی چیز جو صحت کو برباد کر دے۔
- مت دیکھو : ان لوگوں کو جو صرف اپنے فائدے کے کھیل کھیلتے ہیں۔
- مت سنو : ایسی بات جو زندگی کو مشکلات میں مبتلا کر دے۔

مرسلہ : واحد بخش میمن، ٹھٹہ

حشرات ۔ ہمارے دوست

ڈاکٹر منظور احمد

کھٹمل، مچھر، مکھی، لال بیگ، مکڑے اور بچھو سے ہمیں رات دن واسطہ پڑتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ حشرات دنیا سے ختم ہو جائیں۔ یہ ایسے حشرات ہیں جن کی نہ تو شکل وصورت ہمیں پسند ہے اور نہ ان کی حرکتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں، کیوں کہ یہ انسان کو اکثر تکلیف پہنچاتے ہیں، لیکن یہاں ہم حشرات میں سے کچھ کی ایسی کارروائیوں کا ذکر کریں گے جو ہمارے لیے بہت مفید ہیں۔ وہ حشرات ہمارے دوست ہیں، بلکہ بعض حشرات کے باعث ہمیں اس قدر فوائد حاصل ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو زمین پر ہمارے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔

شکل-۱ ایک تھرپ

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ایک توازن رکھا ہوا ہے، جہاں ایسے حشرات موجود ہیں جو ہمارے لیے اذیّت کا باعث ہیں، وہاں ایسے بھی ہیں جو ہمارے لیے مفید ہیں۔

حشرات کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہزاروں اقسام کے پودوں میں باروری (POLLINATION) کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ پودوں کے پھولوں میں حیوانات کی طرح نر اور مادہ حصّے ہوتے ہیں۔ حشرات اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوراک کی تلاش میں گھومتے پھرتے ہیں۔ بہت سی اقسام کے حشرے رنگ برنگے

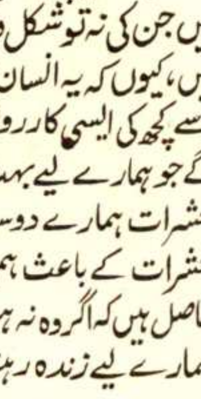

شکل ۲۔ بچّہ اژدہا مکھی

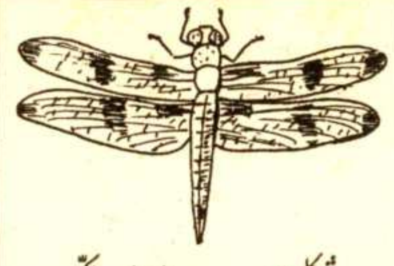
شکل ۳ بالغ اژدہا مکھی

پھولوں کی کشش کے باعث ان میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایک پھول کے نر اجزا (POLLEN GRAINS) کو اسی قسم کے پھول کے مادہ حصّوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس سے صنفی ملاپ ہو جاتا ہے۔ پھول سے پھل بنتے ہیں، بیج پیدا ہوتا ہے اور پودوں کی نسلیں آگے چلتی رہتی ہیں۔ یہ باروری کا عمل حشرات سوچ سمجھ کر نہیں کرتے، بلکہ ان کے پھول پھول گھومنے کی وجہ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگر ان پودوں میں یہ حشرات باروری کا فرض سرانجام نہ دیتے تو نہ اُن کے پھل ہوتے، نہ بیج اور نہ ان پودوں کی نسل آگے چلتی۔ باروری کے عمل میں شہد کی مکھیوں اور کئی قسم کی بھڑوں کا زبردست دخل ہے۔ ان کے علاوہ جو حشرات پھولوں کی باروری کرتے ہیں ان میں تھرپس (THRIPS) (شکل-۱)، تتلیاں، چیونٹیاں، بھونڈیاں اور مکھیاں وغیرہ شامل ہیں۔ اہم پھل دار پودوں اور سبزیوں کے پودوں میں سے کم از کم ۵۰ قسم کے پودے اپنی باروری کے لیے حشرات کے محتاج ہیں۔

ایک اور بہت اہم فائدہ جو ہمارے دوست حشرات ہمیں پہنچاتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ ماحول میں موجود ہمارے دشمن حشرات کا خاتمہ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ہمارے دشمن حشرات کی آبادیوں کو حد سے بڑھنے نہیں دیتے۔ اژدہا مکھیوں (DRAGONFLIES) کے بچّے (شکل ۲) پانی میں رہتے ہیں اور بالغ اژدہا مکھیاں (شکل-۳) ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ اِن کے بچّے پانی کے اندر موجود مچھروں کے لاروؤں اور پیوپوں کو بطور خوراک استعمال

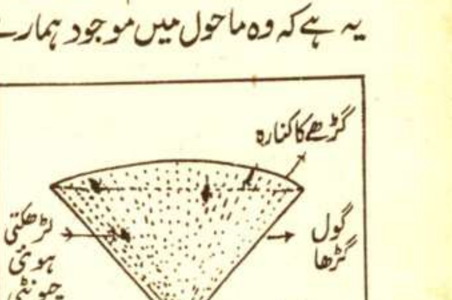

شکل ۴ چیونٹی شیر اور گڑھا

کرتے ہیں اور بالغ ہوا میں سے کئی قسم کے حشرات پر حملہ آور ہو کر انھیں کھا جاتے ہیں۔ چیونٹی شیر (ANTLION) (شکل-۴) سبھی کے سبھی حملہ آور ہونے والے حشرے ہیں. جو زمین کے اوپر عام طور پر درختوں کے نیچے گول گڑھے بنا کر ان کے پیندے میں چھپے رہتے

جالی دار پر حشرہ اور اس کا شکار ایلفڈ حشرے

ہیں۔ جوں جوں چیونٹیاں درخت سے گڑھے میں گرتی رہتی ہیں، چیونٹی شیر ان کو اپنی خوراک بنا لیتا ہے۔ جس طرح چیونٹی شیر، چیونٹیوں کے جسم کی تمام رطوبتیں چوس لیتے ہیں اور صرف خشک چھلکا چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح جالی دار پر والے حشرے (LACEWING) (شکل-۵) ایلفڈ حشروں کے جسم کے تمام نرم مائع صورت میں موجود حصّوں کو چوس کر انھیں ہلاک کرتے ہیں۔ شکاری مینٹس حشرے (شکل ۶) (PRAYING MANTIDS) اگرچہ گھاس کے ٹڈوں سے شکل و صورت میں ملتے جلتے

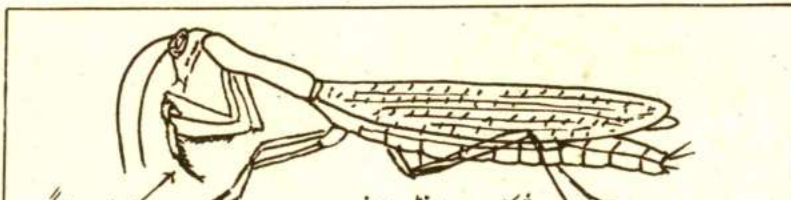

شکل ۶ مینٹس حشرہ

ہیں، لیکن عادات اور خوراک میں بہت مختلف ہیں۔ ٹڈے تو پودوں کے مختلف حصّے کھا کر گزارا کرتے ہیں، لیکن مینٹس حشرے گوشت خور ہیں اور گھنٹوں دوسرے حشرات کے شکار میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ خاتون بھونڈیوں (LADY BEETLES) میں خواتین جیسی کوئی ملائمت اور نزاکت نہیں۔ اس کے برعکس ان

بھونڈیوں کے بچّے اور بالغ (شکل ۷) ہر قسم کے نرم جسم رکھنے والے حشرات مثلاً ایفڈ، لیف ہاپر اور پلانٹ ہاپر وغیرہ کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ اس طرح ایسے حشرات کو ہلاک کرتے ہیں جو اگر زندہ رہیں تو ہماری فصلوں کو تباہ کر دیں۔ دنیا میں ایسا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جب انسان اپنی کوشش سے اپنے تباہ ہونے والے پودوں کو مُضر حشرات سے نہ بچا سکا تو خاتون بھونڈیوں نے مُضر حشرات کا خاتمہ کر دیا اور پودوں کو محفوظ کر دیا۔

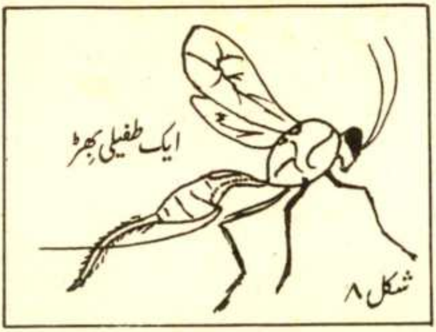

شکل ۸

اگرچہ طفیلی حشرات (شکل ۸) کی انسان دوست کارروائیاں اس طرح واضح طور پر نظر نہیں آتیں جیسی کہ شکاری حشرات کی ہیں، لیکن وہ بے انتہا اہم ہیں۔ طفیلی حشرات میں کئی خاندانوں کی طفیلی بھڑیں اور کچھ اقسام کی مکّھیاں ہیں۔ طفیلی حشرات حشرات کی زندگی کے تمام مدارج پر ان پر طفیلیت (PARASITISM) کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خاموشی سے کام کرتے ہوئے انھیں یا تو آہستہ آہستہ ہلاک کر دیتے ہیں یا انھیں اس قابل نہیں رہنے دیتے کہ وہ مزید نشوونما کر سکیں۔ طفیلی حشرات کی زد سے حشرات کا کوئی گروہ محفوظ نہیں۔ درختوں کے تنوں اور پودوں کے پھلوں میں چھپے ہوئے حشرات بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں۔ حشرات کے انڈے، نابالغ حشرات سبھی ان کی زد میں رہتے ہیں۔

شکل ۷۔ خاتون بھونڈی

انسانی ماحول کی صفائی، ستھرائی اور اسے ہمارے لیے رہنے کے قابل بنانے میں بھی حشرات کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ بہت سی قسموں کے حشرات مثلاً مکّھیاں، بھونڈیاں وغیرہ ماحول میں موجود گندی، مُردہ اور

سڑتی ہوئی ایسی چیزوں کو ختم کر دیتی ہیں جو اگر ختم نہ ہوں تو ہر طرف تعفّن اور بُو پھیل جائے ۔ جن چیزوں کو حشرات ختم کرتے ہیں ان میں وہ مردہ اجسام بھی شامل ہیں جن کو جنگلی ماحول میں کھلا پڑا چھوڑ دیا جاتا ہے یا مرنے والے حیوانات اپنے غاروں یا پرندے اپنے گھونسلوں یا چوہے سانپ وغیرہ اپنے بلوں میں پڑے رہ جاتے ہیں اور کوئی انھیں دفن نہیں کرتا ۔ اگر حشرات آہستہ آہستہ مرنے والے حیوانات کے گوشت، ہڈّیوں، پروں اور بالوں کو ختم نہ کرتے تو چند سالوں میں ہر طرف تعفّن ہی تعفّن ہوتا اور کسی زندہ حیوان کے لیے زندگی گزارنا ممکن نہ رہتا ۔

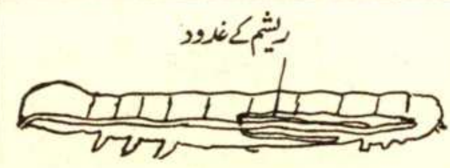

شکل ۹ ـ ریشم بُننے والا لاروا

حشرات کی روزمرہ کی کارروائیوں سے بعض میں ایسی اشیا پیدا ہوتی ہیں جو انسانوں کے نزدیک بہت زیادہ اہم اور ضروری ہیں اور انسانی تاریخ میں ایسے حشرات کو ہمیشہ انسان کا تحفظ حاصل رہا ہے ۔ شہد کی مکّھیاں، ریشم کا کیڑا اور لاکھ کا کیڑا تو سبھی جانتے ہیں ۔ شہد کو تو قرآن حکیم میں اللّٰہ تعالیٰ نے بھی ہمارے لیے مفید قرار دیا ہے ۔ شہد کی مکھیوں کے چھتّے سے شہد کے ساتھ موم بھی حاصل ہوتا ہے جو صنعت و حرفت میں استعمال ہوتا ہے ۔ ریشم کے کیڑے کے لاروے (شکل ۹) اپنے ریشم غدود سے ریشم کی تاریں بُنتے ہیں ۔ انسان نے گزشتہ $\frac{1}{2}$۳ ہزار سالوں سے ریشم کے کیڑے کو گھر میں پال کر ریشم حاصل کی ہے ۔ ۳۰۰۰۰ کے لگ بھگ اس حشرے کے لاروے ایک پونڈ وزنی ریشم تیار کرتے ہیں ۔ لاکھ کے کیڑے (شکل ۱۰) دراصل اپنے اِردگرد اپنی حفاظت کے لیے لاکھ کی تہ جما لیتے ہیں تاکہ ان کا نرم و ملائم جسم دوسرے حشرات کی زد میں نہ آسکے ۔ یہی لاکھ بعد میں مختلف

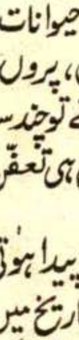
شکل-۱۰-ایک شاخ پر لاکھ کے کیڑے

کاموں میں لائی جاتی ہے۔

اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں اور اب بھی دنیا کے بعض حصّوں میں حشرات کو بطور انسانی خوراک استعمال کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں سالوں سے صحراؤں کے باشندے مناسب موسموں میں کثرت سے حاصل ہونے والے ٹڈوں کو جمع کر لیتے ہیں اور سُکھا کر بعد میں کھانے کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ آج بھی صحراؤں میں مہمانوں کو کھجوروں کے ساتھ تَلے ہوئے ٹڈے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ صدیوں سے جاری ہے۔ بعض اوقات سُوکھے ہوئے ٹڈوں کو پیس کر ان کا آٹا بنا لیا جاتا ہے اور اسے دودھ میں ملا کر کھایا جاتا ہے۔ حال ہی میں جاپان کی طرف سے تلے ہوئے ٹڈے ڈبّوں میں بند کر کے مغربی یورپی ممالک کو برآمد کیے گئے۔

راقم الحروف نے خود یوگینڈا میں دیکھا کہ بارش کے بعد لوگ رات کے وقت ہزاروں کی تعداد میں بجلی کے کھمبوں کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں اور روشنی پر آنے والے ٹڈوں کو بوریوں میں جمع کر لیتے ہیں جو بعد میں مارکیٹ میں بکتے ہیں۔ عام چھوٹی دُکانوں پر دیمک حشرے اور ٹڈے اسی طرح بکتے ہیں جس طرح مُونگ پھلی۔

انسانی خوراک کے علاوہ حشرات پرندوں کے لیے بھی اور بعض دوسرے حیوانات کے لیے بھی باقاعدہ خوراک ہیں۔ پرندوں کی خوراک کا عام طور پر $\frac{2}{3}$ حصّہ حشرات پر مشتمل ہوتا ہے اور پرندے ہماری اپنی ضرورت ہیں۔ اس لیے پرندوں کی خوراک بن کر بھی حشرات ہمارے لیے مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بہت سے ایسے پودے جو ہمارے لیے ناگوار تصوّر ہوتے ہیں ان کو خوراک بنا کر بھی حشرات ہماری دوستی کا حق ادا کرتے ہیں۔ زمین کے اندر رہنے والے لاکھوں حشرات اپنی معمول کی حرکات کے ذریعے سے مٹّی کے ذرّات کو اُلٹ پلٹ کر زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔ حشرات نے حیاتیات کے بنیادی حقائق کو سمجھنے میں جس قدر ہماری مدد کی ہے اس میں بھی ہم بہت سے معاملات میں ان کے احسان مند ہیں۔

بعض کہانیاں بڑی عجیب ہوتی ہیں جنھیں ماننے کو عقل تیار نہیں ہوتی اور نہ ماننے کو دِل تیار نہیں ہوتا۔ مثلاً ان تین دوستوں کی کہانی جو تقریباً تیس سال پہلے شکار کو نکلے تھے اور جن میں سے ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے جو نہ پہلے ہوتے دیکھے تھے نہ کبھی سُنے۔

عظمت اللہ کے ہاتھ

حسن منظر

تینوں ساتھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ عاشق حسین نے ہائی اسکول پاس کر کے ریلوے میں ملازمت کرلی تھی اور ترقّی کرتے کرتے ایک قصبے میں اسٹیشن ماسٹر ہوگئے تھے۔ ہنس مکھ آدمی، قدرے بھاری جسم کے، کھانے پینے سے زیادہ خاطر مدارات کے قائل اور شاید ہی زندگی میں ان کی کسی سے لڑائی ہوئی ہو۔

عظمت اللہ کا ارادہ آگے تک پڑھنے کا تھا لیکن انٹر میں ایک استاد کی پٹائی کردی اور کالج سے نکال دیے گئے۔ کھانے پینے کے وہ بھی شوقین تھے، لیکن اگر خانساماں سے پکانے میں کچھ غلطی ہوگئی تو روٹیاں فرش پر پڑی ہوئی نظر آتی تھیں جیسے پت جھڑ میں زمین پر بکھرے ہوئے پتّے اور سالن کی پلیٹ ان کے ہاتھ سے اُڑ کر خانساماں کے منھ کا رُخ کرتی تھی۔ جو خانساماں ان کی عادت سے واقف ہوتا تھا سر بچا جاتا تھا، جو نیا ہوتا تھا سالن میں نہا جاتا تھا۔ عظمت اللہ کی بیوی تین مہینے ان کے ساتھ رہتی تھی اور چار مہینے اپنے ماں باپ کے گھر۔ وجہ وہی ان کا غصّہ۔ بچّے تک عظمت اللہ کا منھ دیکھ کر ہنستے اور کھیلتے تھے۔ ادھر ان کی تیوری پر بل پڑے اُدھر بچوں نے کونوں کُھدروں میں دُبکنا شروع کیا۔ کچھ کورس کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے تھے، کچھ سودا سلف کے بہانے گھر سے سرک لیتے تھے۔ عظمت اللہ نے نوکریاں بھی اسی لیے گنوائیں۔

کہتے تھے نوکری اور بیوی کو میں پاؤں کی لونڈی سمجھتا ہوں۔ خیر بیوی کو تو وہ

نہیں چھوڑ سکے، کیوں کہ وہ ان کے سگے چچا کی بیٹی تھیں اور چچا خود بات بات پر بندوق اٹھا لینے کے عادی تھے۔ البتہ نوکریاں انھوں نے اتنی چھوڑیں کہ آخر ان کے شہر میں کوئی محکمہ ایسا نہیں بچا جو انھیں نوکری دینے کو تیار ہو۔ یہ واقعات ۱۹۱۴ء کے بعد کے ہیں۔ اچھے زمانے تھے کہ کم زور اور غریب لوگ طاقت وروں اور پیسے والوں سے پٹ لیتے تھے اور پولیس میں رپورٹ نہیں کرتے تھے۔ ورنہ آج کل کا زمانہ ہوتا تو عظمت اللہ بار بار تھانے کے بندی گھر میں نظر آتے یا پھر ان کی جائداد گلو خلاصی کے لیے رشوت میں جاتی اور تھوڑے ہی دن میں لنگوٹی بندھ جاتی۔ چناں چہ وہ مختصر سی جائداد کی بدولت خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ جب جی گھبراتا تھا شکار کو نکل جاتے تھے یا دوستوں سے شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔ شطرنج کے معاملے میں وہ نپولین بوناپارٹ سے کم نہیں تھے جو جب بازی ہارنے لگتا تھا تو دھاندلی پر اُتر آتا تھا اور چوں کہ بادشاہ تھا اس لیے اس کے مصاحبین جان بوجھ کر ہارنے ہی میں اپنی خیر سمجھتے تھے۔ عظمت اللہ غصے میں آکر شطرنج کی بساط اُلٹ دیتے تھے۔

مسعود خان، عاشق حسین اور عظمت اللہ دونوں سے مختلف تھے۔ لمبے قد کے آدمی، پہننے اوڑھنے کے شوقین، دعوت دینے کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے بی اے کیا تھا اور گورمنٹ کے کسی محکمے میں کسی خاصی اچھی پوسٹ پر تھے۔ انگریزوں کا دور تھا۔ مسعود نے ایک چھوٹا سا بنگلہ اس علاقے میں لے رکھا تھا جہاں آدھے انگریز، آدھے ہندستانی یا یہ کہ نیم کالے نیم گورے ریلوے کے ملازمین رہتے تھے اُن کے ساتھ رہتے رہتے مسعود خاں کا لہجہ بھی آدھے انگریزوں جیسا ہو گیا تھا۔ سنیچر کی رات کو وہ اینگلو انڈین کلب میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔

جب کبھی شکار کا پروگرام بنتا تھا تو سب عاشق حسین کے گھر آجاتے تھے، جہاں پہلے کھانا پینا ہوتا تھا اور جتنی دیر میں چائے آئے تینوں اپنی بندوقوں کی نالیں چیک کرتے تھے، یہ ایک طرح تینوں کا معمول تھا، ورنہ اپنی بندوقوں کو چیک تو ہفتے کے ہفتے کرتے اور گھر سے نکلتے وقت بھی چیک کر کے آئے ہوتے تھے۔

عاشق حسین کا نشانہ بہت اچھّا تھا۔ وہ جھاڑی سے بیک وقت اُڑنے والے دو چَھوں کو دو فائر میں گرا سکتے تھے۔ جانوروں کو بے کارتنگ کرنا یا زخمی کر کے چھوڑ دینا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ نہ وہ کسی ایسے جانور کی جان لیتے تھے جو نہ ایذا پہنچا رہا ہو نہ کھانے کے کام آئے۔

عظمت اللہ کی شہادت کی اُنگلی یوں بھی بندوق دیکھتے ہی پھڑکنے لگتی تھی، لیکن جب بندوق ہاتھ میں ہو تو چاہے نیل کنٹھ ہی کسی شاخ پر بیٹھا نظر آجائے یا اونگھتا ہوا کھوسٹ یا سویا ہوا اُلّو وہ فائر کرنے سے نہیں چُوکتے تھے اور جب پرندہ زمین پر گرتا تھا یا وہیں تار یا شاخ سے لٹکے کا لٹکا رہ جائے تو وہ فاتحانہ انداز سے اپنے ساتھیوں کو دیکھتے تھے۔ عظمت اللہ سے شکار کے معاملے میں کوئی بحث نہیں کرسکتا تھا۔ اگر دو تین ساتھیوں نے ایک ساتھ کسی جانور پر فائر کیا ہے تو اُسے مانا عظمت اللہ ہی کا شکار جاتا تھا، ورنہ بحث بڑھ جاتی اور عظمت اللہ ناراض ہو کر جنگل سے آبادی کی طرف چل پڑتے اور غصّے سے کہتے جاتے 'لعنت ہے مجھ پر جو اَب کبھی تمھارے ساتھ شکار کھیلنے کو آؤں'۔

ہاں جب ڈھیر سے پرندے بغیر گنتی کے مارے جاتے تھے تو گھروں کو روانہ ہوتے وقت شکاری آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ شکار کم ملنے پر عاشق حسین اپنے ہاتھ سے مارا ہوا شکار بھی دوستوں میں بانٹ آتے تھے اور جب کوئی ساتھی کہتا 'کچھ تو گھر لیتے جاؤ، بچّے انتظار میں بیٹھے ہوں گے' تو وہ کہتے 'بچّے اب تک صبح سے نجانے کتنی بار مُنھ جُھٹال چکے ہوں گے۔ میں تمھیں بھوکا نظر آتا ہوں جو وہ ابھی تک بُھوکے بیٹھے ہوں گے'۔ اور یہ حقیقت تھی کہ شکار میں ساتھ کے لیے توشہ عاشق حسین ہی کے گھر سے جاتا تھا۔ شامی کباب، پراٹھے، قیمہ۔ ایسی چیزیں جن میں سالن کا بکھیڑا نہیں ہوتا تھا اور جب سب تھک کر کسی پہاڑی نالے کے کنارے بیٹھ جاتے تھے۔ عاشق حسین اپنے بیگ میں سے نکال کر کھانا پتھروں پر جماتے اور سب سے کہتے، "کھاؤ بھئی، بھوکے پیٹ تو چُوہا بھی نہیں ملے گا"۔

اگر قسمت مسعود کے ساتھ ہوتی تھی اور وہ فیّاضی میں آکر دوستوں سے کہتے 'جتنے جی چاہے اُٹھالو' تو عظمت اللہ اور عاشق حسین دونوں ہی مسعود کے مارے ہوئے پرندوں کو گھر لے جانے کے معاملے میں کنّی کاٹ جاتے، بہانہ بنا دیتے، "ہیں ہی کتنے۔ تم ہی لے جاؤ۔ اپنے اینگلو انڈین دوستوں کو بھی تو کھلاؤ گے یا خود ہی سب چٹ کر جاؤ گے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو اکثر شکار کھاتے ہیں۔ ان بے چارے کرنٹوں (کالے عیسائیوں) کی ساری تنخواہ تو شراب اور اور کلب میں اُٹھ جاتی ہے، وہ کہاں سے بندوق خریدیں اور شکار کو جائیں"۔

اس پر دوسرا کہتا 'اور کارتوس بھی کون سے سستے ہیں۔ بیس رُپے سیکڑہ (بیس پیسے کا ایک)'۔

لیکن اصل وجہ کچھ اور ہی تھی جو یہ لوگ مسعود کا شکار گھر لے جانے سے کتراتے تھے: مسعود کے یہاں حرام، حلال سب چلتا تھا۔ جب پرندوں کا جُھنڈ کا جُھنڈ زمین پر آن گرے تو وہ اُن کی گردنیں اُمیٹھ اُمیٹھ کر اپنے تھیلے میں ڈالتے جاتے تھے۔ اگر ساتھی دیکھ رہے ہوں اور پرندہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی دَم توڑ چکا ہو تو وہ دکھانے کو اس کے گلے پر چاقو پھیر کر تھیلے میں ڈال لیتے تھے اور ساتھ ہی کہتے جاتے 'ابھی اس میں سانس ہے'۔

سب کو پتا تھا مسعود کو پوری الحمد بھی نہیں آتی تھی، نہ وہ صفائی طہارت کے قائل تھے اور اُن کے بگلا کھا جانے پر یہ دو ہی نہیں ان کے سب ملنے والے ہنستے تھے۔ مسعود خان اور عظمت اللہ ایک ہی شہر میں رہتے تھے، گو دُور دُور۔ عاشق حسین کی تعیناتی ایک قریب ہی کے قصبے میں ہوئی تھی۔

گرمیاں تو تھیں، لیکن بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ پُلیوں کے نیچے جو جوہڑ گرمیوں میں سُوکھے پڑے تھے اور ان کی مٹّی تڑخ گئی تھی اب پانی سے بھر گئے تھے۔ درخت پانی سے دُھلے ہوا میں ہلتے ایسے نظر آتے تھے جیسے نہانے کے بعد کوئی ہَوا لگنے پر جُھرجُھری لے رہا ہو۔ تالاب سنگھاڑوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی جس میں جگہ جگہ پھول سر اٹھائے کھڑے تھے۔

لگتا تھا ہری مخمل پر کسی نے بڑی مہارت سے لال، اودے، پیلے ہر رنگ کے پھول کاڑھے ہیں۔

تینوں دوست پروگرام کے مطابق صبح صبح عاشق حسین کے گھر پر جمع ہوئے تھے جہاں سے دریا زیادہ دُور نہیں تھا۔ پیدل کا راستہ تھا۔ پھر دریا کا ڈھال اُتر کر کشتیوں کا پُل تھا جسے پار کر کے ایک دوسری ہی دنیا تھی۔ دیہاتیوں کی دنیا، پرندوں چرندوں کی دنیا، گیدڑوں بھیڑیوں کی دنیا اور وہ دنیا جو آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھولوں، گھاس، پیڑ پودوں اور تالابوں سے بھری ہوئی تھی اور اگر کوئی جیالا زیادہ ہمّت کرے اور جان کو جوکھم میں ڈالے تو چند میل آگے بڑھ کر ہمالیہ کی ترائی کے گھنے جنگل تھے جن میں ہاتھیوں، ریچھوں اور ٹائیگر اور گل داروں سے بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔

تینوں راستے بھر گپ شپ کرتے آئے تھے۔ کچھ دیر انھوں نے کشتیوں کے پُل پر ٹھیر کر تازہ اور ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھایا۔ پھر آس پاس کے گاؤں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ لمبی لمبی گھانسوں کے بیچ میں گاؤں والوں کے قدموں کی بنائی ہوئی پگ ڈنڈیاں تھیں۔ یہ گاؤں والے ان ہی پگ ڈنڈیوں پر چل کر روز جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنے جاتے تھے اور ان ہی راستوں پر ان کے لڑکے اپنی گایوں بھینسوں کو نہلانے ندی پر لے جاتے تھے۔ یہ کام وہ دن کے دن کرتے تھے ورنہ سورج ڈوب جانے پر بھیڑیے یا جنگلی سوّر کا خطرہ ہوتا تھا۔ جنگل اور ندی ان لوگوں کی دنیا تھی۔ اونچی گھاس سے آگے بڑھ کر درختوں کا بَن تھا جس میں بندروں کی کثرت تھی اور درختوں پر جنگلی مرغیاں بیٹھی نظر آتی تھیں۔ شکاریوں کے قدموں کی آہٹ سُن کر درختوں پر چڑیاں پہلے تو زور زور سے بولتی تھیں جیسے اور جانوروں کو آگاہ کر رہی ہوں کہ چُپ ہو جاؤ ہمارے دشمن آگئے ہیں۔ پھر جنگل پر مکمل سُکوت چھا جاتا تھا، لیکن جس دن کی یہ بات ہے اس دن نہ لمبی گھاس میں سرسراہٹ ہوئی جو گمان ہوتا کہ ابھی کوئی بے وقوف خرگوش گھبرا کر عین ان کے سامنے سے پگ ڈنڈی کو پار کرے گا، نہ کہیں

کوئی نیل گائے چرتی نظر آتی۔
ہر طرف سنّاٹا تھا اور اچانک ہوا کے رُک جانے سے تینوں شکاری اپنی سانسوں کی آواز تک سُن سکتے تھے۔ یہی حال درختوں کے بَن کا تھا۔ جب وہ اس میں داخل ہوئے نہ چڑیوں نے گھبرا کر چیخنا شروع کیا، نہ کوئی ڈرا ہُوا جانور ان سے دُور اپنی جان بچانے کو بھاگتا نظر آیا۔ تینوں کی نظریں درختوں پر تھیں۔
وقت گزرتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سورج سر پر آگیا اور ابھی تک کسی نے ایک فائر بھی نہیں کیا تھا۔ اُمس کی وجہ سے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا میں تینوں کی سانسیں پھول رہی تھیں اور قمیصیں پسینے سے شرابُور ہوگئی تھیں۔ مسعود خاں نے اُکتاہٹ سے کہا، "کیا آج شکار کا روزہ ہے؟"
عظمت اللہ نے کہا، "ابھی افطار کا وقت آیا جاتا ہے۔ میری اُنگلی ٹریگر پر بے چین ہو رہی ہے"۔
عاشق حسین نے کہا، "شکار ملے نہ ملے، آؤ صبح سے اس وقت تک کا روزہ تو افطار ہی لیں"۔
لیکن عظمت اللہ نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ البتہ مسعود خاں نے کہا، "واقعی بھوک تو لگی ہے۔ آج بھابھی نے کیا ساتھ کیا ہے؟"
ان دونوں نے اپنی بندوقیں ایک درخت سے ٹکا کر کھڑی کر دیں اور حساب لگانے لگے۔ گھر سے چلے کتنے گھنٹے گزر چکے تھے اور کتنا فاصلہ طے کیا تھا۔ عظمت اللہ کے چہرے پر سے ہنسی غائب ہو چکی تھی۔ جیسے انھیں جانوروں اور پرندوں کے جنگل سے غائب ہو جانے پر غصّہ آ رہا ہو۔ کیوں ان کی اجازت کے بغیر سب اپنی کچھاروں، اپنے گھونسلوں سے کہیں اور چلے گئے تھے۔ کیا انھیں معلوم نہیں تھا آج عظمت اللہ شکار کھیلنے آ رہے ہیں۔ سب کو پگ ڈنڈیوں کے دونوں طرف ان کے استقبال کو کھڑا رہنا چاہیے تھا کہ آئیے سرکار ہمیں نشانہ بنائیے۔ مسعود خان اور عاشق حسین عظمت اللہ کے اس روّیے پر ان کی ہنسی

اڑاتے تھے، ' کیوں بھئی جانوروں کو کوئی اور کام نہیں ہے۔ بس آپ کے انتظار میں بیٹھے رہتے! ' ۔

لیکن آج جب یہی بات مسعود خاں نے کہی تو عظمت اللہ جھنجھلا اُٹھے، بولے، " دیکھتا ہوں سب کہاں چلے گئے ہیں"۔ عاشق حسین نے کہا، " پہلے کچھ کھا تو لو۔ پھر آگے بڑھیں گے"۔

عظمت اللہ نے غصّے سے کہا، " مجھے بھوک وُوک نہیں لگی ہے، تم دونوں کھاؤ"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اُس طرف چلے گئے جدھر درخت زیادہ گنجان تھے اور ان کے نیچے دوپہر کے وقت بھی، جب چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی، اندھیرا تھا۔ عاشق حسین اور مسعود خان نے درخت کے نیچے اپنی بندوقوں سے نزدیک ہی ڈیرا جمایا۔ عاشق حسین زمین پر چادر پھیلانے لگے اور مسعود خان برابر کے پہاڑی نالے سے پانی لینے چلے گئے۔ عظمت اللہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔

کھانا ختم کرکے عاشق حسین نے کہا، " میرا تو دِل یہیں سونے کو چاہ رہا ہے۔ ہَوا نہیں ہے تو کیا ہُوا، چھاؤں کی ٹھنڈک تو ہے"۔ تھوڑی دیر میں دونوں ہی باتیں کرتے کرتے خرّاٹے لینے لگے۔

سورج اب سر سے گزر کر پچھّم کو جانے لگا تھا۔ اچانک درختوں کی اوٹ سے نکل کر عظمت اللہ ان سوتوں کے پاس آن کھڑے ہوئے اور کچھ دیر قہر کی نظروں سے دونوں کو دیکھنے کے بعد بولے " دن ڈھل رہا ہے۔ کیا سونے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔"

عاشق حسین آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ مسعود خان زیادہ کھا گئے تھے، ان کی نیند بھی گہری تھی۔ اُنھوں نے دوسری طرف کو کروٹ لے لی۔

عاشق حسین نے کہا، " دن ڈھل رہا ہے تو پھر گھر کا رُخ کیا جائے"۔

" ہرگز نہیں"، عظمت اللہ نے غصّے سے کہا، " میں کچھ مارے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ آپ لوگوں کی طرح جنگل میں آرام کرنے نہیں آیا تھا"۔

اب مسعود بھی اُٹھ گئے، بولے، " واپسی پر جو گاؤں پڑتے ہیں، وہاں ان کی

مرغیاں چُگ رہی ہوں گی ۔ ان سے اپنا شوق پورا کر لیجیے گا"۔
عاشق حسین نے کہا، "زیادہ سے زیادہ ایک مرغی پر آٹھ آنے خرچہ آئے گا۔ آپ کی شکار کی آرزو تو پوری ہو جائے گی"۔ عظمت اللہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ان دونوں سے ذرا پرے بیٹھ گئے۔ عاشق حسین نے کہا، "بھوک لگی ہے؟"
"نہیں شکار مارے بغیر مجھ پر کھانا حرام ہے"۔ عظمت اللہ نے کہا۔
پھر باری باری سے انھوں نے بندوق کی دونوں نالوں میں سے آس پاس کے درختوں کو دیکھا۔ ایسا کرتے میں ان کی شہادت کی انگلی پھڑک جا رہی تھی۔ عاشق حسین اور مسعود خان نے ایک دوسرے کو معنیٰ خیز نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں 'آیا عظمت اللہ پر اب شیطان۔ گھڑی بھر میں بھوت بننے والے ہیں'۔
عظمت اللہ وہیں ٹیلے پر بُت بنے بیٹھے رہے۔ باقی دونوں دوست سامان بٹورنے لگے۔ پھر انھوں نے تھیلے اپنے کندھوں پر لادے اور بندوقیں اٹھائیں۔ ایک نے سنانے والے لہجے میں کہا "گھر چلنے کا وقت آگیا ہے"۔ دوسرے نے کہا، "یار زندہ صحبت باقی"۔
پہلے نے کہا، "یوں کہو، جنگل سلامت، شکار آئندہ"۔
عظمت اللہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا، "اس جنگل کو سلامت رہنے کی دعا دے رہے ہو جس میں ایک سانپ تک نہیں"۔
عاشق حسین نے پھُس پھُسی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، "تو کیا سانپ کا شکار کرنے آئے تھے؟"
عظمت اللہ نے کہا، "اب تو سانپ، بچھّو، گو، بگھیرا، سُئور، جو مل جائے ماروں گا اور مار کر ہی گھر جاؤں گا"۔
مسعود خان نے انگریزی میں کہا، "ڈونٹ بی سِلّی، شکار مارنے آئے تھے یا جانوروں سے بدلا لینے"۔
"بدلا نہ لوں تو میرا نام عظمت اللہ نہیں ہے"۔ انھوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

عاشق حسین نے کہا، "غصّہ تھوک دو عظمت! ہم تو دو گھڑی، روز کی جھک جھک سے بچنے کو ہر کھیل کھیلتے ہیں۔ شکار نہیں ملا تو کیا ہُوا۔ جنگل اور ندیوں کا لُطف تو اٹھا لیا۔ کھُلی ہوا تو ملی سانس لینے کو"۔

عظمت اللہ نے کہا، "جی نہیں، آپ آتے ہوں گے ہوا خوری کو۔ میں آیا تھا شکار کے ارادے سے اور شکار کرے بغیر گھر نہیں جاؤں گا"۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اب ہوا چل پڑی تھی اور درختوں کے پتّے آپس میں رگڑ کھا رہے تھے، شاخوں نے بھی ہلنا شروع کر دیا تھا۔ دُور بہت دُور ایک ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز دو ایک مرتبہ آئی۔ عظمت اللہ نے دانت کچکچا کر کہا، "تمھیں معلوم ہے میں وہاں تک ہو آیا ہوں جہاں سے یہ آواز آ رہی ہے۔ اس وقت یہ ہاتھی کہاں مر گیا تھا"۔

عاشق حسین نے کہا، "اسے آپ کے آنے کی اطلاع بر وقت نہیں ملی ہوگی، اس لیے وہ اپنی ساس یا تاؤ کے گھر ملنے چلا گیا ہوگا"۔

"چلتے چلتے میرے پاؤں تھک گئے ہیں۔ صبح سے بھُوکا ہوں اور تم لوگوں کو مذاق سُوجھ رہا ہے"۔

مسعود خان نے کہا، "اٹھو! بہت ہو چکی، اب اندھیرا ہونے کو ہے"۔

ناچار عظمت اللہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد تینوں انھی پگڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے جن پر ہو کر صبح جنگل میں آئے تھے۔ سائے اب ان کے پیچھے پڑ رہے تھے۔ ایکا ایکی عظمت اللہ نے اعلان کرنے والے لہجے میں کہا، "قسم اُس رب کی جس نے مجھے پیدا کیا ہے، بغیر کچھ مارے گھر واپس نہیں جاؤں گا"۔

"چاہے کچھ بھی ہو؟" مسعود خان نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ بھی ہو؟" عظمت اللہ نے کہا۔ پھر تینوں خاموش ہو گئے۔

جنگل ختم ہوا۔ لمبی گھانسوں کا علاقہ شروع ہوا۔ اُلٹے ہاتھ پر ایک پگ ڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک گاؤں پڑا۔ جھونپڑوں میں سے شام کی روٹی پکائے جانے کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ راستے میں دو ایک کچے کُنوئیں بھی آئے۔ پھر ایک گاؤں دور

سے بائیں ہاتھ کو نظر آیا، جہاں گھاس کا میدان ختم ہوتا تھا۔ راستہ ایک تالاب میں اُگے ہوئے سرکنڈوں کے جھنڈ اور جھاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گزرتا تھا اور اتنا تنگ تھا کہ تینوں شکاری ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے عظمتُ اللہ سب سے آگے تھے۔ ان کی نگاہیں مستقل اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شاید کہیں کوئی سیار (گیدڑ) یا خرگوش چھپا بیٹھا ہو۔ اور وہ چلتے میں بندوق کی نال سے کبھی کبھی جھاڑی کو بھی ہلا کر دیکھ لیتے تھے۔ شاید اسی بہانے کوئی سیہی (خارپشت) گھبرا کر بھاگے۔ عظمت اللہ کے پیچھے عاشق حسین تھے اور ان سے پیچھے مسعود خان۔ دو ایک بار عاشق حسین نے عظمت اللہ کو ٹوکا بھی، "یہ کیا کر رہے ہو، بے وقوف ہوئے ہو۔ جو ابھی کوئی سانپ نکل آئے تو بھاگتے نہیں بن پڑے گی"۔

عظمت اللہ نے اپنی قسم کو دُہراتے ہوئے کہا، "وہ بھی مارا جائے گا"۔

جہاں سرکنڈوں کا جھنڈ اور جھاڑیاں ختم ہوتی تھیں اور راستہ کُھلے میدان میں داخل ہوتا تھا، عظمت اللہ کے جھاڑیوں کو بندوق کی نال سے کھڑبڑانے پر اچانک کوئی ہری اور لال چیز اس میں سے اٹھتی ہوئی نظر آئی اور اسی لمحے عظمت اللہ کی بندوق چلنے کا دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جھاڑیوں میں سے ایک چیخ بلند ہوئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تینوں گھبرا کر جھاڑی میں گُھس گئے۔ وہاں زمین پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بے جان پڑی تھی۔ اس کا لال دوپٹّا جھاڑیوں میں پھنسا رہ گیا تھا اور قمیص کے ہرے رنگ میں ایک سُرخ دھبّا پڑ گیا تھا۔ پھر وہ دھبّا بڑا ہونے لگا اور وہاں سے بہنے والا خون زمین پر گرنے لگا۔ عورت کی آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں اور اس کے پاس ہی سُوکھی ہوئی لکڑیوں کا ایک گٹّھا پڑا تھا۔

عاشق حسین نے ہکّا بکّا ہو کر کہا، "یہ تم نے کیا کیا؟"

مسعود خان نے تشویش کے لہجے میں کہا، "یہاں سے بھاگ نکلو۔ بندوق چلنے کی آواز سنتے ہی گاؤں والے آنے کو ہوں گے"۔

عظمت اللہ نے دونوں دوستوں کو گھور کر دیکھا، اپنی بندوق کو توڑ کر کھولا اور

اس میں سے چلا ہوا کارتوس نکال کر تالاب کی طرف اُچھال دیا۔ عاشق حسین نے کہا، "انتظار کاہے کا ہے؟ مسعود ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ اِنصاف وِنصاف کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اگر گاؤں والے آگئے تو یہیں ہماری تِکّا بوٹی کر دیں گے"۔

عظمت اللہ کے چہرے پر مطلق گھبراہٹ نہیں تھی۔ انھوں نے خالی نال میں بڑے اطمینان سے نیا کارتوس ڈالا اور کھٹاکے سے بندوق کو بند کر دیا۔ پھر اچانک انھوں نے اپنے دوستوں پر بندوق تانتے ہوئے کہا، "ابھی قسم کھاؤ، آج کی بات تمھاری زبان پر کبھی نہیں آئے گی"۔

مسعود خان نے کہا، "یہ کیا مذاق ہے عظمت، بندوق ہٹاؤ"۔

"نہیں پہلے دونوں آدمی قسم کھاؤ: اس بات کا ذِکر زندگی بھر تم دونوں کی زبان پر کسی کے سامنے نہیں آئے گا۔" یہ کہتے کہتے وہ بندوق کو فائر کرنے والی پوزیشن میں اپنی آنکھ کے پاس لے آئے۔ جیسے دُور کسی ہرن کا نشانہ لے رہے ہوں۔ پھر انھوں نے کہا، "میں تین تک گنتی گِنوں گا اور دونوں نالیں داغ دُوں گا"۔

مسعود خان کی گھگّی بندھ گئی اور بولے، "میں قرآن کی قسم کھاتا ہوں"۔

عاشق حسین نے کہا، "مجھ سے جو قسم چاہے لے لو"۔

عظمت اللہ نے کہا، "سب قسمیں کھاؤ، اللہ کی، رسولؐ کی، قرآن کی، اپنے ماں باپ کی، بیوی بچّوں کی ـــ کھاؤ"۔

عاشق حسین اور ان کے ساتھ ساتھ مسعود خان کہتے گئے، "قسم اللہ پاک کی، میں یہ بات کسی سے نہیں کروں گا، قسم رسولؐ اللہ کی میں یہ بات کسی سے نہیں کروں گا۔ قسم میری ماں کی، میرے باپ کی، انھیں جنّت نصیب نہ ہو اگر میں یہ بات کسی سے کروں۔ میرے بیوی بچے مر جائیں جو میں یہ بات کسی سے کروں"۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب قسم کی کوئی قیمت ہوتی تھی۔ لوگ بات بے بات قسم کھانے کو بُرا سمجھتے تھے اور جو کھا بیٹھتے تھے وہ اسے کسی قیمت پر توڑنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ اُن دِنوں اِس قسم کے واقعات سننے میں آتے تھے کہ فلاں آدمی نے حلفیہ

جھوٹا بیان عدالت میں دیا اور گھر آتے ہی اس کے پیٹ میں اس شدت کا درد اُٹھا کہ وہ گھنٹہ بھر میں لوٹ پوٹ کر ختم ہو گیا۔ یہی نہیں لوگ تو اُس قسم کا بھی پاس کرتے کرتے تھے جو کوئی انھیں دے دے، مثلاً: "تمھیں قسم ہے جو اپنے بھائی کو معاف نہ کرو"۔ اور جس پر قسم چڑھ جاتی تھی وہ اُسے پُورا کرتا تھا۔ آج کل جتنی بے حرمتی قرآن شریف کی ہوتی ہے دنیا بھر میں شاید ہی کسی اور کتاب کی ہوتی ہو۔ لوگ عدالت میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر سچی بات کہنے سے مکر جاتے ہیں اور بے گناہ پھنس جاتے ہیں، مجرم بچ نکلتے ہیں۔

اپنے دونوں ساتھیوں کی قسم کا اعتبار کر لینے کے بعد عظمت اللہ نے عاشق حسین اور مسعود خان کو آگے آگے چلنے کو کہا۔ تینوں نے ایک لمبا راستہ اس طرح کاٹا کہ کوئی گاؤں ان کے راستے میں نہ پڑے۔ راستے بھر خاموشی رہی۔ ایک بار عاشق حسین نے آہستہ سے مسعود سے کہا، "پتا نہیں بے چاری کون تھی"۔

مسعود خان نے بھی اتنی ہی مَدّھم آواز میں کہا، "پتا نہیں صبح تک اس کی لاش بچے گی بھی یا نہیں"۔ پھر انھوں نے انگریزی میں کہا، "یا پھر سیار اور بھیڑیے اس پر اپنی دعوت کریں گے"۔

اب ہوا سامنے سے چل رہی تھی اور دونوں کی باتیں عظمت اللہ سُن سَکتے تھے۔ انھوں نے نیچی آواز میں دُرشتی کے ساتھ کہا، "خاموش"۔

پھر تینوں دریا کے ڈھال پر اسی طرح اُترے اور چڑھے جس طور مَری ہوئی عورت کو جہاں جھاڑیوں میں مرا ہُوا چھوڑا تھا وہاں سے یہاں تک۔ آگے آگے مسعود خاں اور عاشق حسین اور اُن سے چند قدم کے فاصلے پر پیچھے پیچھے عظمت اللہ۔ وہ جگہ نزدیک آگئی تھی جہاں سے ایک راستہ اُس قصبے کو جاتا تھا جہاں عاشق حسین کو جانا تھا، دوسرا اُس شہر کو جہاں پُرانی آبادی میں عظمت اللہ کا گھر تھا اور نئی میں چھوٹے چھوٹے بنگلے تھے اور جہاں مسعود خان رہتے تھے۔ دونوں اس ڈر سے کہ عظمت اللہ اُن پر نہ پَلَٹ پڑے دَیر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، جیسے یہ واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔

عاشق حسین نے مسعود سے کہا، "چھوٹے لڑکے کو کہاں پڑھانے کا ارادہ ہے؟"

مسعود خان نے کہا، "ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ دوسرے شہر کے کانوینٹ اسکولوں میں بھیجنے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے کا خرچہ اتنا ہے کہ کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ایک ہی کو وہاں بھیج کر پچھتا رہا ہوں"۔

عاشق حسین نے کہا، "اجی آپ کے اپنے شہر میں کم اسکول ہیں جو دوسرے شہر میں بھیجیں"۔

"ہیں تو مگر ان میں پڑھانے والے سب یہیں کے ہیں۔ یہاں کے کانوینٹ تک میں بھنگی انگریز پڑھاتے ہیں"۔

عاشق حسین کو یہ بات بُری لگی۔ اگر پڑھانے والے مقامی عیسائی تھے اور ان کا چمڑا سیاہ تھا اور پہلے ان کے باپ دادا بھنگی یا چمار تھے تو کیا ہُوا۔ تھے تو پڑھے لکھے اور یہ بات کتنی بڑی تھی کہ بھنگی چماروں کے گھروں سے نکل کر ان کے بچّوں نے اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی تھی اور اب تعلیم جیسے باعزّت پیشے سے منسلک تھے۔ پڑھے لکھے گھرانوں میں تو یونہی تعلیم کا چرچا ہوتا ہے۔ کوئی ان کی ذات اور رنگت کی ہنسی نہیں اُڑاتا۔ بچّوں میں قدرتی طور سے خوداعتمادی آجاتی ہے۔ پھر اگر وہ تعلیم حاصل کرلیں اور اچھّے عہدوں پر لگ جائیں تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ جاہل گھرانوں سے نکل کر تعلیم حاصل کرنا زیادہ بڑی بات تھی۔

عاشق حسین کے چُپ رہ جانے پر بات وہیں پر ختم ہوگئی۔

جب تراہا آیا تو تینوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ راستے بھر یہ خیال عاشق حسین اور مسعود خان کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا کہ چلتے وقت وہ اچانک اپنی اپنی بندوق عظمت اللہ پر تان لیں اور کہیں 'ابھی چل کر گاؤں والوں کو حادثے کی اطلاع دو اور تاوان دو۔ اس پر تیار نہیں ہو تو ہم تمھیں پولیس تھانے لیے چلتے ہیں'۔

کسی نے ایک لفظ بھی مُنھ سے نہیں نکالا۔ نہ ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا،

نہ آئندہ ملنے کا پروگرام طے کیا۔ عاشق حسین تھکے تھکے قدموں سے اپنے قصبے کی طرف چل دیے۔ مسعود خان نے گھر کا راستہ لیا، جو شہر کے باہر باہر جاتا تھا اور عظمت اللہ نے وہ راستہ جو جا کر بیچ شہر میں نکلتا تھا۔

نہ اخباروں میں اس واقعے کی اطلاع چھپی نہ اس کے بعد ان تینوں دوستوں کا ایک دوسرے سے ملنا ہُوا۔

۲

اس بات کو عرصہ بیت گیا۔ عاشق حسین کے لڑکے بڑے ہوئے، پڑھ لکھ کر نوکریوں پر لگ گئے۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کئی تبادلوں کے بعد جن میں عاشق حسین نے مختلف شہر دیکھے۔ آخر وہ باعزّت طور سے ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور اپنے آبائی شہر میں جا کر رہنے لگے۔ اب ان کا وقت گھر پر پالی ہوئی چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کی دیکھ بھال میں لگتا تھا۔ اور جب نواسے، نواسی گھر آجاتے تھے تو اُن سے دل بہلانے میں۔ شام کو گھر کے باہر وہ مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور محلّے کے آتے جاتے لوگوں سے علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔ کوئی ان سے اپنی نوکری کے لیے انگریزی میں درخواست لکھواتا تو وہ خندہ پیشانی سے یہ کام کر دیتے اور اگر کوئی عورت ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے اُن سے کہتی، 'چچا گھر میں کوئی ہے نہیں، آپ کسی سے دہی منگوا دیجیے' یا کچھ اور، تو وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے، 'کسی اور سے کیوں، میں خود لائے دیتا ہوں'۔

وہ اپنی رِٹائرمنٹ کی زندگی سے مطمئن تھے اور باوجود اتنے سال اپنے شہر سے دُور رہنے کے انھوں نے ان گنت دوست بنا لیے تھے۔ ہاں ان میں نہ کوئی شطرنج سے دِل چسپی رکھتا تھا نہ شکاری تھا۔ جب اُن کا جی شطرنج کھیلنے کو چاہتا تھا تو یا تو انھیں دُور ایک محلّے میں جانا پڑتا تھا یا پھر اپنی شطرنج کی کتاب لے کر بیٹھ جاتے تھے جس میں دنیا بھر کی مشہور بازیاں درج تھیں اور جن کی چالوں کو دونوں طرف سے کھیل کر پُوری بازی کا لُطف اٹھایا جا سکتا تھا۔

برسات کی شام تھی، بادل برس کر کھل گئے تھے۔ دُور کے آسمان پر ہلکی سی روشنی کی لہر دوڑ جاتی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ شاید ابھی وہاں بارش ہو رہی ہے یا شروع ہونے والی ہوگی۔ اچانک ان کی نظر ایک لمبے سے آدمی پر پڑی جو انھی کی طرف چلا آرہا تھا۔ عاشق حسین کے مکان کے پاس پہنچ کر اُس نے کہا، "جی، یہ مکان ....؟"

ابھی اس کی بات اُدھر ہی میں تھی کہ مونڈھے پر بیٹھے ہوئے شخص نے اُٹھتے ہوئے کہا، "میرا ہے اور میں عاشق حسین ہُوں"۔

لمبے آدمی نے کہا، "تم عاشق حسین ہو؟"

"ہاں، اور تم مسعود خان ہو!"

"پہچان گئے؟" مسعود نے پھُولی ہوئی سانس سے کہا۔

"کیوں نہیں پہچانتا! یا جب ہی پہچانتا جب تمھارے ہاتھ میں بندوق ہوتی، کندھے پر شکار کا تھیلا اور آج سے تیس سال پہلے کا چہرہ لیے تم میرے پاس آتے۔ اتفاق سے ادھر آنکلے ہو یا مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے آئے ہو؟"

مسعود نے کہا، "ڈھونڈتا، ڈھونڈتا"۔

پھر دونوں پچھلے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ اسکول کے قصّے، شرارتیں اور ایک دوسرے سے بچھڑنے کے بعد کس پر کیا کیا گزری تھی ایک دوسرے کو سنانے لگے۔ مسعود کے بھی جگہ جگہ تبادلے ہوئے تھے، ان کی بیوی مر چکی تھیں۔ ایک لڑکا انگلینڈ میں تھا، دوسرا یوربی افریقہ میں۔ لے دے کے ایک نیم اپاہج بیوہ بہن رہ گئی تھی اور دونوں ساتھ رہتے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے انھیں عاشق حسین کے تبادلوں کی اطلاع ملتی رہی تھی کہ اب وہ فلاں اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر ہیں، اب فلاں پر۔ اور آج وہ انھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آنکلے تھے۔ عاشق حسین نے پوچھا کہ "بستر بند کہاں ہے؟ سامان کہاں ہے؟"

مسعود نے کہا، "رات کو رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔ چھوٹی لائن سے گھنٹے بھر ہی کا تو سفر ہے۔ دو گھڑی بیٹھ کر چلا جاؤں گا، اور اب تو مِلنا جُلنا رہے ہی گا"۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کو احساس ہوا کہ اِدھر اُدھر کی باتیں تو اُنھوں نے بہت کی ہیں، لیکن کوئی بات اُن کے درمیان ایسی بھی ہے جسے نہ ایک چھیڑنا چاہتا ہے نہ دوسرا۔ اندر بیٹھک میں چائے پیتے ہوئے عاشق حسین نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا، "شکار اب بھی کھیلتے ہو یا ـــــ"

"تب ہی چھوڑ دیا تھا"۔

"کب؟"

مسعود کے سینے میں وہی گھبراہٹ ہوئی جو گھنٹہ بھر پہلے عاشق حسین کے یہ کہنے پر ہوئی تھی کہ کیا تمھیں جب ہی پہچانتا جب تمھارے کندھے پر شکار کا تھیلا ہوتا اور ہاتھ میں بندوق۔ اچانک مسعود خان نے پُرجوش لہجے میں کہا، "میں اس دن کی بات کو دماغ میں لانا نہیں چاہتا"۔

"جب حقیقت ہے تو دماغ میں آتی تو ہوہی گی"۔

"تمھارے آتی ہے؟" مسعود خان نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، جب سے لے کر آج تک ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب اس عورت کی لاش میرے ذہن میں نہ آئی ہو۔ بے چاری اچھی خاصی جوان تھی"۔

"بچّوں والی ہوگی"۔ مسعود خان نے کہا۔

"معلوم نہیں اسے گھر پہنچ کر کیا کرنا ہوگا۔ شاید وہ تالاب سے پانی بھر کر گھر لے جاتی۔ لکڑیوں کا گٹّھا اس کے ساتھ تھا"۔

"شاید گھر جا کے کھانا پکاتی"۔

دونوں بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئے۔ پھر عاشق حسین نے خفیف ہو جانے والی ہنسی کے ساتھ کہا، "اب ہم میں سے قسم کون توڑے گا"۔

"یہاں تیسرا ہے کون جو عظمت اللہ کا نام لینے سے ہماری قسم ٹوٹ جائے اور اب تو شاید وہ مر بھی گیا ہوگا"۔

"یہ تم نے کیسے جانا کہ وہ مر گیا" عاشق حسین نے کہا۔

مسعود خان نے کرسی پر پیچھے سر کو ٹیکتے ہوئے کہا، "جس حال میں اسے دیکھا تھا

اس لحاظ سے تو اُسے کب کا مر جانا چاہیے تھا"۔
"تم نے اُس دن کے بعد اُسے پھر دیکھا تھا؟" عاشق حسین نے بے چینی کے ساتھ کہا۔
"ہاں اس حادثے یا سانحے کے تقریباً سال بھر بعد۔ وہ خود میرے گھر آیا تھا"۔
"کچھ اس کے دل میں ملال تھا؟ اللہ کا خوف؟ یا وہی عظمت اللہ کا عظمت اللہ تھا، ماسٹروں کی پٹائی کرنے والا، ہر اُڑتی چڑیا کو نشانہ بنانے والا"۔ عاشق حسین نے کہا۔
"اور آدمی کو بھی"۔
"کِس حال میں تھا؟ تمھارے سامنے پھر کوئی قسم وَسم کھائی یا تمھیں قسم دی؟ بندوق تھی ساتھ میں؟"
"بے چارے کے ہاتھ ہی نہیں رہے تھے"۔
"ارے!" عاشق حسین کے مُنھ سے بے ساختہ نکلا۔
تھوڑی دیر بعد مسعود خان، عظمت اللہ کی روداد عاشق حسین کو سُنا رہے تھے:۔
"سال بھر ہی میں بالکل لٹک گیا تھا۔ پہچان میں نہیں آتا تھا۔ چہرے پر جگہ جگہ ایسے سفید داغ تھے جیسے برص کے مریضوں کے ہوتے ہیں اور دونوں ہاتھ بانہوں پر سے اس طرح کٹے ہوتے تھے کہ ٹھنٹھ رہ گئے تھے جنھیں وہ کہنیوں پر حرکت دے سکتا تھا۔ کہہ رہا تھا 'میں اِن سے اپنا کام چلا لیتا ہوں، گلاس میں گھڑے صراحی سے اُنڈیل کر پانی پی سکتا ہوں، اور کیا چاہیے'۔ بتا رہا تھا کہ بیوی نے اپنے میکے بھاگ جانا بند کر دیا تھا، جس پر اُسے رونا آتا تھا کہ اب میں اتنا گیا گزرا ہو گیا ہوں کہ غصّہ آتا ہے، لیکن مجھ پر ترس کھا کر بیوی گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی تک نہیں دیتی۔ بچے ڈانٹ کھاتے ہیں، لیکن بُرا نہیں مانتے"۔ لیکن جب میں نے چاے پیش کی تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا 'چاے سے سینے میں جلن ہوتی ہے اور نیند بھاگ جاتی ہے'۔ میں نے کہا 'ٹھنڈا منگا دوں؟' وہ اسے بھی ٹال گیا۔ حتیٰ کہ پانی کا گلاس بھی ویسے کا ویسا ہی دھرا رہا۔ میں نے اس عورت کا ذکر نہیں

چھیڑا اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھا جز بز ہوتا رہا۔ پھر اس سے نہیں رہا گیا اور بولا، "تم نے میرے ہاتھ کٹنے کے بارے میں نہیں پوچھا ؟"

میں نے کہا، "تم نے خود ہی بتادیا کہ حادثے میں کٹ گئے اور تم بجائے مایوسی کا شکار ہونے کے انہی ہاتھوں سے اپنا سب کام کررہے ہو۔ پھر یہ کہ میں پوچھ کر تمھارا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا"۔

حقیقت میں سال بھر سے جو اُس پر غصّہ اندر اندر سے کھائے جارہا تھا، اس کی یہ حالت دیکھ کر پگھل گیا تھا اور اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی تھی۔ پھانسی چڑھنے والے مجرم پر تو سب ہی کو ترس آتا ہے خواہ اس نے کتنے ہی قتل کیے ہوں، کتنی ہی آگیں لگائی ہوں، اغوا کیے ہوں۔ میں اُس کی اُن ٹھنٹھ بانہوں کو دیکھتے ہوئے کترا رہا تھا، لیکن اندر سے ایک جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے جلد از جلد چلا جائے، دوسرا جی چاہ رہا تھا پوچھوں، یہ سب کیسے ہوا ؟ وہ شاید میرے پاس اپنا دل ہلکا کرنے آیا تھا، کیوں کہ اس واقعے کا ذکر نہ اپنی بیوی بچّوں سے کیا ہوگا نہ کسی دوست سے۔ اور ایسی بات آدمی لاکھ قسم کھائے زیادہ دیر اپنے دل میں نہیں رکھ سکتا۔ اُس نے کہا، "تم نہیں پوچھتے تو، لو میں خود بتائے دیتا ہوں :

' اس دن کے بعد سے تم دونوں تو کہیں غائب ہو گئے تھے۔ میں نے بھی بندوق کو دوبارہ ہاتھ میں نہ لینے کی قسم کھائی تھی، بلکہ اُس بکسے کی طرف دیکھتے مجھے ڈر لگتا تھا جس میں بندوق رکھی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ایک آدمی کو عاشق حسین کی شن گن لینے کو بھیجا، لیکن اس نے آکر بتایا ان کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ تم سے ملنا چاہا تو یا تو تم گھر پر نہیں تھے یا بہانہ بنا دیا کہ گھر پر نہیں ہیں۔ میری خاموشی بڑھتی جارہی تھی اور اس خاموشی سے بیوی بچّے سب تنگ آچکے تھے۔ دو ایک بار بیوی نے مجھ سے پوچھا، " آپ کے شکاری دوست اب نہیں آتے ؟' میں ٹال گیا۔ پھر خود ہی ایک دن، یہی موسم تھا، میں نے جی میں ٹھان لی اس طرح تو میں ساری زندگی من مارے چپ نہیں رہ سکتا۔ باہر نکلوں گا، بلکہ شکار کو بھی جاؤں گا۔ ایک

صبح ہلکی ہلکی بُوندیوں میں بندوق اور کھانے کے لیے کچھ اَلّم غلّم لے کر میں شکار کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ راستے سب کے سب دیکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ راستہ چُنا جس پر گاؤں نہیں پڑتے ہیں اور سیدھا درختوں کے بن میں جا کر نکلتا ہے۔ خیال تھا اگر تیندوا یا ریچھ مل گیا تو اس کو گھر لانے کا انتظام کرنے اور پھر کھال کو بنوانے اور گھر میں سجانے میں ہفتے بلکہ مہینے نکل جائیں گے اور میں اس حادثے کو بھول جاؤں گا اور ہُوا بھی ایسا ہی۔ میں گھنے درختوں کے بیچ میں سے گزر رہا تھا کہ ایک پہاڑی نالے پر مجھے تیندوا پانی پیتا نظر آیا۔ فاصلہ زیادہ تھا، لیکن پھر بھی میں نے اس پر فائر کر دیا۔ تیندوا تو خیر ایک ہی جست میں نالے کو پھلانگ کر جنگل میں غائب ہو گیا، لیکن مجھ پر قیامت پھٹ پڑی۔ مجھے اپنے پیچھے سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کا بچّہ تھا اور ہتھنی بھی شاید وہیں کہیں تھی۔ پھر بغیر مُہلت دیے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے کسی درخت پر چڑھ جانا چاہا، لیکن سب ہی کے تنے سیدھے اور پھسلواں تھے۔ بھاگتے میں بندوق میرے ہاتھ سے گر گئی۔ ہاتھی کی چنگھاڑوں سے جنگل گونج رہا تھا اور میرے پاؤں مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے۔

اِسے خوبیِ قسمت کہوں یا شومیِ بخت کہ وہاں مجھے اپنے راستے میں ایک ایک کنواں نظر آیا، کچا کنواں۔ ہاتھی میرے پاس پہنچ چُکا تھا اور میں اس کی سُونڈ کی زد میں تھا۔ میں نے بغیر دیکھے بھالے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ حال آنکہ کسی اور موقعے پر میں ایسے کنوئیں کا پانی بھی نہ پیتا۔ کنواں اُتھلا تھا۔ اس کی تلیٹھی میں بس اتنا پانی تھا کہ کہیں میرے ٹخنوں اور کہیں میرے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ میں نے دِل میں سوچا یہ بھی غنیمت ہے، کیچڑ اور پانی کی وجہ سے گرنے سے میرے چوٹ نہیں آئی تھی۔ سورج کی روشنی کنوئیں میں پڑ رہی تھی اور میں دیوار کا جائزہ لے رہا تھا کہ جب خطرہ ٹل جائے گا تو کیسے باہر نکلوں گا۔ باہر خیریت سے نکلنے کا امکان قوی تھا، کیوں کہ دیوار

میں جگہ جگہ درختوں کی جڑیں پھوٹ آئی تھیں اور ایک جگہ پیپل کا ایک پودا بھی دیوار میں اُگ آیا تھا۔ کنوئیں میں سانپ بچھو بھی نہیں تھے۔

لیکن میرا اطمینان عارضی تھا۔ اچانک جیسے کسی نے سورج کی روشنی کو روک دیا۔ کنوئیں کے مَن پر ہاتھی کھڑا مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی کینہ پَرور آنکھیں میں نے زندگی میں نہیں دیکھی ہیں۔ پھر ہمّت کر کے میں نے ہنسنا چاہا کہ بچّہ! اب مجھے کیسے پکڑو گے! میں تمھاری پہنچ سے باہر ہوں، لیکن جب اُس نے اپنی سونڈ کو کنوئیں میں لٹکانے کے لیے اپنے اگلے گھٹنے کنوئیں کی من پر ٹیک دیے اور مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا تو مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں سب بھول گیا۔ نہ آیت الکرسی کے پہلے لفظ یاد آئے نہ کلمہ۔

ہاتھی اب ہر ہر رُخ سے مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اپنی محدود دنیا میں کبھی اِدھر کو ہو جاتا تھا کبھی اُدھر کو، کبھی بیٹھ جاتا تھا کبھی اُس کیچڑ میں لیٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ پھر ہاتھی اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر کنوئیں کے منھ پر کھڑا اپنی سونڈ اِدھر اُدھر کو جھلاتا رہا۔ ہم دونوں شاید ایک دوسرے کی نیت کو بھانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر میں نے اسے وہاں سے ہٹ جاتے دیکھا اور زمین پر پڑی ہوئی ٹہنیوں اور پتّوں کے چٹخنے کی آوازیں دُور تک سُنائی دیتی رہیں۔ وہ نا امید ہو کر واپس جا رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دِل میں کہا، اللّٰہ تیرا شکر ہے، لیکن اُسی لمحے کنوئیں میں ایک مٹّی کا تودا گرا اور پھر اوپر سے ہر چیز کی بارش شروع ہو گئی جو آس پاس کے جنگلوں میں موجود تھی۔ وہ دو قدم پیچھے کو ہٹتا تھا اور پھر مٹّی یا پتھر اندر پھینک کر کنوئیں کی مَن پر کھڑا ہو کر دیکھتا ابھی میں کتنی دور ہوں۔ کنواں تھوڑی دیر میں بھرنے لگا۔ وہ تھکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں کبھی ایک مٹّی کے ڈھیے پر کھڑا ہوتا کبھی کسی پتھر پر۔ ایک دفعہ اس نے ایک جھنگھاڑ کے ساتھ میری بندوق اندر پھینکی، لیکن اُسے اُس نے بھاری پاؤں کے تلے دبا کر نال کو چپٹا کر دیا تھا اور ٹریگر کے پاس سے پاؤں کے

نیچے دبا کر اپنی سونڈ سے دُہرا بھی کر دیا تھا۔
میرے لیے وقت اتنی تیزی سے کبھی نہیں گزرا ہے جتنا اُس دن۔ اب میں اس کی سونڈ کی پہنچ میں تھا۔ وہ کنوئیں کی مَن پر گھٹنے ٹیک کر پُورا جُھک گیا اور قریب تھا کہ وہ مجھے سونڈ سے پکڑے، لیکن اسی لمحے اس نے ایسی چیخ ماری جیسی میں نے کبھی نہیں سُنی ہے۔ پھر کنوئیں میں مکمّل اندھیرا چھا گیا۔ اور میں بے سُدھ ہو کر مٹّی کے تودوں پر گر پڑا۔
پتا نہیں کتنی دیر اُس حالت میں رہا۔ شاید تھکن سے مجھے نیند آگئی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ نیند خطرے کے ٹل جانے کی تھی۔ جب میری آنکھ کُھلی تو کنوئیں کے مُنھ پر ایک سیاہ پردہ پڑا تھا اور روشنی ایک کونے میں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ مجھے گمان ہوا کہ باہر ہوا چل رہی ہے، لیکن وہ پردہ ذرا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اپنی ٹوٹی ہوئی بندوق سے اُس پردے کو میں نے ہلانا چاہا، لیکن بجائے ہٹنے کے بندوق کی نال اس میں دھنس گئی اور جب میں نے اسے واپس کھینچ کر دیکھا تو وہ نم تھی۔ میں نے پتھروں اور مٹّی کے تودوں کو ایک دوسرے پر مار کر آواز پیدا کی، لیکن جواب میں نہ ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز آئی نہ کسی اور نے جواب دیا۔ میری ہمّت اب بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے وقفے وقفے سے پُکارنا شروع کیا اور ہر دفعہ زیادہ زور سے، لیکن خاموشی اپنی جگہ مکمّل تھی۔ کنوئیں میں اندھیرا بڑھ رہا تھا۔
آخر مجھے لگنے لگا باہر رات ہو گئی ہے اور اب یوں بھی باہر نکلنا بے سود تھا۔ ہو سکتا ہے باہر نکلتے ہی مجھے جنگلی کتّوں کا کوئی غول گھیر لیتا جو اُس علاقے میں بہت تھے۔ ہو سکتا ہے کوئی شیر ہی اس وقت اپنے شکار پر نکلا ہو اور میں اس کا نوالہ بن جاؤں۔ میں اپنے بچ جانے پر خوش تھا، لیکن بھوک کی آنتیں ستا رہی تھیں، لیکن نیند تو سُنا تھا سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح صبح کی اُمّید میں وہیں مٹّی کے ڈھیلوں پر سو گیا۔
جب میری آنکھ کُھلی تو دن خوب چڑھ آیا تھا اور مجھے لگا کنوئیں کے مُنھ

پر چھائے ہوئے سیاہ پردے میں سے موٹے موٹے دھاگے جگہ جگہ لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک بار پھر میں نے چیخ کر خود کو یقین دلایا کہ آس پاس کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ پھر مٹی کے ڈھیلوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اتنا اونچا کر لیا کہ اُس ڈھیر پر چڑھ کر میں ان دھاگوں کو گھسیٹ کر دیکھ سکوں کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ پہلا دھاگا میرے کھینچنے پر ٹوٹا نہیں، اُکھڑ کر پورا کا پورا میرے ہاتھ میں آگیا اور مجھے اس وقت ایک جھٹکا سا لگا جب ایک کونے میں سے آنے والی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھی کا بال تھا۔ گھبراہٹ میں میں نے چند اور بال گھسیٹے۔ سب کے سب جڑ سے اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آتے گئے اور چند ایک کے ساتھ کھال کا ٹکڑا اور گوشت بھی اُکھڑ کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ مجھے کنوئیں میں بدبُو کا احساس ہُوا، جیسا احساس سڑے ہوئے گوشت کا ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر بندوق کے کُندے سے اسی سڑے ہوئے گوشت کے تودے کو کنوئیں کے مُنھ پر سے ہٹانا شروع کر دیا۔ گوشت ٹُوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہا تھا اور کنوئیں میں بدبو پھیل رہی تھی۔ مجھے کئی بار اُبکائی آئی، لیکن میرے ہاتھ رُکے نہیں۔ یہاں سے جلد سے جلد نکل جانے میں میری سلامتی تھی۔

آخر جب میں باہر نکلنے میں کام یاب ہوگیا تو میں نے دیکھا میرا دشمن ایک پہاڑی کی طرح کنوئیں کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کا مُنھ کُھلا ہُوا تھا اور سُونڈ دور تک زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہ حالت تھی جس میں میرے خیال میں اُس نے آخری چیخ ماری ہو گی اور پھر دھماکے کے ساتھ زمین پر گرا ہو گا۔ جس طرف سے میں نے اپنے لیے راستہ پیدا کیا تھا وہ اس کی ایک اگلی ٹانگ تھی جو اس وقت کھال اور گوشت کے اُدھڑ جانے کی وجہ سے ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی عمارت کے ایک ستون کو ہینڈ گرنیڈ نے توڑ کر رکھ دیا ہو۔

میرے ہاتھوں میں بے چینی ہو رہی تھی۔ رکاوٹ کو ہٹانے کی کوشش میں وہ بار بار ہاتھی کے گوشت کے اندر تک دھنس گئے تھے اور اب وہی بدبو

اس پہاڑ جیسی لاش سے آرہی تھی مجھے اپنے ہاتھوں سے بھی آتی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے لاش کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا کہ یہ کس کی کارستانی تھی۔ کسی کے گولی چلانے کی آواز میرے کان میں نہیں آئی تھی۔ نہ چیخ سے پہلے میں نے کسی دوسرے درندے کی آواز سُنی تھی۔ پھر یہ بپتا میرے دشمن پر کیسے پڑی۔ اچانک میری نظر ہاتھی کے سینے پر پڑی جسے آخر میں وہ زمین پر ٹیک کر سر کو کنوئیں میں لٹکا کر مجھ تک اپنی سُونڈ سے پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں ایک بھورے رنگ کا بچھّو مرا پڑا تھا۔ میں دَم بخود رہ گیا۔ ہاتھی کے وہاں سے ٹل جانے کے دو گھڑی بعد اگر میں کنوئیں سے باہر نِکلا ہوتا تو شاید میں بھی اُس وقت ایک گلے ہوئے گوشت کے انبار کی طرح یہاں پڑا ہوتا۔ میں نے سُن رکھا تھا بھورے بچھّو، سیاہ بچھّوؤں سے چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے بعض بعض اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ شاید اگر پتّھر میں ڈنک مار دے تو وہ بھی کھیل کھیل ہو جائے۔

کُنوئیں کی من پر جُھکتے ہوئے ہاتھی کے سینے نے بچھّو پر دباؤ ڈالا ہوگا۔ اس نے غصّے میں ڈنک مار دیا۔ زہر سے ہاتھی پہلے وہیں اس طرح ڈھیر ہوگیا ہوگا کہ بچھّو کُچلا گیا اور پھر ایک طرف کو لُڑھک کر اس کا پُورا کا پُورا جسم کنوئیں کے منھ پر چھا گیا۔

میرے ہاتھوں میں اب زوروں سے کُھجلی ہورہی تھی۔ آس پاس مجھے کوئی پہاڑی نالا نظر نہیں آیا جس پر ہاتھ دھو لیتا۔ جنگل سے باہر نکل کر مجھے دریا سے تھوڑے فاصلے پر وہ کنواں نظر آیا جس کے پانی سے لاشیں جلانے کے بعد ہندو نہاتے تھے۔ اس کی پُختہ مَن پر ڈول بھی رکھا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر شمشان تھی، لیکن بُجھی ہوئی۔ مجھے آس پاس کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔

میں نے پانی کا پہلا ڈول نکالا اور اس سے اپنے ہاتھوں کو دھویا۔ پانی میں سے ایسی بِسانند آرہی تھی جیسی پانی میں مچھلی کے سڑ جانے کے بعد آتی ہے۔ پھر میں ڈول کے ڈول پانی کے نکالتا گیا اور صابن کی جگہ مٹّی سے اپنے ہاتھوں کو

رگڑ رگڑ کر دھوتا رہا، لیکن کھجلی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کھال پر جگہ جگہ چھالے اُٹھ آئے تھے۔ پیاس سے میرے ہونٹ تڑخ رہے تھے، لیکن جب میں نے ہاتھ صاف کر لینے کے بعد ڈول کا پانی پیا تو مجھے اُلٹی ہوگئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے دوپہر ہوگئی۔ سب رات بھر میرے گھر سے غائب رہنے پر پریشان تھے اور اب جو میرے سُوجے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو بھونچکا ہو کر میری صورت کو دیکھنے لگے۔

ساتویں یا آٹھویں روز مُکتی فوج کے ہسپتال میں ایک انگریز ڈاکٹر نے میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو گینگرین بڑھتے بڑھتے بازوؤں تک پہنچ جائے گی اور پھر زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا''۔

مسعود خان نے اُٹھتے ہوئے کہا، ''چھوٹی لائن کی گاڑی کا وقت ہوگیا ہے، مجھے چلنا چاہیے''۔ پھر اُٹھتے ہوئے اُنھوں نے کہا، ''میں تمھیں یہ قصّہ سُنانے نہیں آیا تھا۔ بے وجہ باتوں میں بات نکل آئی۔ یقین مانو عظمت اللہ کو اس حالت میں دیکھ کر کئی دن کھانا میرے حلق سے نہیں اُترتا تھا''۔

عاشق حسین نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا، ''یہی حال میرا ہوگا۔ پھر تمھیں وہ کبھی نظر آیا؟''

''نہیں تمھاری طرح میرے بھی تبادلے ہوتے رہے۔ کئی بار خیال آیا خط لکھوں، لیکن یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ بے چارے کو کسی اور سے خط لکھوانا پڑے گا''۔

جب دونوں دوست اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے تو مسعود خان نے کہا، ''میری عقل آج تک اس واقعے کو ماننے کو تیّار نہیں ہے''۔ عاشق حسین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا، ''میرا دل نہ ماننے کو تیّار نہیں ہے''۔

دونوں ہنس پڑے۔

• • •

سمندری موجیں

ڈاکٹر سہیل برکاتی

یہ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے۔ موسم سرما کی ایک صبح ہالینڈ کے باشندوں کے لیے تباہی و بربادی کے لیے طلوع ہوئی۔ ہالینڈ کی دل فریب و حسین سرزمین کے ایک بڑے حصّے پر سمندر کے پانی نے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ بہار کے پھولوں کی کاشت کے لیے مشہور سر سبز میدان پانی میں ڈوب گئے تھے۔ سمندر کا یہ پانی اُس طوفان کے نتیجے میں آیا تھا جس کی وجہ سے سمندر کی سطح عام سطح کے مقابلے میں تین میٹر زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ یہ کہنا چاہیے کہ سمندر اپنا غیظ و غضب ڈھا رہا تھا اور اس کی موجیں تباہی پھیلا رہی تھیں۔

سمندر کا ذکر ہو تو موجوں کی بات ضرور ہوتی ہے۔ موجوں کی ایک قسم تو وہ تھی جس نے ہالینڈ میں تباہی پھیلا دی۔ لیکن اس کی دوسری قسمیں انسان کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔ جو لوگ سمندر میں پائے جانے والے جانوروں کو اپنی معاش کا ذریعہ بناتے ہیں، ماہی گیر کہلاتے ہیں۔ ان کے لیے سمندر کی موجوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ ماہی گیر کشتی پر ساحل سے روانہ ہونے کے لیے ایسے وقت کا انتظار کرتے ہیں جب پانی چڑھاؤ پر ہو اور ساحل پر اوپر تک آیا ہوا ہو۔ اسی طرح واپس آنے کے لیے بھی اونچے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بندرگاہیں بناتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کُھلے سمندر سے بندرگاہ تک آنے والا راستہ اتنا گہرا ہو کہ بڑے جہاز آسانی کے ساتھ اندر آسکیں۔ اس کے علاوہ بندرگاہ کے راستے اور ساحل سمندر پر بہ کر آجانے والے کوڑا کرکٹ اور غیر ضروری چیزوں کو بھی صاف کرتے رہنا چاہیے تاکہ جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت میں رُکاوٹ نہ ہو۔

سمندر کا پانی ساحل پر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ پانی ایک دن میں دو مرتبہ ساحل پر کافی اوپر تک آتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ اُتار چڑھاؤ کا یہ سلسلہ مستقل جاری رہتا ہے۔ ایک وقت وہ ہوتا ہے جب سمندر کا ساحل پانی سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ آپ

ساحل پر کافی دُور تک چہل قدمی کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ٹھیک اُسی جگہ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ سمندر کے پانی کا یہ اُتار چڑھاؤ کس وجہ سے ہے۔ اس سوال کے جواب کا تعلق چاند، زمین اور سورج کے درمیان کشش سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کشش کا اثر دنیا کی ہر چیز پر پڑتا ہے۔ لیکن ٹھوس چیزوں پر یہ اثر زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔ سمندر کا پانی چوں کہ حرکت میں رہتا ہے اس لیے سمندر پر اس کشش کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ اس اثر کے نتیجے میں سمندر کے پانی میں اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے، جسے مدّوجزر کہتے ہیں۔

تصویر ۱

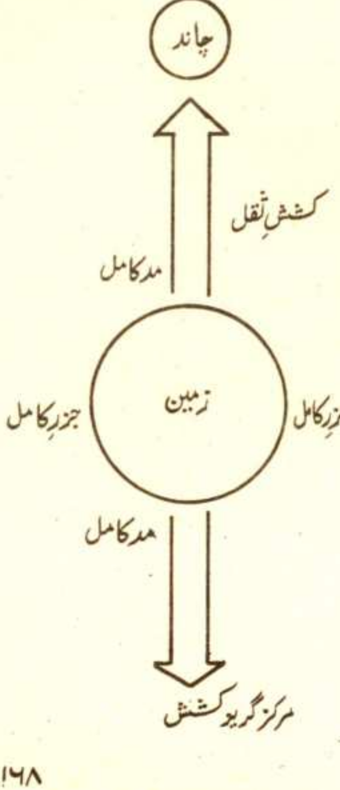

آپ کو معلوم ہے کہ چاند کا سائز سورج کے مقابلے میں کم ہے۔ لیکن چاند چوں کہ زمین سے قریب ہے اس لیے زمین پر اس کی کشش کا اثر سورج کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

آپ کو یہ بات بھی معلوم ہو گی کہ چاند زمین کے گرد چکّر لگاتا ہے۔ چاند کی کشش کا اثر زمین کے اس حصّے پر زیادہ ہوتا ہے جو اس کے بالکل سامنے ہو۔ اس کے نتیجے میں زمین کے اس حصّے پر موجود سمندر اور بڑے دریاؤں کا پانی چاند کی طرف کھنچتا ہے۔ اس طرح چاند کی طرف رُخ والے سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے اسے مدِّ کامل (HIGH TIDE) کہتے ہیں۔ (تصویر ۱) اس مقام پر پانی کی سطح اونچی ہو جاتی ہے۔ چاند چوں کہ زمین کے گرد مستقل گردش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ مدِّ کامل بھی چاند کے ساتھ چلتا ہے

تصویر ۲

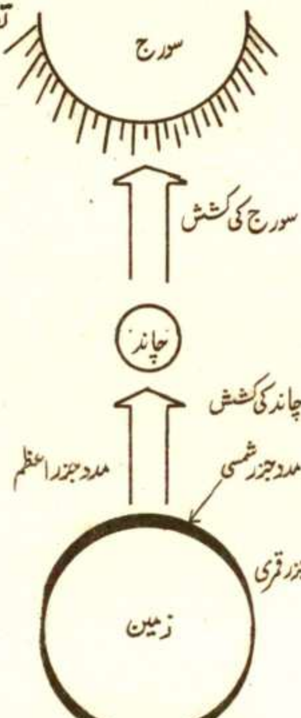

اور دنیا کے مختلف حصّوں میں مدِّ کامل پیدا ہوتا ہے۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ مدِّ کامل سمندر میں اُس سمت میں تو پیدا ہوتا ہی ہے جو چاند کی طرف ہو لیکن ساتھ ہی اس کے بالکل مخالف سمت میں موجود سمندر میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سمندر میں مدّوجزر کی ذمے دار صرف چاند اور زمین کے درمیان کشش نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو زمین اور چاند ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے جاتے اور ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ ایک ایسی قوت بھی موجود ہے جو اس کشش کی مخالف سمت میں عمل کر رہی ہے اور ان دونوں کو ٹکرانے سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس قوت کو مرکز گریز (CENTRIFUGAL) (تصویر ۲) کہتے ہیں یعنی ایسی قوت جو مرکز کی مخالف سمت میں عمل کرتی ہے۔ اگر آپ ایک رسّی لے کر اپنے چاروں طرف گھمائیں تو جو قوت اُسے آپ سے دُور رکھے گی وہ مرکز گریز قوت ہے۔ چاند اور زمین بھی اسی طرح ایک دوسرے کی گرد گھومتے ہیں۔ دو قوتیں ایک ساتھ عمل کرتی ہیں۔ کشش کی قوت دونوں کو ایک دوسرے کی جانب کھینچتی ہے اور مرکز گریز قوت ایک دوسرے کو قریب آنے سے روکتی ہے۔ اس طرح دونوں قوتوں کے ایک ساتھ عمل سے توازن پیدا ہوتا ہے۔

تصویر ۳

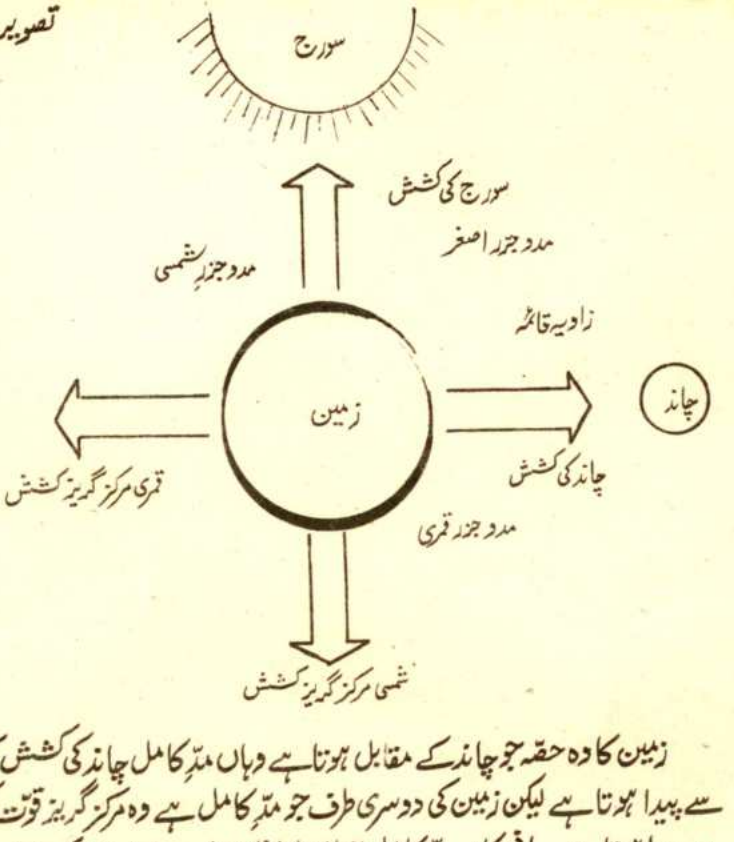

زمین کا وہ حصہ جو چاند کے مقابل ہوتا ہے وہاں مدِّ کامل چاند کی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن زمین کی دوسری طرف جو مدِّ کامل ہے وہ مرکز گریز قوت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ پانی کا یہ مدِّ کامل اتنا ہی اونچا ہوتا ہے جتنا چاند کی جانب والے سمندر کا۔ جس وقت زمین کی دو سمتوں میں مدِّ کامل ہوتا ہے ٹھیک اسی وقت بقایا دو سمتوں یعنی چاند سے زاویۂ قائمہ والی سمتوں میں جزرِ کامل (LOW TIDE) ہوتا ہے۔ (تصویر ۱) یعنی یہاں پانی کی سطح بہت کم ہو جاتی ہے۔ دراصل مدِّ کامل والے حصّوں میں پانی جزرِ کامل والے حصّوں سے سمٹ کر جاتا ہے۔ چاند زمین کے گرد ایک چکّر ۲۴ گھنٹے ۵۰ منٹ میں لگاتا ہے۔ اس طرح مدِّ کامل ہر بارہ گھنٹے ۲۵ منٹ بعد پیدا ہوتا ہے۔

سمندر میں مدوجزر پیدا ہونے میں چاند کے علاوہ سورج کا بھی حصہ ہے۔ یہ حصہ چاند

کے مقابلے میں تقریباً نصف کے برابر ہے۔ سورج بھی چاند کی طرح سمندر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند اور سورج دونوں ایک ہی سمت میں ہوتے ہیں اور جب یہ دونوں مل کر پانی کو کھینچیں تو ظاہر ہے کہ پانی کی سطح بہت بلند ہو جائے گی، جسے مدوجزر اعظم (SPRING TIDE) کہتے ہیں۔ (تصویر ۲) اس غیر معمولی مدّو جزر میں جہاں پانی کی سطح بہت بلند ہوتی ہے وہاں پانی کے اُتار کے وقت جزر کامل بھی بہت کم ہو جاتا ہے۔ یعنی پانی بہت دُور تک پیچھے چلا جاتا ہے، پانی کی سطح بہت نیچے چلی جاتی ہے۔ یہ غیر معمولی مدو جزر ایک قمری مہینے یعنی ۲۷ ۱/۳ دن میں دو مرتبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب سورج اور چاند ایک ہی سمت میں ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے زاویۂ قائمہ پر ہوں تو اس کے نتیجے میں چھوٹی لہریں پیدا ہوتی ہیں جنھیں مدِّوجزر اصغر (NEAP TIDE) کہتے ہیں۔ (تصویر ۳) یہ بھی ایک قمری مہینے میں دو مرتبہ آتی ہیں۔

دنیا کے مختلف حصّوں میں مدو جزر مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ بحرِ اوقیانوس میں مدو جزر باقاعدگی کے ساتھ ایک دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ جب کہ بحرالکاہل کے بعض جزیروں میں دن میں دو مرتبہ مدِّ کامل اور ایک مرتبہ جزر کامل ہوتا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں سمندر میں اُتار چڑھاؤ کو مشکل ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چاند اور سورج کے ذریعہ سے پیدا ہونے والے مدّو جزر کی وجہ سے سمندر کے پانی میں بعض اوقات اتنی قوّت پیدا ہو جاتی ہے کہ سمندر کا پانی دریا میں دُور تک چلا جاتا ہے اور بعض مقامات پر جب یہ پانی واپس آتا ہے تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے آبشار کی مانند چٹانوں پر گرتا ہے۔ بعض مرتبہ سمندر کی تہ میں پیدا ہونے والے زلزلے سے بھی پانی میں طوفان پیدا ہو جاتا ہے جنھیں جاپانی زبان میں (TSUNAMI) کہتے ہیں۔

مستقبل میں سائنس دانوں کا پروگرام ہے کہ مدو جزر کے نتیجے میں پانی میں جو قوّت پیدا ہوتی ہے اس کو توانائی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ مدِّ کامل کے نتیجے میں جو پانی سمندر سے نکل کر دریا میں دُور تک چلا جاتا ہے اس کو بند باندھ کر واپس سمندر میں جانے سے روکنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اس سے بجلی پیدا کی جا سکے۔ اُمید ہے کہ سمندر کے ساحل پر ٹکریں مارنے والی موجوں کی قوّت سے انسان خوب فائدہ اُٹھا سکے گا۔

چاندی کے کُھر والا بکرا

معراج

بہت دن گزرے کسی گاؤں میں ایک بوڑھا شکاری رہتا تھا۔ اس کا نام دینو بابا تھا۔ اس کے بیوی بچے وبائی بیماری کا شکار ہوکر مر چکے تھے اور اب وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔

ایک دن وہ سوچنے لگا کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو میں اسے اپنا پیشہ سکھاتا اور وہ بڑا ہو کر میرا مددگار بنتا۔ اس نے اپنے ہمسایوں سے کہا، "مجھے کسی یتیم اور لاوارث بچے کا پتا بتائیں تاکہ میں اس کی پرورش کروں۔"

ایک ہمسائے نے کہا، "ابھی کچھ دن پہلے تمھارے دور کے رشتے دار ہاشم کا انتقال ہوا ہے۔ اس کی آٹھ یا نو سال عمر کی بچی یتیم اور بے سہارا ہو گئی ہے۔ اس کے چچا نے اپنے بھائی کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہی اس لڑکی کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کی

اپنی گزر بسر بھی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کی آمدنی تھوڑی ہے۔ بچے زیادہ ہیں۔ اس کی بیوی کا سلوک بھی بچّی کے ساتھ بہت بُرا ہے، وہ ہر وقت اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی ہے۔ اگر تم ان سے بات کروگے تو وہ خوشی سے بچّی تمھارے حوالے کر دیں گے۔"

بوڑھا دینو بابا بولا، "اگر لڑکا ہوتا تو بڑا ہو کر میرے لیے مددگار بنتا، لڑکی میرے کس کام کی؟"

ہمسایہ بولا، "ہاشم اور اس کی بیوی دونوں ہی بہت نیک دل تھے اور سب لوگوں سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔ خاص طور پر تمھارا تو بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ اگر تم ان کی بچّی کو اپنے گھر لے آؤگے تو تمھارے گھر میں رونق آ جائے گی۔"

دینو بابا بولا، "اس کا چچا لڑکی کو مجھے دینے سے انکار تو نہ کرے گا؟"

ہمسایہ بولا، "تم ان لوگوں سے بات تو کر کے دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خوشی خوشی بچّی کو تمھارے حوالے کر دیں گے۔"

اگلے دن دینو بابا قاسم کے گھر پہنچا۔ گھر میں بہت سے بچّے کھیل کود میں مصروف تھے۔ ان سے الگ تھلگ، ایک چھوٹی سی لڑکی اپنی مریل بلی سے کھیل رہی تھی۔ دینو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ نازیہ ہے۔

دینو نے قاسم سے کہا، "میں مرحوم ہاشم کی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

قاسم بولا، "اگر نازیہ آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

دینو بابا نازیہ کے پاس گیا اور بولا، "بیٹی نازیہ! کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کروگی؟"

نازیہ پریشان ہو کر بولی، "بابا جی آپ کون ہیں؟ میں تو آپ کو نہیں جانتی۔"

دینو بولا، "بیٹی! میں رشتے میں تمھارا دادا ہوں۔"

نازیہ بولی، "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

دینو بولا، "بیٹی، میں گرمیوں کے موسم میں دریاؤں کی مٹّی چھان چھان کر سونے کے ذرّے علاحدہ کرتا ہوں، سردیوں میں، میں چاندی کھُر والے بکرے کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔"

نازیہ نے پوچھا، "کیا آپ بکروں کا شکار کرتے ہیں؟"

دینو بابا بولا، "ارے نہیں بٹیا، میں چاندی کُھر والے بکرے کو زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلوگی تو میں تمھیں بہت سی باتیں بتاؤں گا۔"

نازیہ کو بھی چاندی کُھر والے بکرے میں دل چسپی محسوس ہوئی اور پھر بابا خود بھی تو بہت نیک اور مہربان دکھائی دیتا تھا، وہ بولی، "میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میں پوسی کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔ یہ بہت اچھی بلّی ہے اور مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔"

بابا نے کہا، "تمھاری بلّی تو مجھے بھی پسند آئی ہے۔"

یوں لگتا تھا کہ جیسے بلّی بھی ان کی باتیں سمجھتی ہو۔ وہ اپنا جسم بوڑھے بابا کی ٹانگوں سے رگڑنے اور میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ بابا دینو، نازیہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ دونوں اکٹھے رہنے لگے۔

دن گزرتے گئے۔ بوڑھا دینو اپنے کام پر چلا جاتا۔ نازیہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ شام کے وقت دینو بابا گھر واپس لوٹتا۔ وہ نازیہ کو بہت دل چسپ اور عجیب کہانیاں سنایا کرتا۔ نازیہ بہت دل چسپی سے یہ باتیں سنا کرتی۔ بلّی اس کی گود میں آنکھیں موند کر لیٹ جاتی اور دھیمی دھیمی آواز میں میاؤں میاؤں کرتی رہتی۔ جونہی کوئی کہانی ختم ہو جاتی نازیہ کہتی، "دادا، آپ مجھے چاندی کُھر والے بکرے کی کہانی سنائیے نا!"

بوڑھا کہتا، "چاندی کُھر والا بکرا ایک خاص قسم کا بکرا ہے اس کا قد تو عام بکروں جیسا ہی ہے لیکن وہ دیکھنے میں بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ اس کے سینگ پنج شاخہ ہوتے ہیں۔"

نازیہ پوچھتی، "اس کا رنگ کیسا ہے دادا ابا؟"

دینو کہتا، "اس کا رنگ گرمیوں میں تو بھورا ہوتا ہے لیکن سردیوں میں دودھیا سفید ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم سے بھینی بھینی خوش بو آتی ہے۔"

نازیہ نے پوچھا، "دادا اسے چاندی کُھر والا کیوں کہتے ہیں؟"

دینو نے کہا، "بٹیا، اس بکرے کے کُھر چاندی جیسے چمک دار سفید رنگ کے ہیں۔

جب وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتا ہے تو اشرفیاں گرتی ہیں۔ وہ جتنی بار زمین پر پاؤں مارتا ہے اتنی ہی اشرفیاں زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہیں۔"

دینو بابا نے کہانی سنا تو دی تھی لیکن بعد میں وہ بہت پچھتایا، کیوں کہ نازیہ اب چاندی کھر والے بکرے کے علاوہ کوئی بات ہی نہ کرتی تھی۔

جب خزاں کا موسم آیا تو دینو بابا نے چاندی کھر کی تلاش میں جانا چاہا۔ نازیہ نے کہا دادا، آپ مجھے بھی ساتھ لے چلیے میں بھی چاندی کھر والے بکرے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

دینو بابا بولا، بیٹی، تم اسے پہچان نہ سکوگی، کیوں کہ خزاں کے موسم میں سب بکرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن سردیوں کے موسم میں چاندی کھر کو پہچاننا بہت آسان ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا بابا چلا گیا۔ پانچ دن بعد وہ واپس لوٹ آیا۔ اس نے کہا، "کچھ جنگلی بکروں کو جنگل میں چرتے دیکھا گیا ہے ممکن ہے کہ چاندی کھر والا بھی ان میں سے ایک ہو۔ اس لیے میں سردیوں کا موسم وہیں گزاروں گا۔"

نازیہ بولی، "آپ وہاں شدید سردی میں کیسے رہیں گے؟"

بابا دینو بولا، "وہاں میں نے ایک چھوٹا سا گھر بنایا ہوا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا آتش دان ہے جس میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔ باہر کا نظارہ کرنے کے لیے ایک کھڑکی ہے۔ میں وہاں بہت مزے میں ہوں۔"

نازیہ نے پوچھا، "وہاں چاندی کھر والا بکرا بھی گھاس چرنے آئے گا؟"

بابا بولا، "بیٹی کون جانے کہ وہ آئے یا نہ آئے؟"

جب سردیوں کا موسم آیا تو دینو بابا جنگل میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ نازیہ بھی اس کے ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگی بابا دینو بولا، "تم وہاں جا کر کیا کروگی؟ وہاں سخت سردی پڑتی ہے۔ ڈھیروں برف جمع ہو جاتی ہے اگر تم برف میں دب گئیں تو کیا ہوگا؟"

نازیہ بولی، "بابا میں چاندی کھر والے بکرے کو صرف ایک بار دیکھنا چاہتی

ہوں۔"

بابا دینو نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن نازیہ اس کے ساتھ چلنے کی ضد کرتی رہی۔ آخر دینو بابا بھی مان گیا۔ اس نے کہا، "اچھا تم میرے ساتھ چلو، لیکن وہاں جاتے ہی رونا دھونا مت شروع کر دینا اور گھر واپس چلنے کی ضد بھی نہ کرنا۔"

جب سردی کا موسم اپنے عروج پر پہنچا تو بابا نے کھانے پینے کا سامان اور ضرورت کی دوسری چیزیں گاڑی پر لادیں۔ نازیہ نے بھی اپنی کتابیں، گڑیاں اور کھلونے ایک ٹوکری میں بند کر کے ساتھ لے لیے اس نے بلّی کو بہت سا پیار کیا اور بولی:

"پوسی ہم بہت جلد واپس آجائیں گے۔ تم گھر پر رہو اور چوہوں کو پکڑو۔ جب میں چاندی کُھر والے بکرے کو دیکھ کر واپس آؤں گی تو تمھیں اس کے متعلق بتاؤں گی۔"

بلّی نے اپنی بھُوری بھُوری آنکھیں اُٹھا کر دیکھا اور بولی، "می آؤں، میں بھی آؤں۔"

نازیہ جلدی سے بولی، "نہیں، نہیں، تم یہیں رہوگی۔"

نازیہ اور بابا دینو اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ جب گاڑی کافی دور جا چکی تو انھوں نے کتّوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔ انھوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ پوسی ان کے پیچھے دوڑتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ اگر کوئی کتّا اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا تو وہ پنجے مار مار کر اسے لہو لہان کر دیتی۔ پوسی نے کچھ ہی دنوں میں خوب رنگ نکالا تھا۔ اب وہ بہت خوب صورت بلی بن چکی تھی اور زور آور تو اتنی تھی کہ گلی محلّے کا کوئی کتّا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

نازیہ نے بہت چاہا کہ اسے پکڑ کر واپس چھوڑ آئے لیکن بلّی چھلانگ مار کر درخت پر چڑھ گئی۔ نازیہ نے اسے بہت چمکارا پچکارا لیکن بلّی درخت سے نیچے نہ اتری۔ آخر وہ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے جب کبھی وہ مُڑ کر پیچھے دیکھتے، انھیں بلّی پیچھے پیچھے آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ آخر وہ جنگل میں بنے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ بلّی بھی ان کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوگئی۔

نازیہ بولی، "اب تم آ ہی گئی ہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ دوسے نین بھلے۔"

بلّی دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

اس موسمِ سرما میں بہت سے جنگلی بکرے اُدھر آئے۔ بابا دینو ہر روز ایک دو بکرے شکار کرکے لے آتا۔ بکروں کی کھال اُتار کر وہ گوشت کو نمک لگاتا اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیتا۔ کچھ ہی دنوں میں ڈھیروں گوشت اور بہت سی کھالیں اکھٹی ہوگئیں۔ ایک دن دینو بولا، "میں چاہتا ہوں کہ اس گوشت اور کھالوں کو شہر میں لے جاکر فروخت کردوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

نازیہ بولی، "دادا، میں چاندی کُھر والے بکرے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

بابا دینو حیران ہوکر بولا، "کیا تم یہاں اکیلی رہنا چاہتی ہو؟"

نازیہ بولی، "بابا، میں اکیلی تو نہیں ہوں، پوسی میرے ساتھ ہے اس لیے میں تنہائی محسوس نہیں کروں گی۔"

دینو بولا، "بیٹی، سردیوں کے موسم میں جنگلی جانور اکثر اِدھر آجاتے ہیں اور بہت تنگ کرتے ہیں۔"

نازیہ نے کہا، "بابا، آپ کوئی فکر نہ کریں، میں دروازہ بند رکھوں گی تاکہ کوئی جانور اندر نہ گُھس سکے اور پھر پوسی بھی تو میرے ساتھ ہے۔"

پوسی نے زور سے کہا، "می آؤں" یعنی میرے ہوتے ہوئے کسی کی مجال ہے جو اِدھر قدم بھی رکھ سکے۔

بوڑھا بولا، "اچھا بیٹی، تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں جلدی واپس لوٹ آؤں گا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا نازیہ کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ نازیہ دن بھر بلّی سے کھیلتی رہتی۔ شام کے وقت جب سائے لمبے ہوجاتے، نازیہ کو کچھ ڈر محسوس ہوتا۔ وہ بلّی کی طرف دیکھتی تو وہ تن کر کھڑی ہوجاتی، یوں لگتا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو، بی بی، تم کوئی فکر نہ کرو۔ کوئی یہاں قدم رکھ کر تو دیکھے، میں منھ نوچ لوں گی اس کا۔

اور نازیہ کے دل سے سب خوف جاتا رہتا۔ ایک دن وہ جنگل کا نظارہ کر رہی تھی کہ جنگل سے ایک جانور اُچھلتا کودتا ہوا جھونپڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ نازیہ نے دیکھا یہ ایک جنگلی بکرا تھا۔ اس کی ٹانگیں پتلی پتلی تھیں۔ گردن اور سر بہت خوش نما اور رنگت دودھیا سفید تھی۔ اس کے سر پر پانچ سینگ تھے۔ نازیہ اسے دیکھتے ہی

پہچان گئی۔ یہ چاندی کُھر والا بکرا تھا۔ وہ جھٹ سے باہر نکلی، اتنی دیر میں بکرا نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ دور دور تک اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ نازیہ بڑبڑائی ضرور میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

وہ بلّی کو ساتھ لے کر پلنگ پر لیٹ گئی اور دن چڑھے تک سوتی رہی۔ اگلا دن بھی یوں ہی گزر گیا۔ دینو بابا ابھی تک شہر سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ اب تو نازیہ بھی تنہائی محسوس کرنے لگی پھر بھی وہ نہیں روئی۔ اس نے بلّی کو پیار کیا اور بولی، "پوسی کوئی فکر نہ کرنا، دادا کل تک ضرور لوٹ آئیں گے۔"

جواب میں بلّی آہستہ سے بولی، "می آؤں۔ آؤں۔ آؤں۔"

اس شام نازیہ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک اسے کسی جانور کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پہلے تو گھر کے پیچھے کھٹکا ہوا، پھر کسی نے سامنے کے دروازے پر کھٹ کھٹ کی۔ نازیہ کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سہم کر اُٹھ بیٹھی۔ پھر چھت کے اوپر کھٹکا ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی جانور بہت تیزی سے اچھلتا کودتا پھر رہا ہو۔ اچانک نازیہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں یہ چاندی کُھر والا بکرا نہ ہو۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ چاندی کُھر والا بکرا بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ اس کے پانچ سینگ تھے اور دودھیا سفید رنگ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے ایک پاؤں اُٹھا رکھا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی اسے زمین پر مارنے والا ہو۔ نازیہ اس کو چمکارنے لگی، بالکل اس طرح کہ جیسے عام بکروں کو چمکار پچکار کر بلایا جاتا ہے۔ بکرے نے ایک قہقہہ سا لگایا اور چھلانگیں مارتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

نازیہ گھر کے اندر گئی اور پوسی کو بتایا، "آج میں نے چاندی کُھر والے بکرے کو دیکھ لیا ہے۔ وہ بہت خوب صورت اور شان دار لگ رہا تھا لیکن اس نے جب زمین پر پاؤں مارا تو کوئی اشرفی نہیں گری۔"

تیسرا دن بھی گزر گیا۔ دینو بابا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ اب نازیہ بہت پریشان ہوئی اور ڈر کر رونے لگی۔ اس نے بلّی کی طرف دیکھا، وہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھی۔ اب

تو نازیہ بہت خوف زدہ ہوئی۔ وہ پوسی کو ڈھونڈنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

چودھویں کا چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کے نزدیک ہی کھلے میدان میں بلّی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چاندی کھُر والا بکرا کھڑا تھا۔ اچانک اس نے اپنا پاؤں اٹھاکر زمین پر مارا اور اس کے ساتھ ہی چھن سے ایک اشرفی گری۔ بلّی اپنا سر ہلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بکرا بھی اپنا سر ہلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ باتیں کر رہے ہوں۔ اچانک بلی چھلانگ مار کر دوڑی۔ بکرا بھی چھلانگیں مارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا آیا اور چھلانگ مار کر چھت پر چڑھ گیا۔ وہ زور زور سے اپنا پاؤں مارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اشرفیاں چھن چھن کرتی ہوئی گرنے لگیں۔

اسی وقت دینو بابا بھی واپس آگیا۔ اس نے بھی یہ عجیب منظر دیکھا کہ چاندی کھُر والا بکرا بار بار اپنا کھُر چھت پر مار رہا تھا اور ڈھلان دار چھت سے اشرفیاں بارش کی طرح نیچے گر رہی تھیں۔ پوسی سر ہلا ہلا کر بکرے کو شاباش دے رہی تھی۔ پھر اچانک ہی بلّی اور چاندی کھُر والا بکرا چھلانگ مار کر جنگل میں غائب ہو گئے۔ بابا دینو نے اشرفیوں سے اپنا تھیلا بھر لیا۔ ابھی بہت سی اشرفیاں چھت کے اوپر اور صحن میں پڑی ہوئی تھیں۔

بابا بولا، "بیٹا، یہ اشرفیاں ہم کل صبح اٹھائیں گے۔"

لیکن افسوس رات کے وقت تیز آندھی آئی پھر شدید بارش ہوئی۔ صبح کے وقت جب مطلع صاف ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ چھت پر اور صحن میں جو اشرفیاں تھیں وہ رات کو کہیں غائب ہوگئیں۔ اللہ جانے وہ تیز آندھی میں اُڑ گئیں یا بارش کے ساتھ بہ گئیں۔

بوڑھے دینو نے ایک آیت پڑھی اور بولا، "بیٹی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں وہی کچھ ملتا ہے جو ہمارے مقدر میں ہوتا ہے۔"

نازیہ نے کہا، "دادا، پھر بھی ہمارے پاس اشرفیوں سے بھرا ہوا تھیلا تو ہے۔"

ان دونوں کو پوسی کے چلے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آئی اور نہ کسی نے پھر چاندی کھُر والے بکرے کو دیکھا۔ جنگل میں لوگوں کو اب بھی اشرفیاں ملتی ہیں۔ تم بھی جنگل میں جا کر دیکھو، شاید تمھیں بھی اشرفیاں مل جائیں۔

مشرق اور مغرب کی باتیں

مرزا ظفر بیگ

مشرق : میں مشرق ہوں۔

مغرب : مجھے مغرب کہتے ہیں۔

مشرق : مجھے فخر ہے اپنی سُنہری زمین پر جہاں کی روشن کرنیں ازل سے لوگوں کی رہنمائی کررہی ہیں۔

مغرب : مجھے فخر ہے اپنی ٹھنڈی اور دھول مٹّی سے پاک زمین پر کہ جس پر آکر لوگوں کو اپنے دلوں میں ٹھنڈک اور فرحت کا احساس ہوتا ہے۔

مشرق : میرے سینے پر صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور خالد بن ولید جیسے جیالوں کے گھوڑے دوڑ چکے ہیں۔

مغرب : طارق بن زیاد جیسے نام ور جرنیل کے قدموں کو میری زمین نے بھی تو چوما ہے۔

مشرق : سورج میری زمین سے طلوع ہوتا ہے۔

مغرب : تو کیا ہوا اس کو رخصت کرنے کا شرف تو مجھے حاصل ہے۔ آخر تک ساتھ رہتا ہوں۔

مشرق : تم بالکل سرد ہو۔

مغرب : میں سرد ہوں، پُرسکون ہوں۔ تم گرم ہو، تمھاری حرارت تمھارا سکون ختم کررہی ہے۔

مشرق : حرارت تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔

مغرب : ایسی حرارت کس کام کی جو انسان کے وجود کو ہی پھونک دے اور تمھارے لوگ تو اپنی حرارت سے دوسروں کو پھونک دیتے ہیں۔

مشرق : میری زمین پر سائنس اور ٹکنالوجی کی بُنیاد پڑی۔

مغرب: مگر بُنیاد ڈال کر تمھارے لوگ غفلت میں پڑ گئے۔ اس کو فروغ تو میں نے دیا ہے نا۔ دیکھ لو اتنا فروغ دیا کہ میری زمینیں سونا اُگل رہی ہیں۔

مشرق: کم تو میں بھی نہیں ہوں۔ میری زمین میں بھی تیل، گیس اور دوسری معدنیات کے زبردست ذخیرے موجود ہیں۔

مغرب: مگر ان کو نکلوانے کے لیے میری مدد طلب کرتے ہو۔ اور میرے فراخ دل انسان اپنی روشن خیالی اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرے لوگ مہذب اور آزاد خیال ہیں۔

مشرق: آزاد خیال؟ ایسی آزاد خیالی کو میرے لوگ پسند نہیں کرتے جس میں رشتوں کا لحاظ اور تقدس ختم ہو جائے۔

مغرب: اس بات کی وضاحت کرو۔

مشرق: تمھارے ہاں آزاد خیالی کے نام پر عُریانی، فحاشی اور خودسَری بہت ہے۔ اس سے رشتوں کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ ماں، باپ، بہن اور بھائی کے رشتوں کا احترام اور ان کی کشش تو تم میری زمین پر دیکھو۔

مغرب: تمھارے لوگوں نے مصنوعی تہذیب کے خول بنا رکھے ہیں۔ ہر شخص اپنے اس خول میں سمٹا رہتا ہے۔ پردے میں رہنا چاہتا ہے۔ کنویں کا مینڈک۔

مشرق: یہ خول اور پردہ ہی تو اصل میں مجھ پر بسنے والوں کی تہذیب اور معاشرت ہے۔ اس کی قدر تو دنیا کرتی ہے۔

مغرب: تمھیں کیا معلوم! اس چیز کو لوگ قدامت پرستی کا نام دیتے ہیں۔ تم لوگ رسوم و رواج کے پابند رہنا چاہتے ہو۔ اپنے باپ دادا کے بنائے ہوئے پُرانے اور گھِسے پِٹے اُصولوں پر ہی چلنا چاہتے ہو۔

مشرق: آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے اصول ہی تو ہر مشکل میں ہمارے کام آتے ہیں۔ یہ میری ہی زمین ہے جہاں کا رُخ لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں دائمی سکون میسّر ہو سکے۔ تمھارے معاشرے کے بے شمار لوگ میری پناہ میں آجاتے ہیں۔

مغرب: اور خاک دھول سے اَٹی ہوئی زمین پر گُم نامی کی زندگی گزار کر اپنا نام و نشان

کھودیتے ہیں۔ تمھارے ہاں تو انسان کی قدر ہی نہیں ہے۔ اس کے فن، ہنر اور صلاحیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کی محنت کو پوری داد نہیں ملتی۔

مشرق: میرے نادان دوست! دراصل انسان کی قدر ہی میری زمین پر کی جاتی ہے۔ جبھی تو بڑے بڑے اولیا، بزرگ اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسول سب میری زمین پر آئے ہیں۔ میری اس مقدّس زمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے پاک قدموں کو بوسے دیے ہیں۔

مغرب: دراصل زمین کے اس ٹکڑے پر اصلاح کرنے والا بھیجا گیا جہاں سازشوں، گُم راہی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اب دیکھو نا! کسی جگہ اگر جرائم زیادہ ہونے لگتے ہیں تو وہاں پولیس بھیجی جاتی ہے۔ اخلاقی تعلیم دینے کے لیے دینی استاد بھیجے جاتے ہیں۔ تمھارا ٹکڑا بہت عرصے سے گم راہیوں کا شکار تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہاں مصلح بھیجے۔ میرے ہاں تو کوئی بُرائی تھی ہی نہیں۔

مشرق: ارے بھئی! جب تمھارا خطہ غیر آباد ہوگا وہاں انسان کا وجود ہی نہ ہوگا تو وہاں کوئی کس لیے آئے گا؟

مغرب: کیا مطلب؟

مشرق: تاریخ بتاتی ہے کہ مشرق سے ہی دراصل انسانی بستیاں آباد ہونی شروع ہوئی تھیں۔ مغرب تو کافی عرصے تک برف سے ڈھکا رہا۔ اس پر انسانی آبادی تو بہت بعد میں شروع ہوئی ہے۔

مغرب: تو پھر بھائی! اس میں میرا کیا قصور؟ جب مجھ پر انسان ہی نہیں تھے تو کوئی ہدایت دینے والا، کوئی مصلح کیوں آتا؟

مشرق: ایک بات تو مان لو کہ میں ہر لحاظ سے تم سے سینیئر ہوں۔

مغرب: دراصل ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے میں اتنے آگے جا چکے ہیں کہ اب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

مشرق: بس تو پھر یہ بحث ختم ہوئی۔ یہاں کی تہذیبوں اور معاشرے میں بسنے والے لوگ دراصل قصور وار ہیں۔ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہم بہر حال ایک ہیں۔

مغرب: تو ملاؤ ہاتھ۔

اور وہ مقابلہ جیت گئی

راحیل نجمی، کراچی

آج ہم آپ کو لندن میں رہنے والی ایک بچّی کی کہانی سُناتے ہیں جو جوڈو کی چیمپین بننا چاہتی تھی۔ یہ ایک "آپ بیتی" ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ "آپ بیتی" کسی ایسے واقعے کو کہتے ہیں جو بیان کرنے والے پر گزرا ہو۔ گویا جس کی کہانی اسی کی زبانی۔ تو آیئے! ہم جین کی کہانی اسی کی زبانی سنتے ہیں۔

میرا نام جین ہے۔ اسکول کے علاوہ میں ایک کلب میں "جوڈو کراٹے" کی کلاس میں بھی شریک ہوتی ہوں۔ وہاں میں اپنے استاد کی نگرانی میں مشق کرتی ہوں۔ یہ بڑی سخت مشقیں ہوتی ہیں جن میں ہمیں ہاتھوں پر اور پنجوں کے بَل کھڑے رہنے کی بھی مشق کرائی جاتی ہے۔ گزشتہ سال میری دل چسپی، تربیت اور مہارت کو دیکھتے ہوئے میرے استاد نے خیال ظاہر کیا کہ میں "جوڈو چیمپین" بن سکتی ہوں۔ بس، پھر کیا تھا مجھے دُھن سوار ہوگئی کہ جوڈو کی چیمپین بن کر رہوں گی۔ اتفاق سے کچھ عرصے بعد ہی ہمارے گاؤں میں جوڈو کے مقابلوں کا اعلان ہوا میں نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔

ہفتے کی صبح دس بجے ہمارے گاؤں کے اسپورٹس ہال میں یہ مقابلہ ہونا تھا۔

میں اس دن صبح جلد ہی اُٹھ گئی اور مشق شروع کر دی۔ امّی نے میرے لیے ناشتا بھی تیار کر دیا تھا اور میرے کپڑوں پر اِستری کر دی تھی۔ ناشتے کے دوران میں برابر یہی سوچتی رہی کہ اگر میں یہ مقابلہ جیت گئی تو میں چیمپیَن بن جاؤں گی۔ میرا نام اخباروں میں آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ ٹیلے وژن والے بھی میرا انٹرویو لینے آجائیں۔ آہا! کتنا مزہ آئے گا۔

اُسی وقت امّی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں "جلدی کرو، ورنہ دیر ہو جائے گی۔" میں نے جلدی جلدی تھوڑا سا ناشتا کیا، اپنا جوڈو والا لباس بیگ میں رکھا اور گھر سے چل پڑی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وُڈ اسٹریٹ کافی لمبی تھی۔ اس میں چند گھر آباد تھے ورنہ اس کے آس پاس کے زیادہ تر گھر خالی پڑے تھے۔ انھی میں سارے گاؤں کے چہیتے دادا مسٹر وِلسن کا گھر بھی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ انھوں نے ساری عمر اسی مکان میں گزاری تھی۔ انھیں اپنے اس پُرانے سے مکان سے بڑی محبت تھی۔

جب میں مسٹر وِلسن کے مکان کے پاس سے گزر رہی تھی تو میں نے کچھ آوازیں سُنیں۔ شاید کوئی مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ کسی چیز کی جلنے کی بُو بھی آ رہی تھی۔ میں نے چونک کر مسٹر وِلسن کے گھر کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ پھر مجھے مسٹر وِلسن کی دبی دبی سی کراہیں بھی سنائی دیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ میں نے چیخ کر ان سے کہا:

"مسٹر وِلسن! میں ہوں جین۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔"

پھر میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ تو جام ہو چکا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک زوردار ٹکر دروازے کے ماری۔ پھر دوسری، پھر تیسری اور دروازہ چرچراتا ہوا کھُل گیا اور دھوئیں کا ایک چھوٹا سا بادل باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر وِلسن باورچی خانے کے دروازے کے قریب نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گئی۔ دھوئیں سے میری آنکھوں

میں جلن ہونے لگی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مسٹر ولسن کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر وہ کافی بھاری تھے۔ میں نے پھر کوشش کی اور آخر انھیں گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ باورچی خانے میں دھواں بھر گیا تھا اور ہوا اندر آنے سے اب شعلے اور زیادہ بھڑکنے لگے تھے۔ تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہاں ایک لمحے کے لیے رُکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ پورا مکان شعلوں کی لپیٹ میں آتا۔ میں مسٹر ولسن کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر ان کے مکان سے کافی دور لے آئی۔ وہ بُری طرح کھانس رہے تھے اور کچھ کہنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ وہ رُک رُک کر کچھ کہہ رہے تھے۔

"فرائی پان ... فرائی پان ... انڈے تل رہا تھا۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی مقابلے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب میں کیا کروں! میں مسٹر ولسن کو زخمی حالت میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی تھی! آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے ہر حال میں ان کی مدد کرنی تھی۔ میں نے اپنا جوڈو کا لباس مسٹر ولسن پر ڈالا اور ٹیلے فون بُوتھ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مجھے یاد آیا کہ وُڈ اسٹریٹ کے کونے پر ایک بُوتھ ہے۔ میں نے آگ کی گرمی سے مکان کے شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سُنیں اور پوری طاقت کے ساتھ فون کی طرف دوڑ پڑی۔ میں اتنی تیز کبھی نہ دوڑی تھی۔ جب میں بُوتھ کے پاس پہنچی تو معلوم ہوا کہ فون کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کے تار ٹوٹے ہوئے تھے۔ "اب میں کیا کروں!" میں نے جلدی جلدی نظریں دوڑائیں۔ اسی وقت میری نظر پارک اسٹریٹ کے کونے پر بنے ہوئے دوسرے فون بُوتھ پر پڑی۔ ایک بار پھر میں دوڑ پڑی۔ اللہ کا شکر کہ وہ کام کر رہا تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر میں نے آگ لگنے کی اطلاع دی اور مکان کا پتا لکھوایا۔ اس کے بعد ایمبولنس کے لیے بھی فون کیا اور واپسی کے لیے مُڑ گئی۔

دُور ہی سے مجھے گاڑھا سیاہ دھواں نظر آ گیا تھا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر اب کافی لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دس بج چکے تھے اور مقابلہ

شروع ہو چکا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا! اب میں چیمپئن نہیں بن سکتی تھی۔ اتنے میں وہاں فائر بریگیڈ کے انجن سائرن بجاتے ہوئے آپہنچے۔ جلد ہی انھوں نے صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایمبولنس بھی آگئی تھی۔ انھوں نے مسٹر ولسن کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولنس میں پہنچا دیا۔ ایمبولنس کا ڈرائیور جوڈو کا لباس دیکھ کر چونک اُٹھا اُس نے ہجوم سے اس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا، "یہ میرا لباس ہے۔" اس پر ڈرائیور نے کہا، "تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مسٹر ولسن نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے ان کی جان بچائی ہے۔ مسٹر ولسن نے سر اُٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ بہت کم زور ہو چکے تھے۔ پولیس کے ساتھ کچھ اخباری نمائندے بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنا جوڈو کا لباس بیگ میں رکھا اور ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی چل پڑی۔ گھر پہنچی تو امّی لپک کر میرے پاس آئیں اور بولیں، "تم نے مقابلہ جیت لیا ہے نا؟ تم جوڈو چیمپئن بن گئی ہو نا؟ ارے! تمھارے کپڑوں میں سے یہ کیسی بُو آ رہی ہے؟ کیا کیا ہے تم نے؟ تم کہاں سے آ رہی ہو؟" ابھی میں امّی کے اتنے سارے سوالوں کے جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سُن کر امّی نے دروازہ کھولا۔ وہاں اخباری نمائندہ کھڑا تھا۔ وہ آگ لگنے کے سارے واقعات جاننا چاہتا تھا۔ تب امّی نے بھی پوری کہانی سُنی۔ اگلے دن کے اخبار میں میری تصویر کے ساتھ میری بیان کی ہوئی پوری کہانی اس عنوان کے ساتھ موجود تھی۔

"جین چیمپئن ہے!"

میں واقعی مقابلہ جیت گئی تھی۔

یاد رکھیے!

ہمدرد نونہال کے لیے کوئی بھی تحریر بھیجتے وقت اپنا پورا پتا ضرور لکھیے۔ اس کے بغیر آپ کی تحریر ہمدرد نونہال میں شائع نہیں کی جائے گی۔

اپنی تحریر میں حاشیہ ضرور چھوڑیے اور صفحے کے صرف ایک طرف کُھلا کُھلا اور صاف لکھیے۔ ایک سطر چھوڑ کر لکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

ٹیبل ٹینس کی قومی چیمپئن

نازو شکور

نونہالوں سے مخاطب ہیں

راوی: ساجد علی ساجد

بچّو! آج میں آپ سے مخاطب ہو کر سب سے پہلے تو اپنے بارے میں بتاؤں گی۔

ٹیبل ٹینس ہمارے گھرانے کا "قومی کھیل" ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہم تین بہنیں ہیں۔ سیما شکور، روبینہ شکور اور میں خود نازو شکور۔ پچھلے نو سال سے ٹیبل ٹینس کا قومی اعزاز ہم تینوں میں سے کوئی ایک جیتتا رہا ہے۔ میں خود پچھلے چار سال سے قومی چیمپئن بن رہی ہوں۔ اس سے پہلے روبینہ شکور بھی اپنی قومی کامیابیوں کی ہیٹ ٹرک کر چکی ہیں۔

پچھلے برسوں میں ہماری دو بہنیں دو اور چیمپئن کھلاڑیوں کو ہمارے گھرانے میں لے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک ٹیبل ٹینس کے قومی کھلاڑی عارف ناخدا اور دوسرے قومی ہاکی ٹیم کے سابق کپتان کلیم اللہ ہیں۔

میں نے جب آنکھ کھولی تو اپنی بہنوں کو ٹیبل ٹینس کھیلتے پایا اور میں بھی ان کے ساتھ کھیلنے لگی۔ میں اسکول میں ہی تھی جب اچھی خاصی ٹیبل ٹینس کھیلنے لگی تھی اور جب چھٹی جماعت میں آئی تو میں نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ اسی زمانے میں ہی میں ایک قومی بینک سے وابستہ

ہو گئی تھی۔ اور جب نویں جماعت میں تھی تو میں نے پہلی بار قومی چیمپین شپ جیتی۔

میں تو اسے اپنی خوش نصیبی اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی کہوں گی کہ اس نے ہمیں اتنی ساری کامیابیوں سے نوازا۔ ساتھ ہی سچی بات یہ ہے میں نے اور میری بہنوں نے اس کھیل میں اپنے مقام کو برقرار رکھنے کے لیے کافی محنت بھی کی ہے اور اس وقت ہمارے سر اظہارِ تشکر سے جھک جاتے ہیں جب لوگ ٹیبل ٹینس کو شکور سسٹرز کا کھیل قرار دیتے ہیں۔

بچّو! اب میں کچھ باتیں آپ سے خود آپ کے بارے میں کہنا چاہوں گی۔

مجھے وہ بچے پسند ہیں جو کم شرارتیں کرتے ہیں اور ماں باپ کو تنگ نہیں کرتے تاہم انھیں شرارتوں سے مکمل پرہیز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے ان کے اندر تھوڑا سا شوخ پن ضرور ہونا چاہیے یا وہ بچکانہ تجسس جس سے بچہ سیکھتا ہے اور اس کی پرورش اور تربیت کا عمل پورا ہوتا ہے۔ جو بچے شرارت کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ایسی شرارت کریں جس سے دوسروں کو تکلیف نہ ہو، والدین کی نافرماں برداری نہ ہو۔ خاص طور پر جو بچے دوسروں کے گھر میں مہمان بن کر جاتے اور شرارت کرتے ہیں، توڑ پھوڑ کرتے ہیں، وہ مجھے بُرے لگتے ہیں۔

بچّوں کو اپنی عمر کے بچّوں کے ساتھ کھیلنا کودنا چاہیے۔ بڑے بچے بڑے بچّوں کے ساتھ کھیلیں، چھوٹے بچے چھوٹے بچّوں سے دوستی رکھیں۔ ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے سے پرہیز کریں۔ ایسے بڑے بچے جو ماں باپ کو تنگ کرتے ہیں قدرتی بات ہے بڑوں کو پسند نہیں آتے ہیں۔

اس لحاظ سے مجھے اپنی بڑی بہن سیما شکور کی بچّی بہت پسند ہے، گو وہ ابھی چھوٹی ہے، بالکل ناسمجھ۔ ساڑھے تین سال کی ہے، لیکن ابھی سے اس میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ بڑوں کو تنگ نہیں کرے گی۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ اب بھی جو شرارتیں کرتی ہے وہ بڑی تمیز اور پیار بھری ہوتی ہیں۔ باجی بتاتی ہیں کہ وہ خود بھی بچپن میں ایسی ہی تھیں اور اپنی شرارتوں سے بڑوں کو تنگ نہیں کرتی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر کے اندر کھیلتیں۔ باہر کھیلنے سے گریز کرتیں۔ گھر کی کوئی چیز توڑتی پھوڑتی نہیں تھیں۔

جہاں تک میرے اپنے بچپن کا تعلق ہے میں اپنے بارے میں کیا بتا سکتی ہوں۔ لوگ میری عادت سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ زور سے کھلکھلا دی اور بہت دیر تک کھلکھلاتی اور ہنستی رہی۔ اس لیے خیال یہی ہے کہ بچپن میں شوخ ضرور ہوں گی مگر بہت زیادہ شریر نہیں۔

بچّوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیلنا بھی چاہیے لیکن اتنا نہیں کہ پڑھائی پر اثر پڑے۔

بعض بچے دن بھر گلیوں اور سڑکوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ عادت اچھی نہیں ہے اور خطرناک بھی ہے، کیوں کہ گلیوں اور سڑکوں میں کھیلنے سے کسی سواری کے نیچے آنے کا خطرہ رہتا ہے۔

کھیل کے معاملے میں والدین کو بچّوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیے۔ وہ کوئی

کبھی کھیل کھیلیں اُن کو کھیلنے دیں۔ میں نے بچپن میں کرکٹ اور ہاکی کھیلی ہے، لیکن ٹیبل ٹینس میں مجھے سب سے زیادہ مزہ آیا اور میں اسی کھیل کی ہو کے رہ گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میری بڑی بہنیں ٹیبل ٹینس کی قومی چیمپئن رہی ہیں اور کئی سال ایسے گزرے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کے خلاف ٹیبل ٹینس فائنل کھیلے ہیں۔ اس وقت بھی میں ٹیبل ٹینس کی قومی چیمپئن ہوں۔

جہاں تک دوسرے کھیلوں کا تعلق ہے مجھے نہ معلوم کیوں کرکٹ سے نفرت ہے۔

کرکٹ ایک فضول کھیل ہے اور جب تپتی دھوپ اور گرمی میں ہمارے نوجوان کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں تو مجھے ان پر ترس آتا ہے۔

زندگی میں صرف ایک بار کرکٹ میچ دیکھا ہے۔ کرکٹ کے مقابلے میں ہاکی مجھے پسند ہے۔ ہمارے ابا نے بھی ہاکی کھیلی ہے اور ہمارے بہنوئی کلیم اللہ ہاکی کے قومی کھلاڑی ہیں اور ان کا کھیل اور شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ ٹیبل ٹینس دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا کھیل ہے جسے چھوٹی سی جگہ میں گھر کی پردہ کرنے والی گھریلو خواتین بھی کھیل سکتی ہیں اور یہ کھیل ان کے لیے تن درست اور چاق و چوبند رہنے اور تفریح حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مجھے تو اپنی زندگی ٹیبل ٹینس کے بغیر مکمل نہیں معلوم ہوتی۔

دانہ دانہ

قیدی ماں کا بچّہ

مرسلہ: صائمہ زرین، کراچی

غزوۂ روم میں مسلمانوں نے بہت سے رومیوں کو قیدی بنالیا۔ حضرت ایوب انصاریؓ نے دیکھا کہ ایک قیدی عورت زار و قطار رو رہی ہے۔ انھوں نے رونے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کا بچّہ چھین لیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کا بچّہ ڈھونڈ نکالا اور ماں کے سپرد کر دیا۔ اس پر قیدیوں کے محافظ نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی شکایت کر دی۔ مسلمانوں کے سپہ سالار نے حضرت ایوب انصاری کو بلایا اور کہا کہ آپ نے قیدیوں کے ساتھ ہمدردی کیوں کی؟ آپ نے کہا، "رسول اللہ ؐ نے ظالمانہ برتاؤ سے منع فرمایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں اپنی آنکھوں سے یہ ظلم ہوتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔"

سات پھول

مرسلہ: ایاز محمود

■ انصاف کی ایک گھڑی ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے۔

■ خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔

■ انسان کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق، اور زمین کی طرح نرم ہونا چاہیے۔

■ دنیا میں وہی لوگ سربلند ہوتے ہیں جو تکبّر اور غرور سے دور ہوں۔

■ مصیبت کے وقت گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہوتی ہے۔

■ ہر بڑا کام پہلے ناممکن ہوتا ہے۔

سب سے بڑا افسر

مرسلہ: عشرت ذاکر، کراچی

گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رُکی اور ہم نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہمیں وہیں کالج کے دنوں کے مانوس در و دیوار نظر آئے۔ وہی رس بھری پنجابی آوازیں کانوں میں پڑیں اور جھاگ بھری قمیص اور شلواریں دکھائی دیں۔ ایک غیبی طاقت نے ہمیں لاہور اُترنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیشن سے نکل کر چلے تو پہلی مرتبہ پتا چلا کہ لاہور کے گلی کوچوں میں چلنا بھی کتنی بڑی

نعمت ہے۔

گھر پہنچے تو چھوٹوں کو بڑا پایا اور بڑوں کو اور بڑا، لیکن گاؤں کی بڑی خبر یہ نہ تھی کہ ہم نے انھیں کیسا پایا، بلکہ یہ کہ ہم خود کیسے پائے گئے۔ خبر مشہور ہو گئی کہ کپتان آیا ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے کام چھوڑ کر ملاقات کو آنے لگے۔ مہینے بھر میں صرف چند روز اپنے گھر سے کھانا کھایا اور وہ بھی والدہ کے اصرار پر کہ مجھے اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لینے دو اور جب دیر دیکھ چکیں تو وہی کچھ کہا جو صرف ماں ہی کہہ سکتی ہے: "بیٹا، اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہو نا؟"

میں والدہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اگر اس پیکرِ محبت کا وجود نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن کی واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا؟ بغیر کسی جھجک کے جواب دیا: "جی ماں! ایک آدھ چھوڑ کر سب میرے ماتحت ہیں۔" اور ماں کی دنیا آباد ہو گئی۔ ویسے سچ یہ تھا کہ ایک آدھ نہیں بلکہ ایک لاکھ چھوڑ کر بھی ہمیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لیے چراغ بلکہ سرچ لائٹ کی ضرورت تھی، لیکن وہ سچ کس کام کا جس سے ماں کا دل دکھے۔

—— کرنل محمد خاں

مشرقیت

مرسلہ: ساجد احمد خاں، کراچی

بس یا ٹیکسی کے لیے قطار لگانے کا جنون انگلستان میں تو ایسا ہے کہ مشہور ہے، ایک آدمی ہو تو بھی قطار بناتا ہے۔ ٹوکیو میں بھی قطار بنتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لمبی قطاریں بن جاتی ہیں، لیکن جونہی بس آتی ہے سب سلیقہ بھول قطار توڑ اس پر سوار ہونے کے لیے پل پڑتے ہیں۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ کچھ نہ کچھ تو مشرقیت کی روح ان لوگوں میں باقی ہے، بالکل کرسٹان نہیں ہو گئے۔

—— ابن انشا

زندگی

مرسلہ: ناصر ادریس، جڑانوالہ

جہاں ہر طرف خار دار جھاڑیاں اور نوکیلے سنگریزے ہیں جو قدم قدم پر ہماری روح کو زخمی کر دیتے ہیں۔ کتنی طویل اور کٹھن ہیں زندگی کی راہیں جہاں کوئی کہکشاں نہیں۔ جہاں قدم قدم پر انسان لڑکھڑاتا ہے۔ ان راہوں پر چلنے سے ٹانگیں تھکن سے چور ہو کر کانپنے لگتی ہیں اور پاؤں سے لہو ایسے ٹپکتا ہے جیسے آنکھ سے آنسو۔ ان راہوں پر اگر کوئی راستہ بھٹک جائے تو ساری عمر ہی بھٹکتا رہے۔ ان راہوں میں ہر طرف مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم خواہشات کا ہاتھ تھام کر آرزوؤں کو گلے سے لگائے چلتے ہی رہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ زندگی امانت ہے۔

ہنسی

مرسلہ: افشاں کرم الٰہی، کراچی

انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کا

ذہن اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ تاثر خوش گوار ہو تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور اس خوش گوار تاثر کی شدت ایک قہقہے کا روپ دھار لیتی ہے۔ صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی تو ہے جو اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ اس کو ہنسی ایجاد کرنی پڑی۔

ایک شعر

مرسلہ: نامعلوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

—— علامہ اقبال

حسابی فارمولے

مرسلہ: وسیم عباس، سیال کوٹ

نصیحت + بڑھاپا = بزرگ
امراض + فیس = ڈاکٹر
انسان + بھول = پروفیسر
آدمی + اخلاق = انسان
کاغذ + جھوٹ = چھٹی کی درخواست
اشرف المخلوقات ـ عقل = جانور

پڑوسن

مرسلہ: قدسیہ یاسمین، بھکر

مصر کی فتح کے دوران فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک چھاؤنی سے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جب سپاہی خیمے اکھاڑ رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ فاتحِ مصر کے خیمے پر ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا "یہ کبوتری ہماری پڑوسن ہے۔ جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اُڑنے نہ لگیں اس وقت تک خیمہ نہ اکھاڑا جائے۔" آپ نے وہاں ایک محافظ مقرر کر دیا اور پھر وہاں سے چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد واپس آکر خیمے کے گرد ایک شہر بسایا جس کا نام فُسطاط (خیمہ) رکھا جو آج تک قائم ہے۔

مُرغیاں

مرسلہ: زاہد محمود، ایبٹ آباد

ایک اور غلط فہمی جس میں عوام و خواص مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہِ عام کے لیے ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ مُرغیاں ڈربے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ ہے کہ مرغیاں ڈربے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور کپڑوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے ہیں۔ لحاف سے کُڑک مرغی اور ڈربے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرّہ کا معمول ہو گیا اور یوں بھی پہلے فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا، مگر میرے ہیلو کہنے سے بیشتر ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ازراہِ کرم مجھے یاد فرمایا تھا انھوں نے سوری رانگ نمبر کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔

SPOTLIGHT ON EXCELLENCE

Excellence in architecture has been the hallmark of our ancestors. Best material from all over the world was utilised to create time defying masterpieces of beauty and strength.

Today, **THERMEC** *has brought the world within your reach by manufacturing the best material for interiors, surpassing all standards of beauty and strength, helping keep the tradition alive into the modern era.*

THERMEC *distinguishes itself as the single source for custom designed high quality engineering and architectural products.*

alumin	*Aluminium door and window frames.*
DAMPA	*Acoustic ceilings and light fittings.*
THERMEC	*Air devices.*
Faber	*Vertical and venetian blinds.*

THERMEC ENGINEERING CO.

6, Aman Chambers, Shaheed-e-Millat Road, Main Karachi-8 Pakistan.
Telephone : 439692 - 432159 - 441434,
Cables : THERMEC Telex : 25238 THMEC PK.

MORE AND MORE PEOPLE LOOK UP TO* THERMEC *FOR THEIR BUILDING NEEDS.

ABM 88

بوجھو تو جانیں

مرسلہ، کوکب فاطمہ

۱ ۔ وہ کون سا چار حرفی لفظ ہے جو ڈھونڈتے کے معنی میں آتا ہے۔ اگر اس کا پہلا حروف ہٹا دیں تو وہ ایک ایسی چیز بن جاتی ہے جو مُردہ میں شمار کی جاتی ہے اور اگر اس کا دوسرا حروف نکال دیں تو وہ ایک کھیل بن جاتا ہے۔

۲ ۔ وہ کون سے دو رشتے ہیں جن کو اگر ہم اُلٹی طرف سے پڑھیں تو بھی ویسے ہی رہتے ہیں۔

۳ ۔ وہ کون سا لباس ہے جس کے آخر کے چار حروف نکالنے سے ایک خطرناک جانور بن جاتا ہے اور اگر شروع کے دو حروف نکال دیں تو اس کے معنی تیزی کے بن جاتے ہیں ۔

۴ ۔ وہ کون سا پرندہ ہے جس کا اگر دوسرا حرف ہٹا دیں تو وہ ایک پھل بن جاتا ہے ۔

۵ ۔ وہ کون سا پرندہ ہے جس کا اگر تیسرا حروف ہٹا دیں تو وہ ایک ہتھیار بن جاتا ہے۔

جوابات :۔ (۱) تلاش (۲) ساس ۔ داماد (۳) شیروانی (۴) بٹیر (۵) تیتر

دانہ دانہ

مرسلہ: محمد عاقل احمد خاں، پرانا سکھر

ہم سب مسلمان ہیں، نہ مہاجر ہیں نہ سندھی، نہ بلوچی، نہ پٹھان نہ پنجابی۔ ہمیں ایک ملّت بن کر رہنا چاہیے۔ آج کل کیسا دَور چل گیا ہے کہ مسلمان مسلمان بھائی کے گلے پر چُھری پھیر رہا ہے۔ کس کی خاطر؟ رنگ و نسل کی خاطر، بولی کی خاطر، صوبے کی خاطر، مگر میرے کہنے سے کیا ہوگا۔ ہمیں نہ صرف سوچنا چاہیے، بلکہ اس پر عمل بھی کرنا چاہیے کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ سب بھائی بن کر رہیں، تاکہ پاکستان کے دشمن ذلیل و خوار ہوں۔

سچائی

مرسلہ، شہر بانو انصاری، ملتان

دو چھوٹی بچیاں ایک بدصورت سیٹھ کے پاس چاکلیٹ بیچنے گئیں اور عام سیلز گرلز کی طرح لمبی چوڑی باتیں بنانے کے بجائے انھوں نے سیٹھ سے درخواست کی کہ وہ ان سے چاکلیٹ کا ایک ڈبا خرید لے۔

"مگر کیوں؟" سیٹھ نے پوچھا۔

ایک بچی نے کہا، "کیوں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں اور چاکلیٹ کے استعمال سے زیادہ خوب صورت بن سکتے ہیں۔"

بدصورت سیٹھ نے فوراً چھے ڈبے خرید لیے اور کہنے لگا، "کاروبار میں فضول باتیں کام نہیں آتیں۔ حقیقت، سچائی، دیانت داری سے کام لیا جائے تو کوئی بھی تمھاری طرح اپنی چیزیں بیچنے میں ناکام نہ ہو۔"

تعاون

مرسلہ: سیّد نفیس الحسن نقوی، جھنگ صدر

بھینس دودھ دیتی ہے، لیکن وہ کافی نہیں ہوتا۔ باقی دودھ گوالا دیتا ہے اور دونوں کے تعاون سے ہم شہریں

رُوح افزا پیجیے ـ رُوح تازہ کیجیے
اس کے رنگ سے آنکھوں میں طراوت، خوشبو سے مشامِ جاں معطّر،
ذائقے سے دل و دماغ آسودہ اور تاثیر سے پورے وجود میں تازگی و توانائی کی لہر۔
رُوح افزا کی یہ ساری خوبیاں رُوح کی مسرّت کا باعث ہیں۔
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد
تعلیم ہماری دولت
اخلاق ہماری قوت
Adarts
HRA-4/89

کا کام چلتا ہے، تعاون اچھی چیز ہے، لیکن دودھ کو چھان لینا چاہیے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

—— ابن انشا

عورت

مرسلہ: حمیرا عبدالرزاق میمنگر یو، حیدر آباد

- سب سے حسین تحفہ ماں ہے۔
- عورت مبارک ہے، کیوں کہ برکتیں اسی کے دم سے ہیں۔
- عورت آسمانی نور ہے جس کی وجہ سے کائنات روشن ہے۔
- عورت کا سب سے حسین روپ ماں ہے۔
- عورت کا دل شیشے کی طرح نازک ہوتا ہے۔
- عورت پھول ہے، شبنم ہے، موم ہے اور جب آنسو بہائے تو سمندر ہے۔

مہکتی کلیاں

مرسلہ: فوزیہ ہاشمی، کوئٹہ

- ذہن کی بینائی سے آنکھوں کی بینائی بہتر ہے۔
- کامیابی ایک سیڑھی کی طرح ہے جس پر انسان اس وقت تک نہیں چڑھ سکتا جب تک وہ قوتِ بازو صرف نہیں کرتا۔
- زندگی سے لطف اندوز ہو، اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو جائے اور تم پچھتاؤ۔
- مشکلات سے چھٹکارے کا بہترین طریقہ سوچ اور غور و فکر ہے۔

تصویر

مرسلہ: محمد راشد، کراچی

لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جگر مُرادآبادی غزل پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک قریبی دوست جب ان کی تصویر کھینچنے لگے تو جگر صاحب بولے، "میری تصویر ایسی نہیں آتی کہ تم گھر میں سجا سکو۔" جگر صاحب بہت کالے تھے۔ ان کے دوست نے کہا، "تصویر سجانے کے لیے نہیں، بچّوں کو ڈرانے کے لیے لے رہا ہوں۔"

اخباری نمائندہ

مرسلہ: خالد حمیدی، روہڑی

ایک اخباری نمائندے نے ایک مشہور آدمی کا طویل انٹرویو لیا۔ وہ جانے لگا تو اس آدمی نے پوچھا، "یہ کب چھپے گا؟"

"یہ تو آپ پر منحصر ہے جناب!" اخباری نمائندے نے جواب دیا۔ "میرے پاس مرحومین کا شعبہ ہے۔"

کرم نوازی

مرسلہ: الماس محبوب، شمالی کراچی

ایک سخت مزاج میجر جنگی مشق کے دوران ایک دریا میں جا گرا۔ ایک سپاہی اس کے پیچھے دریا میں کُودا اور بڑی مشکل سے اسے کنارے پر لے آیا۔ میجر نے دریا سے باہر آکر کہا، "تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی ہے۔ بتاؤ میں تمھارے اس احسان کا بدلا کیسے اُتاروں؟"

سپاہی نے جواب دیا "سر، آپ مجھ پر اتنا احسان کیجیے کہ کمپنی کے جوانوں میں سے کسی کو یہ نہ بتائیے گا کہ میں نے آپ کو ڈوبنے سے بچایا ہے۔"

سات ملک سات کہاوتیں

مرسلہ: عبدالقادر آزاد، لانڈھی

☸ تجربہ وہ کنگھی ہے جو زندگی ہمیں ایسے وقت دیتی ہے جب ہمارے بال جھڑ جاتے ہیں۔

(بلجیم کی کہاوت)

☸ الفاظ کے پیچھے مت بھاگو۔ بلکہ خیالات تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہو گا تو الفاظ خود بخود مل جائیں گے۔ (یونانی کہاوت)

☸ نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقل مندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف اسے قبول نہیں کرتے۔

(عربی کہاوت)

☸ جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تمھاری تنہائی ہی تمھاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)

☸ کپڑے کو کاٹنے سے پہلے سات بار ناپو، کیوں کہ اسے کاٹنے کا ایک ہی موقع ہوتا ہے۔ (روسی کہاوت)

☸ بغیر دیکھے کوئی چیز منھ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (اسپینی کہاوت)

☸ بچھو کی دُم میں زہر ہوتا ہے۔ سانپ کے دانت میں اور مچھر کے سر میں، لیکن بُرے آدمی کے پورے وجود میں زہر ہوتا ہے۔ (سری لنکا کی کہاوت)

ایک لمحہ

مرسلہ: جاوید احمد، کراچی

ایک لمحہ میں نے سوچا کیا ہم مسلمان ہیں؟ لیکن اگر ہم مسلمان ہیں تو ہم میں مسلمانوں کی خصوصیتیں کیوں نہیں ہیں؟ ہم پانچ وقت کی نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ ایک لمحہ میں نے سوچا کیا ہم مسلمان بھائی بھائی ہیں؟ اگر ہیں تو فرقوں اور گروہوں میں کیوں تقسیم ہیں؟

ایک لمحہ میں نے سوچا کیا ہم پاکستان کی حفاظت کر رہے ہیں؟ اگر ہم پاکستان کی حفاظت کر رہے ہیں تو افواہیں کیوں پھیلا رہے ہیں؟ پتھراؤ کیوں کر رہے ہیں؟

ایک لمحہ میں نے سوچا کہ ہم تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں؟ کیا ہم تعلیم حاصل کر کے فوراً اس کے نتائج حاصل کرنا نہیں چاہتے؟ کیا ہم تعلیم سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں؟ ایک لمحہ میں نے سوچا کہ ہم مغربی تہذیب کے نقشِ قدم پر کیوں چل رہے ہیں؟

ایک لمحہ میں نے سوچا کہ ہم مغرب کے پیدا کیے ہوتے میٹھے زہر کے تلخ ذائقے سے کب واقف ہوں گے؟ وی سی آر اور ویڈیو گیم کا زہر آہستہ آہستہ ہماری رگوں میں اندھیرا پیدا کر رہا ہے۔ کیا ہم اس وقت ہوش میں آئیں گے جب وقت گزر چکا ہو گا؟

ایک لمحہ میں نے سوچا کہ میری ان سوچوں کا کیا فائدہ؟ کیا لوگ میری تحریر پڑھ کر ان بُرائیوں کے بارے میں سوچیں گے؟

NEED OF THE DAY

ROSE PETAL®

FACIAL TISSUES
TABLE NAPKINS
MULTI PURPOSE ROLL
TOILET ROLL
PAPER PLATES & CUPS

QUALITY PRODUCTS FROM **PACKAGES LTD.**

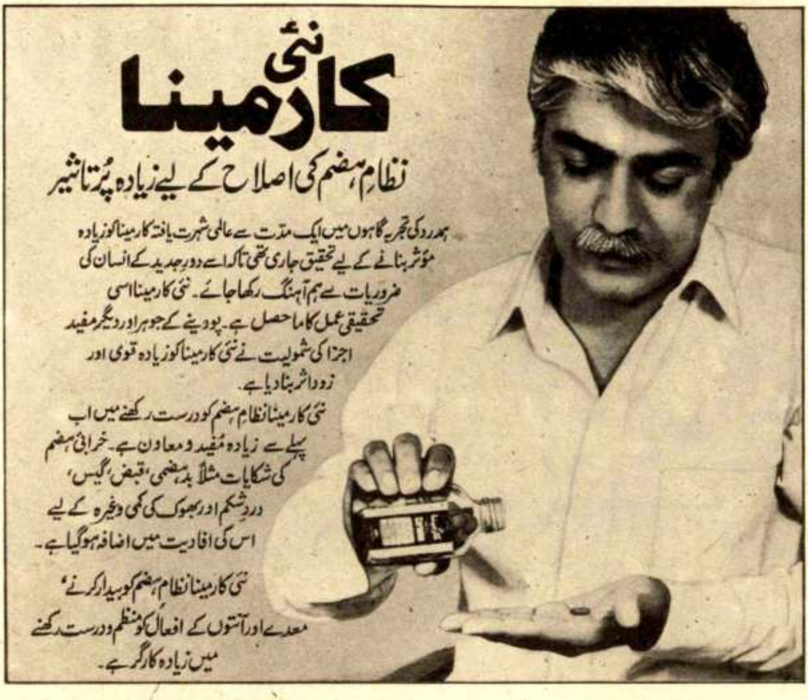

- دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔
- بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چُوسیں۔
- نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
- بُھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چُوسیے۔
- بچّوں کو حسبِ عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا دیجیے۔

خوش ذائقہ **نئی کارمینا**

ہر گھر کی اہم ضرورت

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

پہلا ٹکڑا

مونٹی کرسٹو کا نواب

مصیبتوں کا سمندر عبور کرنے والے باہمت ملاح کی حیرت انگیز کہانی

الیگزینڈر ڈوما

مسعود احمد برکاتی

آپ نے کبھی "کہانیوں کا کارخانہ" بھی سُنا ہے۔ یہ الفاظ ایک بہت بڑے فرانسیسی ادیب الیگزینڈر ڈوما (پیدائش ۱۸۰۲ء) کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔ ڈوما نے پہلے ڈرامے لکھے، پھر کہانیاں لکھیں۔ کہانیاں بہت زیادہ مقبول ہونی شروع ہوئیں تو اس نے خود لکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے ادیبوں کو پیسے دے کر بھی لکھوانا شروع کیا۔ اسی لیے اس کو کہانیوں کا کارخانہ کہا گیا تھا۔ ڈوما کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور فرانسیسی ناول لکھنے والے کو نصیب نہیں ہوئی۔ ڈوما نے پانچ سو کے قریب ناول لکھے۔ اُس کی کئی کتابیں فرانس سے باہر بھی مشہور ہیں۔ کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے اور آج بھی پوری دنیا میں ان کو دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ ڈوما نے تاریخ کو کہانی کے ساتھ ملایا ہے۔ اس کی کہانیاں انتقام اور دولت کی برائیوں کے گرد گھومتی ہیں۔ ڈوما کی چند کتابیں "تین بندوقچی"، "فولادی خود میں انسان"، "ملکہ مارگو" اور "مونٹی کرسٹو کا نواب" خاص طور پر بہت مشہور ہیں۔ ڈوما نے اپنی کہانیوں سے خوب کمایا، مگر جب وہ ۱۸۷۰ء میں مرا تو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اگلے صفحات میں مونٹی کرسٹو کے نواب کا خلاصہ دیا جا رہا ہے۔ اس ناول کے بعض واقعات پر یقین نہیں آتا۔ لیکن پڑھنے والا ہر وقت آگے کیا ہوا کو جاننے کے شوق میں پڑھتا چلا جاتا ہے۔

جہاز کپتان کے بغیر

سب سے پہلے ایک چھوٹے سے بچے کی نظر بحری جہاز "فیرون" پر پڑی۔ یہ جہاز کپڑے اور رنگ لے کر مارسیلز (فرانس) سے آ رہا تھا۔ اس کو دیکھنے کے لیے ایک ہجوم سمندر کے کنارے جمع ہو گیا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں کوئی جہاز بندرگاہ پر پہنچتا تھا تو لوگ بڑے اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ اُس زمانے میں کسی بڑے بحری جہاز کو چلانا ایک مشکل کام ہوتا تھا۔ لیکن فیرون بندرگاہ کی طرف اتنی دھیمی رفتار سے آ رہا تھا کہ تماشائیوں کو لگا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ جہاز کے مالک مسٹر موریل اپنے جہاز کی واپسی کی خبر سُن کر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ انھوں نے پُرانے کپتان لیک لیئر کی جگہ ایک لمبے ملّاح کو جہاز کے انجن پر بیٹھے دیکھا تو ایک کشتی کو جہاز سے لگانے کا حکم دیا۔ وہ جلد سے جلد حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ

جہاز کے قریب پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ جہاز کی کمان ایدمند دانتے کے ہاتھ میں ہے۔ ایدمند نے رسّا لٹکوایا اور موریل جہاز پر چڑھ گئے۔ انھوں نے بڑی بے چینی سے ایدمند کی گہری ذہین آنکھوں میں جھانکا، جن میں ہمدردی جھلک رہی تھی۔ ایدمند بولا:

"جناب، اچھی خبر نہیں ہے۔ کپتان لیک لیئر کا انتقال ہو گیا ہے اور ہم نے ان کو سپردِ سمندر کر دیا۔ جب ہم نیپلز (اٹلی) سے روانہ ہوئے تو وہ یکایک دماغی بخار کا شکار ہو گئے۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ تب میں نے کمان سنبھالی اور کارکنوں سے کام لینے لگا۔ آپ کا جہاز اور اس کا سامان بالکل محفوظ اور صحیح سلامت ہے۔"

یہ خبر سُن کر موریل کے چہرے کے کئی رنگ بدلے۔ ان کا کپتان ختم ہو چکا تھا، لیکن ان کے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ کپتان کا اچھا جانشین تھا۔ ایدمند دانتے مضبوط اور اونچا پورا تھا، اور سمندر سے بھی واقف تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ کئی بحری سفروں کی وجہ سے جُھلس گیا تھا، لیکن اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔ موریل نے ایدمند کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ہاتھ ملا کر کہا، "مجھے اپنے ساجھی سے مشورہ کرنا پڑے گا، لیکن میرا خیال ہے کہ تمھیں فیرون کا کپتان بنانے سے اس کو اتفاق ہو گا۔"

ایدمند کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے کہا، "مجھے امید ہے کہ آپ مجھے موقع دیں گے۔ جہاز کے کارکن میرے بھائیوں کی طرح ہیں اور مجھے امید ہے کہ کوئی ناراض نہیں ہو گا اور...." ایدمند کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو نیچے سے آیا تھا اور اب ان کی طرف آ رہا تھا۔ یہ دُرشت چہرے والا شخص کوئی ۲۶ برس کا ہو گا۔ اس کا نام دانگلر تھا۔ ایدمند نے اپنے آخری جملے کی اصلاح کرتے ہوئے کہا، "صرف ایک آدمی ہے جو بھائی کی طرح نہیں ہے۔ معاف کیجیے سر، میں پہلے لنگر ڈالنے اور جہاز کو کنارے لگانے کی ہدایت دے دوں۔"

دانگلر نے قریب آ کر مالک کو بڑی ظاہری عزت کے ساتھ سلام کیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے اور کہنا شروع کیا:

"جناب، مجھے جہاز کے غلط استعمال کے بارے میں آپ کو بتانا ہے۔ جیسے ہی ہمارے قابل کپتان کا دم آخر ہوا اِس شخص دانتے نے اس کی جگہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے جزیرۂ

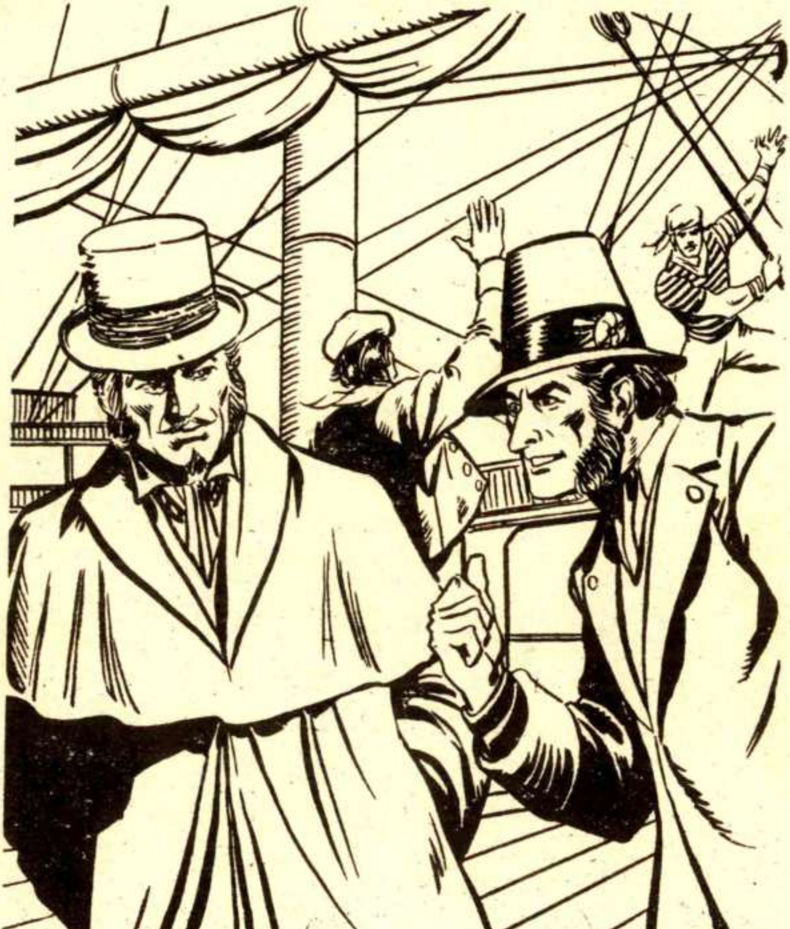

دانگلر نے جہاز کے مالک سے ایڈمنڈ کی شکایت کی

ایلبا میں رُک کر ہمارا وقت بے کار ضائع کیا۔ جہاز کو مرمّت کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ شاید یہ لمبے سفر کے بعد سمندر کے کنارے ہوا خوری کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کم عمر ہے۔"

موریل نے ناپسندیدگی ظاہر کی اور بولے، "یہ بہت غلط بات ہے، لیکن جہاں تک

جہاز کی کمان سنبھالنے کا تعلق ہے، یہ دانتے کا حق ہے، کیوں کہ وہ پہلے نمبر پر ہے۔ یہ تجربہ اچھا ہوا۔ اگر میرا ساجھی راضی ہو گیا تو اب دانتے ہی کپتان ہو گا۔"

اس جواب سے دانگلر بہت مایوس ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ خود کپتان بننا چاہتا تھا، خاص طور پر بڑی تنخواہ کی وجہ سے۔

جب موریل نے ایدمند سے جزیرۂ ایلبا پر رُکنے کے متعلق پوچھا تو اس کا جواب اطمینان بخش تھا۔ اس نے بتایا کہ کپتان لیک لیئر کے دماغ پر اثر ہونے سے ذرا ہی پہلے اس نے جہاز کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ ایدمند کو لیک لیئر کے بجائے نپولین کے سامنے حاضری دینی تھی اور جو کچھ سابق شہنشاہ حکم دے اس پر عمل کرنا تھا۔ نپولین کا نام سُن کر موریل نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ نپولین سے اس کی حکومت چھین لی گئی تھی اور وہ ایلبا میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، لیکن بہت سے فرانسیسی اس کو دوبارہ حکومت دلانے کے لیے خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ موریل ایک تاجر تھے اور سیاست میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایلبا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور ایدمند کو ہدایت کی کہ وہ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرے۔

ایدمند بولا، "کپتان لیک لیئر نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ اور اگر آپ مجھ سے خود نہ پوچھتے تو میں آپ سے بھی ایلبا کا ذکر نہ کرتا۔ سر! اب میں آپ سے چھٹی چاہوں گا۔ سامان کے اندراج کا کام دانگلر کرے گا۔"

موریل مسکرائے، "میرے خیال میں تمھیں شادی کرنے کے لیے رخصت چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک نوجوان خوب صورت لڑکی "مرسیدیز" تمھاری منتظر ہے۔ رخصت منظور کی جاتی ہے۔"

مرسیدیز کی وفاداری اور خوب صورتی کی تعریف سے ایدمند کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "جی سر! ہم فوراً ہی ایک بندھن میں بندھ جانا چاہتے ہیں، لیکن پہلے پیرس جا کر ایک امانت پہنچانا ضروری ہے۔"

ایک گھنٹے بعد ایدمند ایک چھوٹے سے فلیٹ کا زینہ چڑھ رہا تھا جس میں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ خیر

سے گھر کو لوٹ آیا۔ باپ بیٹے کے سفر کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا اور اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا، لیکن اس کو معلوم تھا کہ ایڈمنڈ کا کوئی اور بھی انتظار کر رہا ہے۔ اس نے کہا، "جاؤ بیٹا، اب مرسیڈیز سے مل آؤ۔ اتنے میں، میں اچھا سا کھانا تیار کرتا ہوں۔"

ایڈمنڈ مرسیڈیز کے گھر پہنچا تو وہ اپنے چچازاد بھائی فرنانڈ سے ایک بحث میں اُلجھی ہوئی تھی۔ فرنانڈ فوج میں کام کرتا تھا۔ ایڈمنڈ کے بحری سفر پر جانے کے بعد سے مرسیڈیز کو کئی بار اس قسم کی تلخ باتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فرنانڈ مرسیڈیز سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جب بھی فرنانڈ شادی کا ذکر کرتا مرسیڈیز اس سے صاف کہہ دیتی کہ وہ ایڈمنڈ کو پسند کرتی ہے۔ یہ بات فرنانڈ کو مشتعل کر دیتی اور وہ اپنی تلوار سونت لیتا اور وحشیانہ انداز سے ہوا میں لہرا کر کہتا، "قسم کھاتا ہوں، میں ایڈمنڈ کو جان سے مار دوں گا۔" ہر بار یہ الفاظ سُن کر مرسیڈیز کہتی کہ اگر ایڈمنڈ کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو اس کی بہن کی سی محبت، نفرت میں بدل جائے گی۔ اس وقت بھی مرسیڈیز نے اپنے وہی قطعی الفاظ دُہرائے کہ میں ایڈمنڈ کے علاوہ کسی اور سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔

اسی لمحے ایڈمنڈ داخل ہوا اور مرسیڈیز کا یہ اعلان اس کے کان میں پڑا۔ جیسے ہی مرسیڈیز کی نگاہ ایڈمنڈ پر پڑی وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور اس کی طرف دوڑی۔ دونوں خوش ہوئے اور انھوں نے زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا عہد تازہ کیا۔ جب ایڈمنڈ نے بتایا کہ وہ فیرون جہاز کا کپتان مقرر کر دیا گیا ہے تو مرسیڈیز کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ ذرا پیچھے کھڑے ہوئے فرنانڈ کو دونوں نے بُھلا دیا تھا۔ وہ دونوں کو حسد سے دیکھ رہا تھا۔ فرنانڈ، ایڈمنڈ دانتے سے انتہائی نفرت کرتا تھا، مگر بے بس تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

گرفتاری

آخر جب فرنانڈ سے دونوں کو خوش ہوتے دیکھا نہ گیا تو وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ مرسیڈیز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے کہا، "عزیز چچازاد بھائی، میری خواہش ہے کہ تم میرے ہونے والے شوہر کو گلے لگاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمھیں ایک سچّا دوست پائے گا، جیسا کہ میں

ایڈمنڈ نے مسکراتے ہوئے فرنانڈ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا

نے تمھیں پایا۔" فرنانڈ اس عجیب مطالبے پر پیچھے ہٹ گیا۔ اتنے میں ایڈمنڈ اس کے قریب مسکراتا ہوا آیا اور جب اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو فرنانڈ مجبور ہو گیا۔ اس نے تیزی اور سرد مہری سے ہاتھ ملایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کو خود نہیں معلوم

تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ دانگلر کے پاس سے بغیر دیکھے گزر گیا۔ دانگلر اور ایک اور آدمی ایک سرائے کے باہر میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پینے پلانے کا شغل جاری تھا۔ دانگلر نے فرناند کو آواز دی اور ساتھ ہی بیرے کو ایک گلاس اور لانے کو کہا۔ فرناند اپنا نام سُن کر یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے پوچھا:

"مجھے تم نے پکارا ہے؟"

میز پر دوسرا آدمی ایدمند کا پڑوسی کادیروس تھا۔ اب اس نے جواب دیا:

"ہاں، ہم نے بُلایا ہے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ایک ناکام نوجوان گلیوں میں دیوانوں کی طرح دوڑ رہا ہے تو ہم سمجھ گئے کہ قسمت اس پر مہربان نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم اُس کی تھوڑی سی خاطر کرنا چاہتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے کادیروس نے تیسرے گلاس میں مشروب اُنڈیلا مگر وہ سب نیچے گر گیا۔ کادیروس ہوش میں نہیں تھا۔ وہ سات گلاس چڑھا چکا تھا۔ فرناند کراہتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ چیخا: "اس کو سمندر کیوں نہیں نگل گیا۔ دوسرے لوگ جاتے ہیں تو لوٹتے نہیں۔ ایدمند کیوں واپس آگیا اور مرسیدیز پر حق جتانے لگا۔"

کادیروس نے دانگلر کو آنکھ سے اشارہ کیا اور کہنے لگا "دیکھو بھئی دانگلر، تمھارا ایک بھائی مصیبت میں ہے۔ تم دونوں کو خوب صورت اور خوش قسمت ایدمند دانتے سے نفرت ہے۔" دانگلر ہوش میں تھا۔ اس کا دماغ پوری طرح اسی سوچ بچار میں لگا ہوا تھا۔ اس نے پریشان حال فرناند کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔ اس نے بے پروائی سے کہا کہ کہانیوں میں دو رقیب چاقو سے ایک دوسرے کا کام تمام کر دیتے ہیں، لیکن شاید حقیقی آدمی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی۔

فرناند نے اس جملے کو اپنی توہین سمجھا اور دانگلر کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا "ایک سپاہی اور ایک انسان کی حیثیت سے ایدمند کے سینے میں چاقو اُتار دینے میں مجھے ذرا تامّل نہ ہوتا، لیکن افسوس، مرسیدیز نے مجھے روک دیا ہے۔ مجھے ایدمند کی موت اور مرسیدیز کی نفرت ایک ساتھ ملے گی۔"

(جاری ہے)

انشا پارے

کچھوا اور خرگوش

ایک تھا کچھوا، ایک تھا خرگوش ۔ دونوں نے آپس میں دوڑ کی شرط لگائی ۔ کوئی کچھوے سے پُوچھے کہ تونے کیوں شرط لگائی ؟ کیا سوچ کر لگائی ۔ دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں ۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو نیم کے ٹیلے تک پہلے پہنچے، وہ میری سمجھا جائے ۔ اسے اختیار ہے کہ ہارنے والے کے کان کاٹ لے ۔

دوڑ شروع ہوئی ۔ خرگوش تو یہ جا وہ جا ۔ پلک جھپکنے میں خاصی دُور نکل گیا ۔ میاں کچھوے وضعداری کی چال چلتے منزل کی طرف رُواں ہوئے ۔ تھوڑی دُور پہنچے تو سوچا بہت چل لیے اب آرام بھی کرنا چاہیے ۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے شان دار ماضی کی یادوں میں کھو گئے جب اس دنیا میں کچھوے راج کیا کرتے تھے ۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ میں بھی ان کا بڑا نام تھا ۔ یوں ہی سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خود تو تختِ شاہی پر بیٹھے ہیں، باقی زمینی مخلوق شیر، چیتے، خرگوش، آدمی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں یا فرشی سلام کر رہے ہیں ۔ آنکھ کُھلی تو ابھی سُستی باقی تھی ۔ بولے ابھی کیا جلدی ہے ۔ اُس خرگوش کے بچّے کی کیا اوقات ہے ! میں بھی کتنے عظیم ورثے کا مالک ہوں ۔ واہ بھئی وا میرے کیا کہنے ! "

جانے کتنا زمانہ سوئے رہے تھے ۔ جب جی بھر کے سُستا لیے تو پھر ٹیلے کی طرف رواں ہوئے ۔ وہاں پہنچے تو خرگوش کو نہ پایا ۔ بہت خوش ہوئے ۔ اپنے کو داد دی ۔ واہ رے مستعدی ۔ میں پہلے پہنچ گیا ۔ بھلا کوئی میرا مقابلہ کر سکتا ہے ۔

اتنے میں ان کی نظر خرگوش کے ایک پلّے پر پڑی جو ٹیلے کے دامن میں کھیل رہا تھا ۔ کچھوے نے کہا، " اے برخوردار ! تو خرگوش خاں کو جانتا ہے ؟ "

خرگوش کے بچّے نے کہا، " جی ہاں جانتا ہوں۔ میرے ابّا حضور تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ہیں وہ کچھوے میاں جنھوں نے باواجان سے شرط لگائی تھی۔ وہ تو پانچ منٹ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مدّتوں آپ کا انتظار کرتے رہے، آخر انتقال کر گئے۔ جاتے ہوئے وصیت کر گئے تھے کہ کچھوے میاں آئیں تو ان کے کان کاٹ لینا۔ اب لائیے اِدھر کان "۔

کچھوے نے فوراً اپنے کان اور اپنی سری خول کے اندر کرلی۔ آج تک چُھپائے پھرتا ہے۔

ٹیکسی کا کرایہ

ہمارا قاعدہ ہے کہ کسی بھی وقت پہنچیں، ایک چکّر ہوٹل کے گرد ونواح کا ضرور لگاتے ہیں اور چوں کہ انسان ہیں چوپاتے نہیں، رستہ بھولتے بھی ضرور ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا کہ ٹیکسی والا بھی مشکل سے تلاش کر پاتا ہے اور عین اس روز ہمارے ہوٹل کے آس پاس کے گلی کوچے والوں کا حافظہ ایسا خراب ہوجاتا ہے کہ وہ ہوٹل اور سڑک کا نام سُن کر مُنڈیا ہلا دیتے ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔

رات کے دس ساڑھے دس بجے تھے، لیکن ہم نکلے۔ آگے ایک بڑا چوک تھا۔ نام اس کا میدانِ تحریر ـــ جی خوش ہُوا کہ اس ملک میں لکھنے والوں کی اتنی قدر ہے۔ اس کے مقابلے میں کراچی کو دیکھیے کہ ہمارے نام پر ایک بھی سڑک یا چوک نہیں بلکہ گلی کے سرے پر ہم نے جو ابنِ انشا اسٹریٹ کی تختی اپنے خرچ سے لگائی تھی وہ بھی کارپوریشن والے اُتار کر لے گئے۔ ہم یہ افسوس کر رہے تھے کہ ایک آشنا صورت، نظر پڑی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی جا رہے تھے۔ ہم نے کہا، " حضرت، آپ کہاں ؟ " بڑے خلوص سے سلام دعا ہوئی اور باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ یہاں اہلِ علم کی قدر تو ہے، لیکن میدانِ تحریر کا مطلب ہے لبریشن اسکوائر۔ تحریر کا لفظ حرّیت کا رشتے دار ہے۔ ہم نے کہا، " پھر محرّر، چُنگی محرّر وغیرہ کا بھی یہی مطلب ہوا کہ اپنے عمل میں آزاد ہیں، جس سے جو چاہیں وصول کریں "۔ فرمایا، " وہ بات اپنے ہاں کی ہے "۔ وہ تو یہ وضاحت کر کے چلتے بنے، لیکن ہم چوک کی روشنیوں

میں آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ اس چوک سے کوئی چودہ پندرہ رستے پھٹتے ہیں اور جس اُونچی بلڈنگ کو ہم نے نشانی مقرر کیا تھا ویسی ہمیں دس بلڈنگیں نظر آئیں۔

ہم نے اپنی سڑک کا نام تک یاد نہ کیا تھا کہ دُور تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ ہوٹل کا نام بتا کر پوچھا تو سب نے کہا، " یہ نام تو ہم نے آج ہی سُنا ہے۔ کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟" آخر ہم نے کہا، " لوگو! ہمیں دریائے نیل پر پہنچا دو۔ آگے ہم جانیں ہمارا کام"۔ نیل پر پہنچے۔ وہاں سے نیل کے پُل پر پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری کھڑکی سے تو نیل نظر آتا تھا، لیکن نیل سے ہماری کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مشکل حل کی اور دروازہ کھول کر کہا، " اندر بیٹھیے"۔ ہم بیٹھے، لیکن ٹیکسی دس قدم جا کر یک لخت رُک گئی۔ ہم نے کہا، " یا اُخی! پٹرول ڈلوا کر چلا کرو۔ یوں مسافروں کو راستے میں نہیں رکھا کرتے"۔ بولا، " جی پٹرول تو بہت ہے، لیکن آپ کا ہوٹل آگیا ہے"۔

ہم نے کہا، " یہ بات تھی تو تم اُنگلی کے اشارے سے بتا دیتے"۔ بولا، " جی اُنگلی سے اشارہ کرنا یہاں بدتمیزی سمجھا جاتا ہے اور پھر ٹیکسیاں کاہے کے لیے ہیں؟ آپ لوگوں کی خدمت کے لیے ہی تو ہیں ـــ سات پیاسٹر"۔

پان اور ذبیحہ

ہمارے ہاں کے ایک بزرگ ایک روز جنیوا کے ہوٹل کے باہر سیر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچّوں نے دیکھ لیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ ایک شخص خون تھوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو ہسپتال۔ وہ بہت بھنّائے اور انگریزی میں عذر کرنے لگے کہ میں تو یہ ہُوں، وہ ہُوں۔ مجھے تم جیل نہیں بھجوا سکتے۔ لیکن جنیوا کے کانسٹیبل انگریزی زبان کیا جانیں؟ اتفاق سے ایک بھلے مانس کا گزر ادھر سے ہوا۔ انھوں نے صورتِ حال سمجھی اور سمجھائی اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انھیں دکھائیے۔ بڑی مشکل سے چھٹکارا ہوا۔ لیکن ہوٹل والوں نے ان کے غسل خانے کو بھی رنگین پایا تو بہت جزبز ہوتے۔ یہاں تک تو انھوں نے برداشت کیا، لیکن ایک روز ان بزرگ کو شک ہوا کہ

یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں شاید ذبیحہ نہیں۔ انھوں نے ہوٹل والوں سے کہا، "مجھے اپنا باورچی خانہ دکھائیے"۔ وہ ایسا مصفا اور مجلا تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہمانوں کو فخریہ دکھاتے تھے۔ ان کو بھی لے گئے۔ سارا دودھ کی طرح سفید۔ انھوں نے کہا، "کوئی مرغی لاؤ"۔ وہ سمجھے کہ سوئٹزرلینڈ کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک پلی ہوئی مرغی لاکر انھوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔ انھوں نے اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ پھڑپھڑا کر ان کے ہاتھ سے نکل گئی، لیکن ادھ کٹی گردن کے خون کے چھینٹوں سے سبھی کے کپڑے گلنار ہو گئے۔ سارا باورچی خانہ بھی رنگین ہو گیا۔ یورپ میں خود مرغی یا اور کوئی جانور ذبح کرنا جُرم ہے۔ وہاں بھی وہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھوٹے، لیکن بعد میں اس ہوٹل والے پاکستانی کو دیکھ کر انکار کر دیتے تھے کہ ہمارے ہاں کمرا نہیں ہے۔

لندن میں گوشت کی دکان

پچھلے ہفتے ہم لندن سے باہر لیسٹر اور برمنگھم بھی گئے ..... بالکل گوجرانوالے اور سیال کوٹ کا نقشہ پایا۔ ایک سڑک پر تو ستر فی صد دکانیں پاکستانیوں کی تھیں۔ یونس سویٹ مارٹ سے ہم نے بھی پیڑے اور جلیبیاں کھائیں۔ یہ دکان دین محمد قسائی حلال گوشت والے کی دکان کے عین سامنے ہے۔

یہاں مستقل رہنے والے پاکستانی بالعموم پاکستانی قسائیوں سے گوشت لیتے ہیں۔ جا بجا دکانیں ہیں جن پر لکھا ہے :

"یہاں حلال گوشت ملتا ہے" (بعضے ہلال گوشت بھی لکھتے ہیں)

یہاں قسائی کی دکان آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ جانوروں کا ڈاکٹر باقاعدہ معائنہ کرتا ہے۔ ہماری طرح خانہ ساز اور نہ پڑھی جانے والی جامنی مُہر نہیں ٹھونکی جاتی۔ پھر گوشت کے نہایت نفیس پارچے مومی کاغذ میں سجے ہوتے ہیں۔ ان پر ان کی قسم اور قیمت لکھی رہتی ہے۔ بیچنے والا سفید بُرّاق ایپرن باندھے ہوتا ہے۔ شیشوں کے دروازے، کھڑکیاں اور ٹھنڈا رکھنے کو فریج۔ کئی بار تو یہ گوشت کچّا کھانے کو جی چاہتا ہے۔

• • •

نونہال مصوّر

جمیلہ گل، مقام نامعلوم

عنبر سعید، کراچی

ارم باری، کراچی

سعید الرحمان چشتی، بہاولنگر

آصف مغل، کراچی

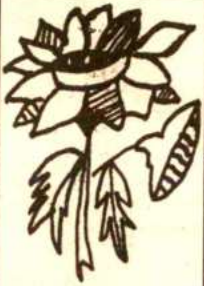

کاشف عزیز، کراچی

پارس مغل، حیدرآباد

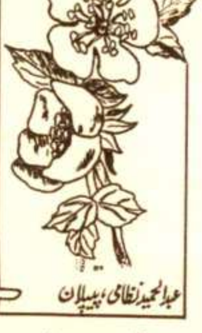

عبدالحمید نظامی، پیپلاں

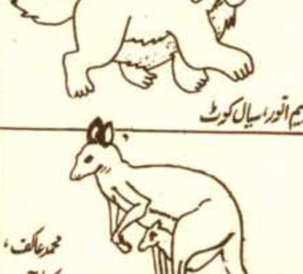

وسیم انور، سیالکوٹ

امین اسماعیل، کراچی

فہد، سائرہ، کراچی

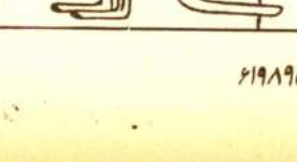

محمد عاکف، کراچی

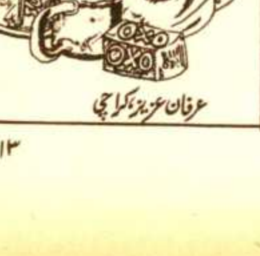

عرفان عزیز، کراچی

کے ای ایس سی

آنکھوں کے ساتھ ذہنوں کو روشن رکھنے میں بھی

ہمہ وقت کوشاں ہے

گھروں، بستیوں، بازاروں اور کارخانوں کو روشنی اور برقی توانائی مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں ذہنوں کو روشن کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی سعادت بھی حاصل ہے

کے ای ایس سی، شاہراہوں، کھیل کے میدانوں سے لیکر صحت، تعلیم اور سماجی بہبود کے اداروں تک زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو روشن رکھنے میں دن اور رات مصروف ہے۔

آپ کا مخلص اور کارگزار قومی ادارہ

آپ کے خدمت گزار

کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن لمیٹڈ

دھاریوں والا سانپ

سر آرتھر کانن ڈائل

ترجمہ : اشرف نوشاھی

میں ڈاکٹر واٹسن ہوں۔ دھاریوں والے سانپ کا وہ پہلا کیس تھا جس میں مجھے اپنے دوست شرلک ہومز کی مدد کرنے کا موقع ملا۔

اب اس واقعے کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ اس سارے قصّے کا آغاز ۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں ہوا۔ اپریل کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ ایک صبح شرلک ہومز نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ آنکھیں کھولیں تو شرلک کو بستر کے پاس کھڑے پایا۔

شرلک نے کہا، "معاف کرنا واٹسن، تمھیں جگائے بغیر نہ رہ سکا۔"

میرے منھ سے نکلا، "کیوں، کیا ہوا؟ کیا کہیں آگ لگ گئی ہے؟"

"ایک عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔ وہ حد سے زیادہ پریشان ہے اور میری مدد چاہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ہماری باتیں سنو۔"

میں اس پیش کش پر پھولا نہ سمایا۔ شرلک پہلی بار مجھے کسی کیس میں شریک کر رہا تھا۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ شرلک ہومز اپنے جاسوسی کاموں میں مجھے بھی شریک کرے۔ میرا دل چاہتا

تھا کہ میں بھی اس کا ساتھ دوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کوئی پیشہ ور جاسوس نہیں تھا، بلکہ صرف اپنی ذاتی دل چسپی اور لوگوں کی مدد کے لیے یہ کام کیا کرتا تھا۔ اُسے دولت کی کوئی خواہش نہ تھی۔

جیسے ہی ہم دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے کالا لباس پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

ہومز نے اپنا اور میرا تعارف کرایا اور اس سے اس کی آمد کے بارے میں پوچھا۔ مگر وہ تو بُری طرح کانپ رہی تھی۔ ہومز نے کہا، "آیئے، اس کرسی پر تشریف رکھیے۔ آپ کو سردی لگ رہی ہے۔ میں آپ کے لیے کافی کا کپ لاتا ہوں۔"

خاتون نے بڑے دھیمے انداز میں کہا، "جی نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں سردی سے نہیں کانپ رہی۔"

"تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے آپ پر لرزہ طاری کر دیا ہے؟"

"وہ خوف ہے مسٹر ہومز، دہشت ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا نقاب اُٹھا دیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

میرے دوست نے ہمدردانہ لہجے میں کہا، "ڈریے نہیں، آپ سب کچھ ہمیں بتا دیجیے۔ آپ لندن کی رہنے والی تو نہیں ہیں۔ کیا آپ آج صبح کی پہلی ٹرین سے یہاں آئی ہیں؟"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی، "جی ہاں، آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ میں گھر سے چھے بجے کے قریب نکلی تھی اور ٹرین سے یہاں پہنچی ہوں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں نے آپ کی ذہانت اور انسان دوستی کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ آپ نے میری ایک دوست کو سخت مشکل سے نکال لیا تھا۔ اُسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ میں یہ بھی سچ سچ کہے دیتی ہوں کہ ابھی میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے، لیکن ایک یا دو مہینے میں میری شادی ہو جائے گی۔ اس وقت میرے پاس کافی رقم آ جائے گی۔ کیا آپ اس وقت تک انتظار کر لیں گے؟"

ہومز نے خاتون کی ساری بات بڑے صبر کے ساتھ سُنی اور جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو بولا:

"میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کروں گا۔ جہاں تک میری فیس کی بات ہے تو فی الحال اس بکھیڑے کو چھوڑ کر اپنی اصل پریشانی بتائیے۔"

خاتون نے سکون کا سانس لے کر کہا، "لیکن میں آپ کو کس طرح بتاؤں، مجھے ڈر ہے کہ میں جو کچھ بھی کہوں گی آپ اُسے ایک خوف زدہ عورت کا وہم سمجھ کر مذاق میں اُڑا دیں گے۔"

"اس خوف کو بھی دل سے نکال دیجیے اور جو کچھ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کہہ سکتی ہیں کہہ ڈالیے۔"

ہومز کے تسلّی دینے پر اس خاتون نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی:

"میرا نام ہیلن ہے۔ میں اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرا سوتیلا باپ انگلستان کے ایک مشہور اور معزّز خاندان "رویلٹ" کا آخری فرد ہے۔ یہ خاندان کبھی انگلستان کا امیر ترین خاندان تھا۔ اس کی جائداد شمال میں برک شائر سے لے کر مغرب میں ہیمپ شائر تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن پچھلے سو سال کے دوران اس خاندان کے افراد ایسے بے پروا اور غیر ذمّے دار رہے کہ اب اس کے پاس تھوڑی سی زمین اور دو سو سال پُرانا ایک مکان رہ گیا ہے۔ پچھلی نسل میں سب سے بڑا لڑکا ڈاکٹر بن گیا اور ہندُستان چلا گیا۔ وہاں وہ بڑی کامیابی سے پریکٹس کرتا رہا۔ لیکن پھر اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ اس کے اچھے دن بُرے دنوں میں بدل گئے۔ ایک بار اس کے گھر میں چوری ہو گئی۔ اس کی بہت سی قیمتی چیزیں غائب ہو گئیں۔ اس نے اپنے ایک غریب نوکر پر سارا الزام رکھ دیا اور اس کو اتنا مارا کہ وہ غریب مر گیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" ہومز نے پوچھا۔

"پھر یہ ہوا کہ ڈاکٹر کو اس وحشیانہ حرکت کی وجہ سے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد اُس نے ہندُستان میں رہنا پسند نہ کیا اور انگلستان لوٹ آیا۔"

ہیلن نے سانس لے کر دوبارہ بولنا شروع کیا:

"جب ڈاکٹر رویلٹ ہندُستان میں تھا تو اس نے میری ماں سے شادی کر لی تھی۔ ہمارا باپ مر چکا تھا۔ میں اور میری جُڑواں بہن اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ آٹھ سال بعد ہماری ماں بھی مر گئی اور ہمارا سرپرست صرف ڈاکٹر رویلٹ رہ گیا۔ ہماری ماں کی بہت سی دولت بھی تھی جس کا وارث ہمارا سوتیلا باپ بن گیا۔ ہماری ماں نے اتنا ضرور کیا کہ اس کی وصیت کے

مطابق ہمیں شادی پر کچھ دولت حاصل کرنے کا حق مل گیا۔ ہم دونوں بہنوں کو دولت کی پروا نہ تھی۔ ہمارے سوتیلے باپ کا رویّہ دن بدن بدلتا چلا گیا۔"

"اس کے رویّے میں آپ نے کیا تبدیلی محسوس کی؟" ہومز نے پوچھا۔

"وہ ہمیں کسی سے ملنے نہیں دیتا تھا۔ ہمارے پڑوسی اس بات پر بہت خوش تھے کہ روئیلیٹ خاندان کا پُرانا گھر پھر سے آباد ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارے سوتیلے باپ نے ہر ایک سے قطع تعلق کر لیا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا اور جب بھی نکلتا لوگوں سے جھگڑا شروع کر دیتا۔ وہ پورے علاقے میں بدنام ہو گیا۔ لوگ خود ہی اس سے کترانے لگے۔ وہ اس کے غصّے سے بہت ڈرتے تھے۔

ہمارے سوتیلے باپ کی اگر کسی سے دوستی ہے تو وہ کچھ خانہ بدوش ہیں۔ اُس نے ان لوگوں کو نہ صرف اپنی زمین میں خیمے گاڑنے کی اجازت دے دی ہے بلکہ کبھی کبھی خود بھی ان کے ساتھ سفر پر نکل جاتا ہے۔ ان کے خیموں میں بھی جا کر سوتا ہے۔ اُس نے بہت سے جانور اور سانپ بھی پال رکھے ہیں۔ یہ جانور اور سانپ وہ ہندستان سے لایا ہے۔ وہ ان جانوروں اور سانپوں کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اور وہ سارے گھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ میری اور میری بہن جولیا کی زندگی کس طرح گزری ہو گی۔"

"تمھاری بہن جولیا؟" ہومز نے چونک کر پوچھا۔

"وہ مر چکی ہے۔ اس کی عمر بھی اس وقت تیس برس تھی جب وہ مری اور اس کے بال اس عمر میں ایسے ہی سفید تھے جیسے کہ میرے ہیں۔ اُسے مرے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔ دو سال پہلے کی بات ہے میں اور جولیا اپنی ایک دُور کی خالہ کے پاس لندن میں کرسمس منانے گئے۔ وہیں خالہ نے جولیا کی شادی طے کر دی۔ چناں چہ ہم نے واپس جا کر یہ خوش خبری ڈاکٹر کو سنائی۔ وہ سُن کر خوش ہوا، لیکن شادی کی جو تاریخ طے ہوئی اُس سے صرف دو ہفتے پہلے ایک خوف ناک واقعہ پیش آ گیا۔"

ہومز، ہیلن کی کہانی سُنتے ہوئے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن آخری جملہ سُنتے ہی اس کی آنکھیں کُھل گئیں۔

ہیلن نے اپنی بات پھر شروع کی، "پہلے آپ میرے گھر کا نقشا سمجھ لیجیے۔ ہم سب کے سونے

کے کمرے نچلی منزل پر ہیں۔ پہلا کمرا ڈاکٹر کا ہے دوسرا جولیا کا اور تیسرا میرا۔ یہ سب کمرے ایک ہی راہداری میں کھلتے ہیں۔ ہمارے سب کمروں کی کھڑکیاں باہر باغیچے میں کھلتی ہیں۔ اُس رات جب جولیا کا انتقال ہوا ڈاکٹر رویئلٹ شام ہی کو اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ بعد میں ہم دونوں بھی اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جولیا میرے کمرے میں آگئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ نیند نہیں آرہی ہے، کیوں کہ ڈاکٹر رویئلٹ سگرٹ پی رہا ہے جس کا دھواں جولیا کے کمرے میں آرہا ہے۔ میں نے اس کو بٹھا لیا۔ رات گیارہ بجے تک ہم دونوں نے باتیں کیں۔ جب جولیا جانے لگی تو میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔ اس کے الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔

"ہیلن، کبھی تم نے رات کے پچھلے پہر سیٹی کی آواز سُنی ہے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ میں نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سُنی۔ اس پر جولیا نے کہا کہ شاید میں سوتے میں سیٹی بجاتی ہوں۔ میں نے اس سے بھی انکار کیا اور اس سے پوچھا کہ یہ سب پوچھنے کا کیا مقصد ہے۔ جولیا نے مجھے بتایا کہ میں پچھلی چند راتوں سے صبح تین بجے کے قریب ایک ہلکی لیکن صاف سیٹی کی آواز سُن رہی ہوں۔ آواز اتنی صاف ہوتی ہے کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید باغیچے کے خانہ بدوشوں میں سے کوئی بجاتا ہو۔ وہ چلی گئی اور چند لمحے بعد مجھے اس کا کمرا لاک ہونے کی آواز آئی۔"

"کیا آپ لوگ ہر رات کمرا اندر سے بند کر کے سوتے ہیں؟" ہومز نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ہیلن نے مختصر جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ رات کو بھی جانور اور سانپ کھلے پھرتے ہیں۔"

ہیلن نے اپنی کہانی پھر شروع کی:

"اس رات مجھے بالکل نیند نہ آسکی۔ باہر طوفان آیا ہوا تھا۔ ہوائیں شور مچا رہی تھیں اور بارش کا پانی کھڑکیوں پر ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اچانک میں نے کسی کی خوف زدہ چیخ سُنی۔ میں تیزی سے نکل کر راہداری میں آئی تو میں نے بھی وہ ہلکی سی سیٹی سُنی جس کا ذکر جولیا کرتی رہتی تھی سیٹی کے ساتھ ہی میں نے لوہے کی کوئی چیز گرنے کی آواز سُنی۔ جولیا نے دروازہ کھول دیا تھا اور وہ

راہداری میں آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اُس کی طرف لپکی۔ وہ بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ فرش پر گر گئی۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا، "دھاریوں والا سانپ۔ وہ سانپ تھا. . . . ." اُس نے اُنگلی اُٹھا کر ایک طرف اشارہ کرنے کی کوشش بھی کی، مگر ناکام رہی۔ اسی دوران ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا اور ہم دونوں نے اسے بچانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن افسوس وہ نہ بچ سکی۔"

"اچھا ایک منٹ!" ہومز نے کہا، "کیا آپ کو مکمل یقین ہے کہ آپ نے سیٹی بھی سُنی اور پھر لوہے کی کسی چیز کے گرنے کی آواز بھی؟"

"جی ہاں، میرا خیال ہے کہ میں نے یہ آوازیں سُنی تھیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طوفان کی وجہ سے مجھے دھوکا ہوا ہو۔" ہیلن نے جواب دیا۔

"جولیا کے ہاتھ میں کچھ تھا؟"

"جی ہاں، اس کے دائیں ہاتھ میں ایک جلی ہوئی ماچس کی تیلی اور بائیں ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا تھی۔"

ہومز نے کہا، "یہ بات اہم ہے۔ یقیناً اس نے موم بتی جلا کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔"

پھر ہیلن نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"پولیس نے اس سارے معاملے کی بڑی چھان بین کی، لیکن موت کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ کمرے میں جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لیے کسی کو اندر جا کر جولیا کو مار ڈالنا ممکن نہ تھا۔"

ہومز نے پوچھا، "زہر کا بھی کوئی ثبوت نہ ملا؟"

ہیلن نے جواب دیا، "نہیں، ڈاکٹری معائنے سے ایسی کوئی بھی بات معلوم نہیں ہوئی۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ خوف اور دہشت سے مر گئی۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم یہ خوف تھا کس چیز کا؟"

"اچھا یہ بتائیے کہ جس رات وہ مری اس رات آپ کے باغیچے میں خانہ بدوشوں کے خیمے تھے؟" ہومز نے ایک اور سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

ہومز نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، "اور دھاریوں والے سانپ سے اس کی کیا مُراد تھی؟"

ہیلن نے کہا، "اس بارے میں میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"
ہومز نے کہا، "آپ کی کہانی عجیب ہے۔ آپ پوری کہانی سنائیے۔"
"دو سال ہوتے جولیا مر گئی۔ تب سے میں بالکل تنہا ہوں۔ اب پچھلے ہی ماہ پرسی سے میری شادی طے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر روئیلٹ نے پرسی کو پسند کر لیا ہے اور اگلے موسم بہار میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ لیکن ابھی دو دن پہلے میرے سوتیلے باپ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں جولیا کے کمرے میں منتقل ہو جاؤں تاکہ میرے کمرے کی مرمت کرائی جا سکے۔ پچھلی رات میں جولیا کے کمرے ہی میں سوئی تھی اور میں نے وہی سیٹی کی آواز سُنی جو جولیا کی موت والی رات سُنی تھی۔ میں ساری رات جاگتی رہی اور صبح ہوتے ہی پہلی ٹرین سے یہاں پہنچ گئی۔"
ہومز نے کہا، "آپ نے بہت اچھا کیا، لیکن آپ نے اب بھی کچھ باتیں نہیں بتائی ہیں۔ آپ اپنے سوتیلے باپ کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں؟"
"میں سمجھی نہیں۔" ہیلن حیران ہو گئی۔
"آپ بتائیں یا نہ بتائیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بہت ظالم شخص ہے اور آپ کو مارتا پیٹتا بھی رہتا ہے۔" ہومز نے کہا۔
ہیلن نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔
پھر ہومز نے کہا: "آپ کو یہ انتظام کرنا ہوگا کہ ہم ڈاکٹر کے علم میں آئے بغیر وہاں آ سکیں۔"
ہیلن نے بتایا کہ ڈاکٹر بھی آج لندن آ رہا ہے۔ وہ سارا دن یہاں رہے گا۔ آپ لوگ آج ہی وہاں آ جائیں۔ میں ابھی واپس جا رہی ہوں اور آپ لوگوں کا انتظار کروں گی۔ یہ کہہ کر ہیلن نے نقاب اُلٹا اور کمرے سے نکل گئی۔
ہیلن کے جاتے ہی ہومز میری طرف متوجہ ہوا اور بولا، "ہاں تو میرے دوست ڈاکٹر واٹسن! تمھارا کیا خیال ہے؟"
"میرے خیال میں تو معاملہ کافی گڑبڑ ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ جب جولیا کی شادی ہونے والی تھی تو وہ مر گئی۔ اگر شادی ہو جاتی تو وصیت کے مطابق جولیا کو اس کا حصہ مل جاتا۔ شاید یہ بات ڈاکٹر روئیلٹ کو پسند نہ ہو۔"
ہومز نے تائید کی، "یہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس نے جولیا کو قتل کس طرح کیا؟ کیا اس نے

خانہ بدوشوں سے مدد لی ہوگی؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے اپنی بے چارگی ظاہر کی۔

"اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہی ہم وہاں جاکر خود ہر شے کو دیکھ کر جلد سے جلد کوئی نتیجہ نکالیں۔ ہیلن کی زندگی خطرے میں ہے۔" ہومز یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف چلا۔ غالباً وہ جلد سے جلد سفر کی تیاری کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن ابھی وہ دروازے سے دُور ہی تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھلا۔ ایک ہٹا کٹا شخص دروازے میں کھڑا ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔

"تم میں سے شرلک ہومز کون ہے؟" اُس نے بڑی بدتمیزی سے کہا۔

ہومز نے کہا، "جناب عالی! شرلک ہومز مجھے کہتے ہیں۔ براہِ کرم فرمائیے آپ کون ہیں؟"

"میں اسٹاک مورن سے آیا ہوں اور میرا نام ڈاکٹر رو ئیلٹ ہے۔" نووارد نے اپنا تعارف کرایا۔

ہومز نے خوش اخلاقی سے کہا، "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ تشریف رکھیے۔"

ڈاکٹر نے رُکھائی سے کہا، "میں بیٹھنے نہیں آیا۔ میری بیٹی یہاں آئی تھی۔ بتاؤ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

"میرا خیال ہے آج سردی بہت ہے۔" ہومز کے منھ سے نکلا۔

"وہ تم سے کیا کہہ رہی تھی؟" ڈاکٹر چیخا۔

"سردی کے باوجود پھول کھل رہے ہیں۔" ہومز نے بھی اسی انداز کو برقرار رکھا۔

ڈاکٹر نے دانت پیس کر کہا، "ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم آفت کے پرکالے ہو۔ مصیبتوں کی جڑ! میں تمھارے بارے میں پہلے ہی سے جانتا ہوں۔ تم ایک ایسے آدمی ہو جو تھانے دار بننا چاہتا ہے۔"

ہومز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا، "ٹھیک ہے، لیکن جب تم باہر جاؤ تو دروازہ بند کرتے جانا۔ سردی بہت ہے۔"

ڈاکٹر غرّایا، "میں جا رہا ہوں، لیکن یہ سُن رکھو کہ میں بہت برا آدمی ہوں۔ مجھ سے ٹکرانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے شرلک ہومز کی طرف دیکھا اور کہا، "میرا خیال ہے وہ ہیلن کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

شرلک ہومز نے کہا، "تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن اس کے باوجود ہمیں کوئی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ہم ہیلن کے قصبے اسٹاک مورن پہنچیں۔ مجھے اس آدمی کے متعلق کچھ معلومات جمع کرنی ہوں گی جو ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ اس غرض سے مجھے ابھی رِکارڈ آفس جانا ہے۔"

یہ کہہ کر شرلک ہومز اُسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا اور جب واپس پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کام یاب لوٹا تھا جس کا ثبوت اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذات تھے۔ یہ کاغذات وہ نوٹس تھے جو اس نے رِکارڈ آفس میں بیٹھ کر بنائے تھے۔

"میں نے ڈاکٹر کی بیوی کا وصیت نامہ دیکھا ہے جو آٹھ سال پہلے کا ہے۔ اس وصیت نامے میں صاف صاف تحریر ہے کہ اگر لڑکیوں نے شادی کر لی تو وہ ساری رقم جو ڈاکٹر کو ملی ہے لڑکیوں کو منتقل ہو جائے گی اور بہت کم سرمایہ ڈاکٹر کے پاس رہ جائے گا۔ اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر۔" ہومز نے مجھے بتایا۔

میں نے کہا، "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھاری صبح ضائع نہیں ہوئی اور تمھاری اس کوشش سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ڈاکٹر کے پاس لڑکیوں کو شادی سے روکنے کا مکمل جواز موجود ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے اور اب تو ڈاکٹر کو یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ہم اس معاملے میں کود پڑے ہیں۔ اس لیے ہمیں وقت کو ضائع کیے بغیر اسٹاک مورن پہنچ جانا چاہیے۔ تم اپنا پستول بھی لے لو اور ٹوتھ برش بھی ساتھ رکھ لو۔ ہمیں ایک رات وہاں گزارنی ہے۔"

سفر کے لیے وہ ایک اچھا دن تھا۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی، لیکن آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل بھی تیرتے پھر رہے تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی اور درختوں کی ٹہنیوں پر نئے پتّوں کی ہریالی پھوٹ چکی تھی۔ لیکن اس خوش گوار موسم میں ہم ایک ناخوش گوار جگہ جا رہے تھے۔

جب ہم اسٹاک مورن پہنچے تو ہیلن ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

ہومز نے کہا، "دیکھیے ہم وعدے کے مطابق آ گئے ہیں۔"

"میں بے چینی سے آپ کی منتظر تھی۔ ڈاکٹر لندن جا چکا ہے اور شام سے پہلے نہیں آئے

گا۔" ہیلن نے خوشی سے مسکرا کر کہا۔
"ڈاکٹر سے تو ہماری ملاقات ہو گئی ہے۔ وہ واقعی اچھا آدمی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب آپ وہاں آئیں تو وہ بھی آپ کے پیچھے پیچھے آیا۔ اُس نے یہ معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ آپ نے ہم سے کیا کہا ہے اور جب ناکامی ہوئی تو بگڑتا ہوا چلا گیا۔"
ہومز تو کہتا چلا گیا، لیکن اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہیلن کا چہرہ سفید ہوتا چلا گیا۔ وہ تقریباً چیخ پڑی، "اللہ کی پناہ! وہ میرا تعاقب کر رہا تھا۔"
"ہاں۔"
"پھر تو اللہ ہی جانے میں کیسے بچوں گی۔ اللہ جانے اب وہ یہاں آکر میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔"
"گھبرانے کی بات نہیں۔" ہومز نے اُسے تسلّی دی، "آپ اپنا دروازہ لاک کر لیجیے گا بلکہ میں تو کہوں گا کہ آپ کل صبح ہی اپنی خالہ کے پاس چلی جائیں جن کے پاس پہلے گئی تھیں۔ فی الحال آپ بے فکر رہیں اور ہمیں اپنا گھر دکھا دیں۔"
ہیلن نے ہمیں تینوں سونے کے کمرے دکھائے۔ ہیلن کے سونے کا کمرا بھی ہم نے دیکھا۔ کمرا بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور مرمت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ڈاکٹر نے ہیلن کو جولیا کے کمرے میں لانے کے لیے چال چلی تھی۔
ہومز نے ہر کمرے کے دروازے غور سے دیکھے اور اس بات کی تسلّی کر لی کہ اندر سے دروازے سے لاک ہونے کے بعد کسی کا بھی اندر آنا ممکن ہی نہیں۔ کھڑکیوں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ کھڑکیوں کو اندر سے لاک کر کے باغیچے سے ان کو کھولنے اور کمروں میں جانے کی ہر کوشش کو ناکام پایا گیا۔ اس لیے ہومز نے یہ خیال بھی رد کر دیا کہ خانہ بدوش بھی جولیا کی موت میں شریک تھے۔
آخر میں ہم نے جولیا کا کمرا دیکھا۔ ایک میز، دو کرسیاں اور ایک پلنگ بمشکل اس چھوٹے سے کمرے میں سمائے ہوئے تھے۔ ہومز نے ایک کرسی ایک کونے میں رکھی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں کمرے کے کونے کونے میں گھومنے لگیں۔ پھر اُس نے ایک موٹی ڈوری کی طرف اشارہ کیا جو بستر کے قریب یوں لٹکی ہوئی تھی جیسے کھینچنے پر گھنٹی بجتی ہو گی۔

"جب یہ ڈوری کھینچی جائے تو گھنٹی کون سُنتا ہے؟"
"یہ نوکروں کے کمرے میں بجتی ہے۔" ہیلن نے بتایا۔
"لیکن یہ باقی سامان کی نسبت نئی لگ رہی ہے۔" ہومز نے خیال ظاہر کیا۔
جواب میں ہیلن نے بتایا کہ یہ صرف دو سال پہلے لگائی گئی ہے۔ لیکن اس کے لیے جولیا نے نہیں کہا تھا۔ گھر میں کوئی نوکر تھا ہی نہیں۔ سب کام خود ہی کرنے ہوتے تھے۔
اس کے بعد ہومز پلنگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر اس نے اچانک گھنٹی کی ڈوری کھینچی اور بولا "اوہ یہ اصلی گھنٹی تو نہیں لگتی۔"
وہ ڈوری کسی بھی گھنٹی سے نہیں بندھی ہوئی تھی، نہ اس کے کھینچنے پر کہیں گھنٹی بجتی تھی اور جہاں پر یہ ڈوری ایک چھوٹی سی کیل کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اس کے ذرا ہی اوپر ایک سوراخ تھا۔ ہومز نے یہ سب ہیلن کو دکھایا تو وہ بے حد حیران ہوئی کہ اس نے پہلے کبھی ان سب باتوں پر غور نہیں کیا۔
ہومز نے کہا "یہ سب کچھ بے حد پُراسرار ہے۔ دو کمروں کے درمیان اس سوراخ کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ سوراخ ہوا کے لیے ہوتا تو باغیچے کی طرف ہوتا۔ یہ ڈاکٹر اور جولیا کے کمرے کے درمیان کیوں ہے؟"
کچھ دیر بعد ہومز نے ڈاکٹر کے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کمرے کا فرنیچر بھی سادہ تھا، لیکن یہ کمرا باقی دونوں کمروں سے بڑا تھا۔ کمرے کا سامان ایک گول میز، آرام دہ کرسی اور لوہے کی ایک تجوری پر مشتمل تھا۔ ہومز کی آنکھیں بڑی توجہ سے ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی تجوری پر آ ٹھیریں۔
"اس میں کیا ہے؟" وہ ہیلن سے مخاطب ہوا۔
"میرے سوتیلے باپ کے کاغذات۔" ہیلن نے خیال ظاہر کیا۔
"ہاں برسوں پہلے میں نے کھول کر دیکھا تھا اور یہ اوپر تک کاغذات سے بھری ہوئی تھی۔" ہیلن نے کہا۔
"لیکن یہاں کوئی بلّی تو نہیں ہے؟" ہومز نے ایک انوکھا سوال کر ڈالا۔
"نہیں، لیکن آپ نے یہ کیوں پوچھا؟" ہیلن حیران ہوگئی۔

جواب میں ہومز نے اُسے دودھ سے بھرا ایک چھوٹا سا پیالا دکھایا۔ ہیلن نے تسلیم کیا کہ ایسا کوئی بھی جانور موجود نہیں جو دودھ پیتا ہو۔

ڈاکٹر کے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد ہومز باغیچے میں آنکلا۔ لیکن جس وقت شرلک ہومز اس کمرے سے جا رہا تھا تو اس کے چہرے پر اس قدر سنجیدگی تھی کہ میں نے بہت کم اُسے اِس قدر سنجیدہ پایا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے بھی یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے اندر کسی کے خلاف شدید غصّے کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ اور باغیچے میں بھی کافی دیر ٹہلتے رہنے کے بعد اس کے منہ سے جو بات نکلی وہ یہ تھی :

"آپ کو میری ہر بات پر مکمل عمل کرنا ہوگا۔"

ہیلن نے جواباً ہامی بھرلی۔ چناں چہ ہومز اُسے سمجھاتا رہا کہ معاملہ اِس قدر نازک ہے کہ اب اُس کی زندگی کا انحصار شرلک ہومز کی ہدایات ماننے پر ہے۔ ہومز اور میں آج رات اسی گھر میں رہیں گے اور ہمارا قیام ہیلن کے کمرے میں ہوگا۔ ہیلن سرِ شام اپنے کمرے میں چلی جائے گی اور جب اُسے علم ہوگا کہ ڈاکٹر اپنے کمرے میں آگیا ہے تو وہ اپنی کھڑکی کھول دے گی اور لیمپ جلا دے گی۔ اس وقت ہومز اور میں قریبی سرائے میں ہوں گے جہاں سے وہ روشنی صاف نظر آئے گی۔ روشنی دیکھ کر ہم آجائیں گے اور کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہوں گے۔ یقیناً ہومز کی مُراد اُس کمرے ہی سے تھی جس میں ہیلن عارضی طور پر مقیم تھی، یعنی جولیا کا کمرا۔

ہومز نے ہیلن کو یہ بھی ہدایت دی کہ کھڑکی کھولنے اور لیمپ روشن کر دینے کے بعد وہ اپنے اصل کمرے میں چلی جائے گی۔

یہ منصوبہ ہیلن کو سمجھا کر ہم قریبی سرائے کی طرف چل پڑے تاکہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اُس گھر سے نکل جائیں۔

سرائے سے ہم دونوں کو ہیلن کا گھر بہ آسانی نظر آرہا تھا اور ہم دونوں اس طرف نظر جمائے بیٹھے تھے۔ ہومز مجھے بتا رہا تھا کہ جولیا اور ڈاکٹر کے کمرے میں موجود سوراخ کس قدر اہم ہے۔ اُسی سوراخ سے ڈاکٹر کے سگرٹ کا دھواں جولیا کے کمرے میں جاتا تھا، پھر یہ سوراخ جولیا کی موت سے چند دن پہلے بنایا گیا۔ دھوکا دینے کے لیے رسّی لٹکائی گئی لیکن وہ رسّی کسی بھی کام

کی نہیں۔ اُس کا اُوپری سرا سوراخ سے ذرا نیچے ایک کیل سے بندھا ہوا تھا۔ کمرا اس قدر چھوٹا تھا کہ پلنگ کو ہمیشہ ایک ہی جگہ پر رہنا تھا اور اس پلنگ پر لیٹنے والی جولیا پُراسرار طور پر مر چکی تھی۔ اب سوتیلے باپ نے دوسری بہن کو بھی اس پلنگ پر لیٹنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

"اوہ میرے اللہ! یہ تو ایک اور قتل کی تیاری ہے۔" میں نے کہا۔

ہومز کی آنکھیں مسکرائیں، لیکن لب خاموش رہے اور اسی وقت دُور لیمپ جل اُٹھا۔ اُس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

"آؤ، اشارہ ہو گیا ہے۔" ہومز نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ہیلن کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ باغیچے میں پہنچ کر ہم خاموشی سے کھڑکی تک پہنچ گئے، اور تھوڑی دیر بعد ہم کمرے میں تھے۔

ہیلن جا چکی تھی۔ ہم نے کھڑکی بند کر دی اور ہومز نے میرے کان میں کہا" کوئی آواز مت نکالنا۔"

اس کے بعد ہم نے لیمپ بُجھا دیا۔ ہومز نے ایک بار پھر میرے کان میں کہا" سونا مت، ہماری زندگی خطرے میں ہے۔ اپنا پستول بھی تیار رکھو۔ میں بستر پر بیٹھ رہا ہوں اور تم کُرسی پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے تعمیل کی۔

ہومز کے پاس ایک لمبی چھڑی بھی تھی۔ وہ چھڑی اُس نے بستر پر اپنے قریب رکھ لی۔ ساتھ ہی ماچس بھی تھی۔

اُن خوف ناک لمحات کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے اپنے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میری ہی طرح چوکنّا شرلاک ہومز قریب ہی آنکھیں کھولے بیٹھا ہے۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ گھڑی نے پہلے بارہ، پھر ایک، پھر دو اور پھر تین بجائے۔ ہم خاموش بیٹھے کسی اَنہونی کے منتظر تھے۔

اور پھر وہ اَنہونی ہو گئی۔

باریک سوراخ سے اچانک روشنی کی کرن نے جھانکا۔ حرکت کی مدّھم آوازیں آنے لگیں

اور پھر ایک بہت ہلکی لیکن صاف آواز ایسی آنے لگی جیسے کسی برتن سے بھاپ خارج ہو رہی ہے۔ اس آواز کے سنتے ہی ہومز بستر سے اُچھل پڑا۔ ماچس کی تیلی جلائی اور وحشیانہ انداز میں کسی شے کو چھڑی سے مارنے لگا۔

"تم نے دیکھا اسے؟ تم نے دیکھا واٹسن؟" ساتھ ہی وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

لیکن میں نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ البتہ ایک مدّھم اور واضح سیٹی کی آواز ضرور سُنی تھی۔ تیلی کی ہلکی روشنی میں بھی مجھے شرلک ہومز کا پیلا زرد چہرہ نظر آ گیا جس پر خوف اور نفرت ناچ رہی تھی۔ میں تیزی سے لیمپ تک پہنچا اور کمرے میں روشنی کر دی۔ ہومز کچھ دیر ساکت بیٹھا نظر آیا اور سوراخ کو گھورتا رہا۔ پھر ہم دونوں نے ایک درد بھری چیخ سنی۔ چیخ بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ نفرت، خوف اور غصّہ سب کچھ اُس چیخ میں موجود تھا۔ پھر وہ چیخ ختم ہو گئی اور خاموشی چھا گئی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے سرگوشی کی۔

ہومز نے جواب دیا، "قصّہ ختم ہو گیا۔ غالباً اس سے بہتر انجام ممکن نہ تھا۔ اپنا پستول سنبھالو۔ ہمیں ڈاکٹر کے کمرے میں جانا ہے۔"

میں نے لیمپ اٹھایا، ہم ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ لوہے کی تجوری کُھلی ہوئی تھی اور ڈاکٹر کرسی پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کی گردن کے گرد ایک پیلا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کے جسم پر بھوری دھاریاں بھی تھیں۔

ہومز نے سرگوشی کی، "دھاریوں والا سانپ! وہ دیکھو۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ گردن میں لپٹی ہوئی شے نے تیزی سے حرکت کی۔ میں نے دیکھا وہ واقعی سانپ تھا۔

ہومز نے چیخ کر کہا، "یہ ہندستان کا خطرناک ترین سانپ ہے، دلدلی ناگ۔ اس کے کاٹتے ہی دس سیکنڈ کے اندر انسان مر جاتا ہے۔"

سانپ نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور ہماری طرف رینگنے لگا۔ پستول کی آواز آئی اور موت کا وہ ہرکارہ خود موت کا شکار ہو گیا۔

خوف زدہ ہیلن بھی وہاں آ چکی تھی۔ ہومز نے اُسے تسلّی دی کہ اب وہ بالکل محفوظ ہے۔ بعد

میں شریک نے ہم دونوں کو سارا معاملہ یوں سمجھایا:

"مجھے پتا تھا کہ خطرہ ہے تو اس سوراخ اور ڈوری کی طرف سے۔ اُس سوراخ سے کوئی چیز کمرے میں داخل ہوتی تھی اور اس ڈوری کے ذریعے سے بستر پر اُترتی تھی۔ اُس مکّار اور ظالم شخص نے بہت خوف ناک طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ سانپ کو اُس سیٹی کی تعمیل کی عادت ڈالی گئی تھی جو ہم سب نے سُنی۔ اُس سیٹی کے بعد سانپ اپنے آقا کے پاس واپس پہنچ جاتا اور انعام کے طور پر دودھ کے پیالے سے دودھ پیتا۔ ایک خاص وقت پر سانپ کو سوراخ میں داخل کرنا آسان تھا۔ اس وقت جو بھی بستر پر ہوتا ضرور شکار ہو جاتا۔ لوہے کی تجوری سانپ کا گھر تھا۔ جس لوہے کی چیز کے گرنے کی آواز ہیلن نے سُنی تھی دراصل وہ گرنے کی نہیں بلکہ تجوری بند ہونے کی آواز تھی۔"

"تم نے خود کو کیسے بچایا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے سوراخ سے آتی ہوئی سسکاریاں سُن لی تھیں اور جانتا تھا کہ سانپ آرہا ہے۔ میں نے اُسے اپنی چھڑی سے اس قدر پریشان کیا کہ وہ واپس سوراخ میں گھس گیا۔ چھڑی کی مار نے اُسے انتہائی غصّے میں کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جاتے ہی ڈاکٹر کو کاٹ کھایا۔"

تین قسم کے آدمی

دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں:۔

- ایک وہ جو سوچتے ہیں کرتے کچھ نہیں۔
- دوسرے وہ جو بغیر سوچے سمجھے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور پھر منھ کی کھاتے ہیں۔
- تیسرے وہ جو پہلے سوچتے ہیں اور پھر اس پر عمل بھی کرتے ہیں یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو مٹی کو بھی سونا بنا دیتے ہیں۔

کنفیوشس نے کہا

- اگر آپ کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہیں تو بڑی چیز آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔

نزلہ و زکام
جوشینا سے آرام
جوشینا
صدیوں کی آزمودہ اور چنیدہ نباتات کے نہایت موثر، کافی وشافی اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے، دواسازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔
ہمدرد کی فنّی محنت اور دواسازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے
جوشینا
نزلہ و زکام ۔ جوشینا سے آرام
کھانسی اور سینے کی جکڑن کا موثر علاج
ہمدرد
اساس اخلاق
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
JOS-1/88

سند باد جہازی کے حیرت انگیز سفر

احمد خاں خلیل

مہم جوئی کے سات پُرخطر سفروں کے عجیب و غریب اور نا قابل یقین واقعات
الف لیلہ کا ایک دل چسپ حصّہ آسان زبان میں

پہلا سفر

خلیفہ ہارون الرشید کا پائے تخت بغداد تھا۔ اس زمانے میں بغداد دنیا بھر کے شہروں کا شہزادہ تھا۔ اس میں عالی شان محل اور خوب صورت حویلیاں تھیں۔ اس کے بازار بڑے بڑے اور بارونق تھے۔ شہر میں امیر اور غریب، بہادر اور شہ سوار، عالم اور فاضل، ہُنرمند اور کاری گر ہر طرح کے لوگ بستے تھے۔ ہر روز دوُر دراز سے کئی قافلے آتے اور کئی کارواں کوچ کرتے۔ صبح سے شام تک ہر بازار اور ہر منڈی میں میلے کا سا سماں نظر آتا تھا۔

اس شان دار شہر کے ایک خوب صورت مکان میں ایک مال دار شخص رہتا تھا اُس کا نام تھا سندباد جہازی۔ وہ بڑا مہمان نواز، سخی اور دوستوں کا دوست تھا۔ وہ زندگی کے سرد گرم جھیل چکا تھا۔ گرمی کے موسم میں ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے باغ میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ میدان مارنے، سخت مشکلات کو سَر کرنے اور مُہم جیتنے کی بات چل نکلی۔ کہنے لگا، دوستو، میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ہر طرح کے مال و متاع سے نوازا ہے، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی غریب اور نادار تھا۔ میری زندگی خوشیوں سے خالی تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا تھا۔ میرے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا۔ وقت مشکل سے گزرتا تھا۔ ایک دن جب کہ میں بہت تنگ دست تھا میں نے پُختہ ارادہ کر لیا کہ مجھے شیخ چلّی کی طرح خواب نہیں دیکھنے چاہییں۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ ہاتھ پر

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چناں چہ میں نے اپنا مکان اور گھر کا اسباب بیچ ڈالا۔ مجھے کُل تین ہزار درہم ملے۔ اس رقم سے میں نے تجارت کا سامان خریدا۔ اسے بصرہ لے گیا جہاں سے بحری جہاز دوسرے ملکوں کو مالِ تجارت لے کر جاتے تھے۔

بصرہ میں جا کر میں نے معلوم کیا کہ کون سا جہاز سفر کے لیے تیار ہے۔ ایک عرب جہاز کے کپتان سے میں نے بات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ چھے تاجر اپنا مالِ تجارت اس کے جہاز پر لے

جا رہے ہیں۔ یہ جہاز مشرقی جزیروں کو جائے گا۔ تاجر وہاں اپنا مال بیچ کر ہیرے اور جواہرات خرید کر پھر اسی جہاز سے بصرہ واپس آئیں گے۔ میں نے بھی اس جہاز پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ معاملہ طے ہو گیا اور میں نے بھی اپنا اسباب اس میں لاد دیا۔

اگلے ہفتے جہاز کا لنگر اُٹھا اور ہم دعائیں مانگتے ہوئے روانہ ہوئے۔ جہاز نے مشرق کا رُخ کیا۔ ہم کُھلے سمندر میں سفر کرنے لگے۔ کئی دن اور کئی راتیں یونہی گزر گئیں۔ آخر ایک بندرگاہ آئی۔ ہم نے کچھ سامان اور خریدا اور آگے چل پڑے۔ اس طرح ایک دو اور بندرگاہیں آئیں اور مزید خرید و فروخت ہوئی۔

ایک دن ہم ایک چھوٹے سے جزیرے میں پہنچے۔ بحری سفر میں چند باتیں بڑی اہم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کو وقفے وقفے سے پینے کا پانی ملتا رہے۔ دوسرے ہوا موافق ہو اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ طوفان سے بچائے رکھے۔ جہاز کے کپتان نے کہا" حیرت ہے یہ جزیرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی گھاس پھوس بتاتی ہے کہ یہاں تازہ پانی بھی ہوگا۔ چناں چہ وہ جہاز کو ساحل کے قریب لے گیا۔ ہم میں سے کئی آدمی برتن لے کر اترے کہ پانی تلاش کریں۔ کچھ محض سیر کے لیے اترے۔ انھی کے ساتھ میں بھی کنارے پر گیا سوچا کہ ذرا آگے جا کر جزیرے کی زمین دیکھ لوں۔ ٹہلتا ٹہلتا اپنے ساتھیوں سے کچھ دور چلا گیا

جزیرہ ہلنے لگا

کچھ ملاح کھانا پکانے کے لیے ساحل پر آئے۔ گھاس پھوس جمع کر کے آگ جلائی۔ عین اس وقت دو عجیب و غریب باتیں ہوئیں۔ اوّل یہ کہ جزیرہ ہلنے لگا۔ مسافر حیران و پریشان ہو گئے۔ کپتان تجربے کار آدمی تھا۔ وہ فوراً چلایا" جلدی سے جہاز پر سوار ہو جاؤ۔ یہ جزیرہ نہیں، یہ تو خُوت مچھلی ہے جو برسوں سے پانی کی سطح پر سو رہی تھی۔ تم نے جو آگ جلائی ہے اس کی تپش سے جاگ اٹھی ہے۔ جلدی کرو، جلدی کرو۔"

جو لوگ جہاز کے بالکل قریب ہی کنارے پر تھے وہ دوڑ کر اس میں سوار ہو گئے۔ میں لوگوں سے دور تھا۔ مجھے زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں سر پٹ دوڑا۔ لیکن جزیرہ جو صرف پہلے ہلا تھا اب پانی کے اندر گھسا جا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت آندھی آئی۔ اس نے جہاز کو دور جا پھینکا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ مجھ پر کیا گزری۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ میں پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔ جزیرہ بھی غائب اور جہاز بھی غائب تھا۔ میں اپنے دل میں دعا مانگنے لگا" اے اللہ! کیا میں بے گور و کفن سمندر میں تن تنہا ڈوب کر مروں گا۔ اے میرے اللہ مجھ پر رحم فرما۔"

اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ادھر میں نے دعا مانگی ادھر پانی کی ایک لہر ایک بڑے برتن کو میرے قریب لے آئی۔ میں نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ جان بچانے کا سہارا مل گیا، لیکن آزمائشیں ابھی باقی تھیں۔ سمندر کی لہریں مجھے اور میرے برتن کو پٹک پٹک کر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر لے جاتی تھیں۔ زندگی اور موت کی آپس میں زبردست کشمکش جاری

تھی۔ اسی حال میں رات گزر گئی، دن بیت گیا۔ پھر دوسری رات اور دوسرا دن گزرا۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ انگلیاں سُن اور بازو شل ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے یہ ڈر کھائے جاتا تھا کہ کہیں برتن ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔

زمین! زمین! میرے اللہ زمین

جب بھی مجھے ہوش آتا تو میں گڑگڑا کر دُعا ضرور مانگتا تھا۔ ہوا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ مجھے ساحل کی طرف لے گئے، لیکن میں خود اس بات سے بے خبر تھا۔ دراصل میرے ناتواں جسم میں طاقت نام کو نہیں تھی۔ بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ایک بار ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درخت کے نیچے پڑا ہوں۔ پھر غشی کا دورہ پڑا۔ ایسی حالت میں کس کو تاریخ، دن اور وقت یاد رہ سکتا ہے، لیکن اندازے سے کہہ رہا ہوں کہ دو دن اسی حال میں بے سُدھ گُم سُم پڑا رہا۔ بزرگ کہتے ہیں کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے اس میں بندے کی بہتری ہوتی ہے۔ شاید اس طرح پڑے رہنے سے میری تھکن اور کوفت قدرے کم ہو گئی۔ پھر مجھے مشہور مثل یاد آئی "اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے"۔ میں اُٹھا کہ پانی اور غذا تلاش کروں۔ پیروں پر نظر پڑی تو داغ داغ لگے۔ شاید مچھلیوں نے جگہ جگہ کاٹا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، "سندباد! اللہ کا شکر ادا کرو اور آگے بڑھ کر تازہ پانی تلاش کرو۔ تازے پانی سے پیر دھوؤ گے تو یہ زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں اُٹھا تو اُٹھا نہ گیا۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی نے لاٹھی سے میری چول چول ڈھیلی کر دی تھی۔ کبھی گھسٹ گھسٹ کر کبھی بازوؤں پر چل کر میں آگے بڑھتا رہا۔ طبیعت میں تازگی کہاں کہ میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاؤں۔ میں تو اندھے کی طرح چل رہا تھا۔ اچانک کسی چیز سے ٹکرایا۔ دیکھا کہ ایک پھل دار درخت کی ٹکّر لگی ہے۔ نظر اُٹھائی تو پاس ہی صاف شفاف پانی کی ندی بہہ رہی ہے۔ "لاکھ لاکھ شکر تیرا، اے میرے پالن ہار!" یہ ورد کرتے ہوئے میں نے ندی کا رُخ کیا۔ گھونٹ گھونٹ پانی پی کر پیاس بجھائی۔ بدن میں کچھ تازگی آئی۔ پھر اس پانی سے پیر دھوتے اور کچھ دیر سستانے کے بعد اس درخت کے پھل کھا کر میں وہیں سو گیا۔ چند روز تک یہی معمول رہا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ بدن کی طاقت لوٹ آئی ہے اور پاؤں ٹھیک ہو گئے ہیں۔ میں اپنے آپ کو چاق چوبند محسوس کرنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ بے فکر زندگی بسر

کرنے کو یہ بہترین جگہ تھی، لیکن پاؤں کے چکّر کا کیا علاج۔

اگرچہ یہ سمندر کا ساحل تھا اور یہ امید تھی کہ شاید کبھی کوئی جہاز یہاں آجائے، لیکن میں اُٹھا اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا۔ خیال تھا کہ اگر یہاں ندی اور درخت ہیں تو آگے بھی ہوں گے۔ دن بھر چلتا رہا مگر ہُو کا عالم تھا۔ نہ چرند نہ پرند، نہ ندی نہ درخت۔ پھر سے مجھ پر وحشت طاری ہونے لگی۔ پیچھے مُڑوں کہ آگے بڑھوں، اسی کش مکش میں چلتا رہا۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ کہاں بغداد جہاں آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا اور کہاں یہ سُنسان، بیابان جہاں کوئی آدم نہ آدم زاد۔

ویرانے میں ایک گھوڑا

میں سہما سہما، چپکے چپکے چلا جا رہا تھا۔ سوچوں میں گُم، نظریں اپنے پیروں پر گڑی ہوئی کہ ہنہنانے کی آواز سُنائی دی۔ سر اُٹھا کر جو دیکھا تو ایک گھوڑا نظر آیا۔ یاالٰہی! اس ویرانے میں اور گھوڑا! گھوڑا بھی اس قدر خوب صورت! کیا یہ سچ مچ کا گھوڑا ہے یا چھلاوہ۔ اگر سچ مچ کا گھوڑا ہے تو یہاں کیسے آیا، کیا کھاتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے گرج دار آواز آئی:

"خبردار! گھوڑے کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ تیر تمھارے سینے کے پار نکل جائے گا۔"

ایک آدمی بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ میں اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور ڈرا بھی۔ میں نے کہا، "بھائی، معاف رکھنا۔ میں تو ایک مسافر ہوں۔ گھوڑے کو فقط ایک نظر دیکھا ہے۔ کیا یہ گھوڑا جناب والا کا ہے؟"

اس نے للکار کر کہا، "کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا، "اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے میں سمندر میں ڈوبنے سے بچ کر ساحل پر آلگا ہوں۔" پھر میں نے اپنی آپ بیتی اس کو سنائی تو اسے اعتبار آیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک غار میں لے گیا۔ مجھے پانی پلایا اور پھر کھانے کے دستر خوان پر بٹھایا۔

اس نے کہا، "واقعی اللہ نے آپ پر بڑا کرم کیا ہے۔" ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ گفت گو کے دوران اس نے مجھے بتایا کہ ہر سال بادشاہ سلامت ایک ہفتے کے لیے اس جزیرے میں اپنے بہترین گھوڑوں کو بھیجتے ہیں۔ اس جگہ کی ہوا گھوڑوں کے لیے بہت عمدہ ہے۔ اگرچہ جزیرہ بالکل سنسان ہے، لیکن سرکار کے ملازم ضروری سامان اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ہفتہ دس دن رہ کر گھوڑوں کو واپس لے جاتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد دوسرے ملازم بھی اپنے اپنے گھوڑے لے آئے۔ انھوں نے بھی میری سرگزشت سنی۔ سب نے مجھ سے ہمدردی کی اور مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی ہامی بھری۔

دوسرے دن ہمارا قافلہ وہاں سے چلا۔ سواری کے لیے انھوں نے مجھے بھی ایک خوب صورت گھوڑا دیا۔ راستے میں انھوں نے بتایا کہ ہمارا بادشاہ بڑا مہربان اور قدر دان ہے۔ وہ رعایا کو اپنی مہربانیوں سے خوش رکھتا ہے اور رعایا اس پر جان چھڑکتی ہے۔ نزدیک اور دور کے تاجر ہمارے شہر میں آتے ہیں۔ شہر پہنچ کر ہم بادشاہ سے آپ کا ذکر کریں گے۔

جب ہم شہر پہنچے تو ملازموں نے بادشاہ کو خبر پہنچائی۔ میری طلبی ہوئی۔ انھوں نے بڑی توجہ سے میری دکھ بھری کہانی سنی۔ ان کے حکم سے مجھے نیا لباس دیا گیا۔ میری امید سے بڑھ کر میری خاطر داری کی۔ چند دنوں میں بادشاہ کا مجھ ناچیز پر اعتماد قائم ہو گیا۔ میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں روزانہ بندرگاہ اور بازار میں جا کر تاجروں اور جہازوں کے کپتانوں سے مل کر حال احوال معلوم کر کے بادشاہ کو باخبر رکھا کروں۔ میرے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔ میں روزانہ پہلے بندرگاہ

جاتا۔ جہازوں کے کپتانوں سے ملتا، ملاحوں سے باتیں کرتا اور پھر بازاروں میں تاجروں کا حال احوال معلوم کرتا۔ شام کو دربار میں بادشاہ کے سامنے اپنی کارگزاری پیش کرتا۔

ایک دن بندرگاہ پر ایک بڑا جہاز لنگر انداز ہوا۔ حسبِ معمول میں وہاں گیا۔ جہاز پر سوار تاجر اپنا مال اسباب بیچنے کے لیے باہر لائے۔ جہاز کے کپتان سے میری ملاقات ہو گئی۔ میں نے پوچھا، "کیا تمام مال فروخت کے لیے نکال لیا گیا ہے یا کچھ باقی ہے؟" کپتان نے کہا، "اور تو سب مال بازار چلا گیا ہے چند صندوق باقی ہیں۔ یہ ایک نوجوان کے ہیں جس نے ہمارے ساتھ سفر کا آغاز کیا تھا، لیکن ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ خیال ہے کہ وہ ڈوب گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا اسباب بیچ کر رقم بغداد لے جاؤں اور اس کے وارثوں کو دے دوں۔"

میں نے غور سے دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ میں نے پوچھا، "اس کا نام کیا تھا؟" کپتان نے بتایا کہ اس کا نام سندباد تھا۔ یہ سُن کر پہلے تو ایک لمحے کے لیے میں سکتے میں آ گیا۔ پھر میں نے پورے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ کپتان ہکا بکا ہو کر میرا منھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، "میں ہی تو سندباد ہوں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایمان داری سے میرے مال کی حفاظت کی۔"

کپتان نے کہا، "بے شک آپ بھلے آدمی لگتے ہیں، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ سندباد ہیں۔ سندباد تو ڈوب کر مر چکا ہے۔ ہم نے خود ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرے ملاح اور جہاز پر سوار تاجر سب اس بات کے گواہ ہیں۔"

میں نے کپتان سے کہا، "جنابِ من، پہلے آپ میری سرگزشت سُن لیجیے۔ پھر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا میں وہ نوجوان ہوں جس کا یہ مال ہے۔" میں نے بصرہ سے لے کر اس ہلنے والے جزیرے تک کے تمام حالات بیان کیے۔ یہاں تک کہ اسے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں۔

کپتان نے کہا، "اس کے رنگ نیارے ہیں۔ وہ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ہمیں اس بات پر یقین تھا کہ آپ ڈوب کر مر چکے ہیں اور آج آپ کی باتیں سُن کر ہمارا اللہ پر یقین اور مضبوط ہو گیا ہے۔"

اس نے مجھے میرا مال دے دیا۔ میں نے اسے بیچا اور بادشاہ کے لیے ایک عمدہ تحفہ خریدا اور اُسے اٹھوا کر دربار میں لے گیا۔ بادشاہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے کپتان کی

ایمان داری کا قصّہ سُنایا۔ اس نے میرا تحفہ قبول کیا اور اس سے بڑھ چڑھ کر مجھے تحفہ دیا۔

بغداد کو واپسی

جب میرا جہاز بغداد روانہ ہونے لگا تو میں اس مہربان بادشاہ کے پاس گیا۔ میں نے اسے بتایا، "آپ جیسے مہربان بادشاہ اور اس خوب صورت ملک سے جانے کو میرا دِل تو نہیں چاہتا لیکن وطن کی محبّت سے میں مجبور ہوں اور آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے اجازت دے دی اور ساتھ ہی سونا چاندی، ہیرے جواہرات، اعلا قسم کے لباس اور کئی انمول چیزیں تحفے کے طور پر مجھے عطا کیں۔ آخر جہاز روانہ ہوا۔ طویل سفر کے بعد ہم بغداد پہنچے۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

ان شاء اللہ میں کل آپ کو اپنے دوسرے سفر کا حال سناؤں گا۔

دوسرا سفر

میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ میں اس امن و امان کے شہر بغداد میں ہمیشہ ہمیشہ رہوں۔ میں نے ایک نیا گھر خرید لیا تھا۔ مجھے جو تحفے ملے تھے انھوں نے مجھے مالا مال کر دیا تھا، لیکن پہلے سفر نے ایک تو میرے دِل سے سفر کا ڈر نکال دیا تھا، دوسرے نئے نئے مقامات دیکھنے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے کا زبردست شوق پیدا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ میرا پاؤں گردش میں تھا، میری تقدیر میں مشکل سَر کرنا اور مُہم جیتنا لکھا تھا۔ میں نے اچھا مال خریدا اور ایک جہاز میں دوسرے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بحری سفر کا لطف یہ ہے کہ آدمی ہر بندرگاہ پر رُکتا ہے۔ نئے نئے شہر دیکھتا ہے۔ نئے نئے لوگوں سے ملتا ہے۔ کچھ بیچتا ہے کچھ خریدتا ہے اور پھر آگے چل دیتا ہے۔ اس طرح ہم آگے بڑھتے گئے۔ کئی دِنوں کے بعد ہم ایک خوب صورت جزیرے میں پہنچے۔ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے درخت نظارے کی دعوت دے رہے تھے۔ ندیاں بہ رہی تھیں۔ ہر طرف سبزہ اُگا تھا، لیکن آدم نہ آدم زاد۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ہم لوگ جہاز سے اُترے، ٹولیوں میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ہر شخص یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کیسی جادو کی نگری ہے۔ کچھ ملّاح برتن لے کر پانی بھرنے

گئے۔ میں بھی تاجروں کے ایک ٹولے کے ساتھ سیر کو نکلا۔ آگے ایک خوش نما باغ نظر آیا۔ ہرے بھرے درخت، پھولوں کی کیاریاں، خوش بوؤں کی لپٹیں، اس منظر نے مجھے ایک جگہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ساتھی آگے نکل گئے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں سو گیا۔

اور نیند کے بعد

میں جب نیند سے جاگا تو وہاں کوئی ملاّح اور کوئی تاجر نظر نہ آیا۔ مجھے اپنے پہلے سفر کی تکلیفیں یاد آنے لگیں۔ اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا۔ بغداد میں کتنی سُکھ کی زندگی گزر رہی تھی۔ وہاں سے کیوں آیا۔

جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب پچھتانے کی کیا ضرورت۔ میں نے اپنے دل میں کہا، "بیٹھ رہنے سے کیا فائدہ سندباد جہازی۔ اُٹھو، مثل مشہور ہے کہ جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔" میں ایک درخت پر چڑھ گیا تاکہ چھٹکارے کا کوئی راستہ دیکھوں۔ دُور سمندر میں ایک جہاز نظر آ رہا تھا۔ یہی میرا جہاز تھا جس پر سوار ہونے سے میں رہ گیا تھا۔ باقی جگہ سوائے درختوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ دُور مجھے ایک عجیب چیز نظر آئی، سفید سی اور اتنی بڑی جتنا کہ کسی عمارت کا گنبد ہوتا ہے۔ میں درخت سے نیچے اُترا اور اس کی طرف روانہ ہوا۔ گھنٹوں چلنا پڑا۔ تھک کر چور ہو گیا۔ شام کو مشکل سے اس تک پہنچا۔ اب جو اسے غور سے دیکھتا ہوں

تو ایک انڈا سا نظر آیا۔ اگر گنبد ہوتا تو اس کے نیچے مکان ہوتا۔ کھڑکیاں اور دروازے ہوتے
میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے اور میری نگاہ کے درمیان کوئی ایسی چیز آ گئی کہ اندھیرا
سا چھا گیا۔

سیمرغ

میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے دیکھا تو ایک بہت ہی بڑا پرندہ تھا۔ شاید یہ رُخ تھا جسے سیمرغ بھی کہتے ہیں۔ میں ملاحوں سے اس کے بارے میں کئی قصّے سُن چکا تھا۔ انھوں نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ رُخ اتنا بڑا پرندہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے چوزوں کو ہاتھی کھلاتا ہے۔ اب حقیقت کُھلی۔ وہ سفید گنبد اس کا انڈا ہے جس پر بیٹھنے کے لیے وہ آیا ہے۔

رُخ اُترا۔ انڈے پر بیٹھا اور ایسے لگتا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ نہ کوئی حرکت نظر آتی تھی نہ آواز سُنائی دیتی تھی۔ خواب کی طرح میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہ عظیم پرندہ تو وادی وادی گھومتا ہوگا۔ کیوں نہ میں اس کی ٹانگوں سے لٹک رہوں۔ میں نے اپنے سر سے پگڑی اُتاری اور یہ تدبیر سوچی کہ میں کس طرح اپنے آپ کو اس کے پیروں سے باندھ دوں۔ پھر میں چُپکے چُپکے اس کے قریب گیا اور اس تدبیر کے مطابق میں نے اپنے آپ کو اس کے پیروں سے باندھ دیا۔

میں رات بھر اسی طرح بندھا پڑا رہا۔ صبح ہوئی تو رُخ اُڑا اور میں بھی اس کے پیروں میں بندھا آسمان کی سیر کرنے لگا۔ حیرت یہ ہے کہ رُخ کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پیروں سے بندھا ہوں۔ رُخ میدانوں، وادیوں، پہاڑوں، دریاؤں اور جزیروں پر سے اُڑا جا رہا تھا۔ میں دَم بخود یہ سب دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ ایک ایسی وادی میں اُترا جس کے دونوں طرف دیوار کی طرح دو پہاڑیاں تھیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ رُخ اس جگہ کیوں اُترا، دراصل ہوا یہ تھا کہ نیچے ایک بڑا سانپ رینگ رہا تھا۔ رُخ اسے جھپٹ کر اوپر لے جانے کو اُترا۔ میں اندازے سے یہ سب کچھ بھانپ گیا۔ میں نے پگڑی کی گرہ کھولی اور جونہی وہ سانپ پر جھپٹا۔ میں ایک طرف کُودا اور یہ جا وہ جا۔ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں دُبک کر بیٹھ رہا۔ رُخ سانپ کو تنکے کی طرح آسمان میں لے گیا۔

ہیروں کی وادی

اس بھاگ دوڑ میں میں نے سو دو سو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ سے اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو کشتی کے سائز کے کئی سانپ رینگتے نظر آئے۔ میرے اللہ! مجھے بچانا! میں نے گڑگڑا کر دُعا مانگی۔ صبح کا وقت سورج چمک رہا تھا اور سانپ رینگ رینگ کر اپنے بلوں میں گھس رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ مخلوق رُخ کے ڈر سے دن کو اپنے بلوں میں چھپ جاتی ہے اور رات کو باہر نکلتی ہے۔

اس خیال سے کچھ ڈھارس بندھی، اب میں اس وادی کا سرا تلاش کرنے نکلا۔ زمین کچھ پتھریلی تھی۔ ٹھوکر کھائی تو چند ہیرے میرے پاؤں سے اُدھر جا پڑے۔ غور سے دیکھا تو پوری وادی ہیروں سے بھری تھی۔ یہ ہیرے خاصے بڑے اور خوب صورت تھے، لیکن میرے کس کام کے۔ میں تو اپنی زندگی بچانا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے شام ہو گئی۔ زندگی میں پہلا اور عجیب و غریب موقع تھا کہ میں ہیروں سے اَٹی ہوئی زمین کو پامال کرتا چلا جا رہا تھا۔ شام ہوئی۔ سانپوں کا خوف پیدا ہوا بلکہ سچ مچ سانپ نکلتے دیکھے۔ ابھی زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ پاس ہی ایک غار نظر آیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، غار کے اندر چلا گیا۔ اپنے ہوش حواس کی مدد سے یہ تسلی کر لی کہ غار میں کوئی سانپ نہیں۔ پھر ایک بڑے پتھر کو لڑھکا کر میں نے غار کا منھ اچھی طرح بند کر دیا اور اللہ کا نام لے کر سو گیا۔

ہیروں کے تاجر

اس غار نے میری جان بچائی۔ رات کو کئی بار میری آنکھ کُھلی تو مجھے غار کے منھ پر پھنکاریں سُنائی دیں۔ شاید سانپ میری بُو پا چکے تھے، لیکن پتھر نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ صبح ہوئی تو میں اس وقت کا انتظار کرتا رہا کہ جب سانپ رُخ کے ڈر سے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ ایک بار میں نے جھانک کر دیکھا تو سب بلوں کی طرف رینگتے نظر آئے۔

پھر میں اندر چلا گیا اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ مجھے دھڑام سے کسی چیز کے زمین پر گرنے کی آواز سُنائی دی۔ میں نے پتھروں کی درز میں سے جھانکا۔ ایسا لگتا تھا کہ گوشت کا ایک

بڑا لوتھڑا گرا ہے۔ اس کا رنگ سُرخ تھا۔ مجھے وہ کہانیاں یاد آ گئیں جو جہازوں کے ملاح اس وادی کے بارے میں سُنایا کرتے تھے۔ وہ یہ بتاتے تھے کہ کسی کی کیا مجال کہ اس ہیروں کی وادی کے اندر جائے۔ اس میں اتنے بڑے سانپ ہیں جتنی کہ کشتی ہوتی ہے۔ لمبا چوڑا آدمی اس کا ایک نوالہ بنتا ہے۔ انسان تو کیا کوئی پرندہ بھی اس وادی کا رخ نہیں کرتا۔ لیکن حضرت انسان کی کیا بات، وہ کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ کر اس وادی کے کچھ نہ کچھ ہیرے نکال ہی لیتا۔ ہیروں کے سوداگر اس وادی کے ایک طرف واقع اونچے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے۔ وہاں وہ دُنبے، بکرے یا گائے کاٹتے اور ان کے گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے پہاڑ سے نیچے وادی میں گرا دیتے۔ گوشت کے لوتھڑے جب گرتے تو کوئی نہ کوئی ہیرا اُن سے چپک جاتا۔ اس گوشت کو کھانے کے لیے بڑے بڑے شکاری پرندوں نے پہاڑ کی چوٹیوں پر آشیانے بنا رکھے ہیں۔ وہ اُڑ کر وادی سے وہ گوشت اُچک کر آشیانوں میں لے آتے اور تاجر پھر شور مچا کر پرندوں کو اُڑنے پر مجبور کر دیتے اور گوشت کو ٹٹول کر ہیرے نکال لیتے ہیں۔

میں ہیروں کی وادی میں تھا لیکن ہیرے میرے کس کام کے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے کیسے نکلوں۔ مجھے ایک پرندہ یہاں لایا، اس لیے اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ کوئی پرندہ ہی اللہ کے حکم سے مجھے یہاں سے نکالے گا۔ انسان کچھ بھی ہو، لالچ اس کی فطرت میں ہے۔ ایک طرف تو میں یہ کہتا تھا کہ مجھے زندگی پیاری ہے، بھاڑ میں جائیں ہیرے۔ دوسری طرف میں نے اپنی خُرجی (تھیلی) نکالی اور بڑے بڑے شفّاف اور چمک دار ہیروں سے بھرلی۔ پھر میں نے اپنی پگڑی اُتاری، اپنی کمر کے گرد گھیرا دے کر کندھوں اور سر تک لے گیا اور اوپر گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا باندھ لیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی پرندہ اس گوشت کو اُچکے گا تو میں بھی اس کے ساتھ بندھا ہوا اوپر پہاڑ کی چوٹی تک جا پہنچوں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد شکاری پرندے منڈلانے لگے۔ ایک پرندہ اس گوشت پر جھپٹا جو میرے سر پر رکھا تھا۔ اسے وہ لے کر اُڑا اور ساتھ ہی مجھے بھی اُڑا لے گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر اس کا آشیانہ تھا۔ وہاں اس کے بچّے منتظر تھے۔ ساتھ ہی تاجر بھی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ پرندہ آشیانے میں اُترا تھا کہ شور و غل ہوا۔ پرندہ گوشت چھوڑ کر پھر اُڑ گیا۔ تاجر گوشت لینے آئے تو مجھے وہاں کھڑا پایا۔ گوشت کے خون سے میں لال ہو چکا تھا۔ میری شکل و صورت بھی عجیب و غریب

نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک سے گئے۔ میں نے کہا، "بھائیو! گھبرائیے نہیں میں آدم زاد ہوں۔ اس گوشت کے ساتھ یہ پرندہ مجھے بھی اُٹھا لایا ہے۔ اس گوشت میں تو شاید کوئی ہیرا نہیں۔ ہاں میرے پاس کچھ ہیرے ہیں۔ میں تم میں سے ہر ایک کو ایک ایک ہیرا دے دوں گا۔ یہ ایک ہیرا اتنا بڑا ہو گا کہ کبھی تمھارے ہاتھ نہ آیا ہو گا۔"

وہ میری بات سُن کر بڑے خوش ہوئے، کہنے لگے، "تم بہت ہی خوش قسمت انسان ہو ورنہ اس وادی سے کبھی کوئی شخص زندہ نہیں لوٹا۔" میں نے کہا، "یہ سب اللہ کا کرم ہے۔" ان تاجروں کی مدد سے میں نے اپنے باقی ہیرے شہر جا کر بیچے اور ایک جہاز میں سوار ہو کر بخیر و عافیت بغداد پہنچ گیا۔

ساتھیوں کل میں تمھیں اپنے تیسرے سفر کا حال بتاؤں گا۔

تیسرا سفر

پہلے اور دوسرے سفر میں جب مجھے تکلیفیں پیش آتی تھیں تو میں کہتا تھا کہ پھر کبھی سفر کو نہ نکلوں گا، لیکن اس بار تو میں چند ہفتے بھی گھر میں گزار نہ سکا۔ رہ رہ کر طبیعت میں اُبال آتا تھا کہ چلو اللہ کی عجیب و غریب دنیا دیکھوں۔ آخر سامان سفر تیار کر کے تیسری بار پھر ایک جہاز میں سفر کے لیے نکلا۔ جہاز بندرگاہوں پر رُکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ہر بندرگاہ پر ہم خرید و فروخت کرتے اور نفع کماتے۔

ایک دن ہم بڑے خوش و خرم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ آندھی آئی اور جہاز کو دھکیلتی چلی گئی۔ آندھی تھی یا قیامت، چار دن تک جہاز اس کے تُند و تیز جھونکوں میں تنکے کی طرح اُڑتا چلا گیا۔ ہوا رُکی تو دیکھا کہ ہم ایک جزیرے کے پاس ہیں۔ کپتان آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کہنے لگا، "آندھی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ذرا دھیمی ہوئی ہے، لیکن جہاز کے لیے یہ سخت ناموافق ہے۔ بہتر ہے یہاں رُک جاؤ۔ اس جزیرے کو میں جانتا ہوں۔ یہاں کے لوگ ٹھنگنے ہیں۔ ان کی شکلیں بندروں کی طرح ہیں۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں جہاز پر چڑھ آتے ہیں۔ اگر انھیں روکا جائے تو مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے ان سے ٹکر نہیں لینی۔"

بندر انسان

کپتان نے جہاز کو جزیرے کے ساتھ لگایا تو ہزاروں کی تعداد میں بندر انسان جہاز پر چڑھ آئے۔ آگے پیچھے، عرشے پر اور نیچے ہر جگہ وہ پھیل گئے۔ تاجر اور ملّاح جہاز چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بندر انسان جہاز کو جزیرے کے ایک اور طرف لے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر ہم سوچنے لگے کہ کیا جائے۔ ایک ملّاح ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اسے دُور پتھر کا ایک مکان نظر آیا۔ اس نے کہا، "کیا خیال ہے۔ ہمارے لیے وہ مکان ٹھیک رہے گا۔" ہم اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ اِدھر کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ دروازے کے اندر جھانکا تو ایک کمرا خالی پڑا تھا۔ ہم اندر چلے گئے۔

آدم خور دیو

ملّاحوں سے میں ایک آدم خور دیو اور اس کے پتھر کے مکان کی کہانی سُن چکا تھا۔ اندر جاکر معلوم ہوا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی مکان ہے۔ اتنے میں دیو بھی آ گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اگرچہ اس کی شکل انسانوں جیسی تھی، لیکن اس کا قد ایک بڑے تن آور درخت کے برابر تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس نے کمرے میں رکھے ہوئے ایک صندوق سے ایندھن نکال کر آگ جلائی اور پھر ہم سب پر نظر ڈالی۔

پہلے اس نے مجھے اُٹھایا، ٹٹولا اور دیکھا کہ میں موٹا تازہ نہیں۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کی ایک ایک انگلی مجھ سے زیادہ موٹی تھی۔ اس نے مجھے فرش پر رکھ دیا اور ایک اور کو اُٹھا لیا۔ اس طرح اس نے سب کو ٹٹولا اور آخر کار ایک کو چُن لیا۔ اس شخص کو اس آگ پر بھونا اور پھر مزے مزے سے کھایا۔ پھر آگ کے پاس ہی لیٹ رہا اور سو گیا۔

دوسرے دن وہ کمرے سے باہر نکلا تو دروازے کو بند کرتا گیا۔ رات کو پھر واپس آیا۔ کل کی طرح اس نے ہم سب کو باری باری ٹٹولا اور ایک کو چُن کر بھونا اور کھا گیا۔

اگلی صبح جب دیو باہر گیا تو ہم سب نے سوچنا شروع کیا کہ اس ظالم سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہیے ورنہ ہم سب اس کا لقمہ بنیں گے۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ ہم سب مل کر

اس کے ایک بازو کو بھی مروڑ نہیں سکتے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک تجویز بتائی جو ہم سب کو پسند آئی۔

شام کو وہ آیا۔ اس نے معمول کے مطابق ایک آدمی چُنا اور اسے آگ پر بھون کر کھا گیا۔ اب ہم نے چھٹکارے کی سوچی سمجھی اسکیم پر عمل شروع کیا۔ دو آدمیوں نے لوہے کی کچھ سلائیں آگ پر سُرخ کیں۔ دوسرے دو آدمیوں نے جلتی لکڑیوں سے دروازے میں راستہ بنایا۔ باقی آدمی کمرے میں رکھے ہوئے بڑے صندوق کو بڑی خاموشی سے اکھاڑنے میں لگ گئے تاکہ اس سے کسی نہ کسی قسم کی کشتی بنالی جائے۔ سب چیزیں تیار ہو گئیں۔

ہم نے بڑی دلیری سے لوہے کی گرم گرم سلاخیں دیو کی آنکھوں میں گھسا دیں اور پھر لکڑی کے تختے اُٹھا کر ہم سب سمندر کی طرف سرپٹ بھاگے۔ دیو نے زبردست شور مچایا۔ ہم نے ان تختوں سے بیڑا بنایا اور سمندر میں اُتر کر ان پر بیٹھ کر پتواروں سے اسے کھینے لگے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دیو کو اس کے دو دوست کنارے کی طرف لا رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں دیکھا تو بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر پھینکنے لگے۔ ہر پتھر اتنا بڑا تھا جتنا کہ ایک چھوٹا مکان ہوتا ہے۔ اتفاق سے پہلا پتھر تو ہم سے دُور گرا لیکن دوسرا ہمارے قریب گرا۔ اور کچھ لوگ اس کی زد میں آکر مر گئے۔ خوش قسمتی سے چند آدمی بچ گئے جن میں میں بھی شامل تھا۔

پھر تیز و تند ہوا چلنے لگی۔ سمندر میں موجیں اُٹھنے لگیں۔ کئی دنوں تک ہم موجوں کے تھپیڑے کھاتے بہے جا رہے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ آخر ایک دن ہم ایک جزیرے پر جا لگے۔

ایک اژدہا

ہم اس جزیرے پر صرف تین آدمی زندہ بچ سکے تھے۔ جہاز کے تمام ملّاح اور تاجر یا تو اس دیو کا لقمہ بن گئے تھے یا اس کی پھینکی ہوئی چٹان سے کچل کر مر گئے تھے۔ جزیرے پر کچھ درخت نظر آئے، ایک ندی بھی دیکھی۔ ہم جس جگہ اُترے تھے اسی کے قریب درختوں کے پھل چُن کر بھوک مٹائی، ندی کا پانی پیا اور سو گئے۔

اچانک ہمیں "ہس ہس" کی سی آواز سنائی دی۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک اژدہا ہم سب کو اپنی کُنڈلی میں گھیرے ہوئے ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی، اس نے ہم میں سے ایک کو نگل لیا۔ اس کی چیخیں سنائی دیتی رہیں، لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ رات بھر وہ اژدہا وہاں رہا۔ ہم ڈر کے مارے ہل تک نہ سکے۔

صبح ہوئی تو وہ کہیں چلا گیا۔ ہم سخت پریشان تھے کہ کیا کریں۔ شام کو آ کر وہ ایک اور آدمی کو نگلے گا۔ بھوک ستا رہی تھی۔ ہم نے کچھ پھل کھائے، پانی پیا اور پناہ کی تلاش میں نکلے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے باوجود کوئی پناہ نہ ملی۔ سوچا کہ کسی بڑے اور اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ رہنا چاہیے۔ چناں چہ ہم ایک درخت پر چڑھ گئے۔ رات کو اژدہا ہماری تلاش میں آیا۔ اس نے ہمارے درخت کو ڈھونڈ لیا۔ میں تو درخت کی چوٹی پر بیٹھا تھا، میرا ساتھی مجھ سے نیچے تھا۔ اژدہے نے بلند ہو کر اسے دبوچ لیا اور میں اس بے چارے کی چیخ و پکار سُن کر اپنا کلیجا مسوس کر رہ گیا۔

اب کیا ہوگا

صبح ہوئی تو اژدہا کہیں چلا گیا۔ میں تن تنہا رہ گیا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اگر میں نے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کیا تو آج رات میری باری ہوگی اور میں اس بے رحم اژدہے کا لقمہ بنوں گا۔ میں سوچتے سوچتے سمندر کے کنارے کی طرف جا نکلا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہاں بندر انسان نہیں تھے۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ چلا کہ ہو سکتا ہے کوئی ایسی چیز مل جائے جس کے ذریعے سے میں سمندر میں تیر سکوں۔ اتفاق سے کچھ تختے پڑے مل گئے۔ شاید یہ ہمارے جہاز کے تھے جسے بندر انسان دوسری طرف لے گئے تھے۔ میں نے رسیّوں سے ان تختوں کو اس طرح جکڑا کہ ایک صندوق سا بن گیا۔ اسی کام میں شام ہو گئی۔ اب اژدہے کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے خود کو اس صندوق میں بند کر لیا۔ اژدہا اپنا منھ صندوق کے چاروں طرف گھماتا رہا، لیکن لکڑی کے تختوں کی وجہ سے وہ مجھے اپنے منھ میں دبوچ نہیں سکتا تھا۔ آخر وہ چلا گیا۔ صبح میں اس صندوق سے باہر نکلا اور اسے مزید مضبوط کیا۔ پھر کچھ پھل اور پانی لا کر اس میں رکھ لیا اور اس کو پانی میں اُتار کر خود اس میں بیٹھ گیا۔ چل میری کشتی بسم اللہ۔

جان ہے تو جہان ہے

بند صندوق میں سمندر کا سفر، اللہ کی پناہ۔ اوپر چلچلاتی دھوپ تھی اور نیچے موجوں کے تھپیڑے۔ سمندر میں کوئی دیوار تو ہوتی نہیں کہ کہیں میں رُکتا، موجیں کبھی صندوق کو اِدھر لے جاتیں کبھی اُدھر۔ میں ہوا اور موجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ خوش قسمتی سے پاس سے گزرتے ہوئے ایک جہاز کے ملاحوں نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ جہاز کو قریب لائے اور مجھے اس آفت سے نکال کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے ہوش آیا تو لوگ میرے اِرد گرد جمع تھے۔ میں نے اپنی درد بھری بپتا سُنائی۔ کپتان، ملاحوں اور تاجروں نے بڑا دلاسا دیا اور کہا کہ وہ مجھے بغداد پہنچا دیں گے، لیکن ابھی تجارتی سفر باقی ہے، کئی بندرگاہوں کو جانا ہے۔ کچھ مال فروخت کرنا ہے اور کچھ خریدنا ہے۔ انشاءاللہ ان شہروں سے ہو کر ہم بصرہ جائیں گے۔

میری خوب تواضع کی گئی۔ چند دِنوں میں میری کم زوری دُور ہو گئی۔ اتنے میں جہاز ایک بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ تاجروں نے اپنا مال کنارے پر اُتروایا تاکہ خرید و فروخت کریں۔ جہاز کے کپتان نے اپنے ملاحوں سے کہا، "دیکھو، یہیں سِندباد کا مال بھی اُتار دو۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بیچ کر اس کی رقم بغداد سِندباد کے وارثوں کو پہنچا دوں۔"

میں نے اس کی یہ بات سُنی تو حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی جہاز ہے۔ میں نے کپتان سے پوچھا، "جناب کپتان صاحب! کیا اُس کے مال پر فلاں نشان بنا ہوا ہے۔"

اس نے جواب دیا، "ہاں، لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہے۔ سِندباد تو رُخ پرندے والے جزیرے پر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس بات کو تو ایک مدت گزر چکی ہے۔" میں نے اسے بتایا کہ میں ہی سِندباد جہازی ہوں۔ اپنے مال کی مزید نشانیاں بتائیں۔ اتنے میں سب ملاح ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ساری داستان انھیں سُنائی۔ تب انھیں یقین آگیا کہ سِندباد میں ہی ہوں۔ میں بھی اپنا سامان اُتروا کر منڈی میں لے گیا۔ میں نے سارا مال بیچا اور خوب خوب نفع کمایا۔ اس رقم سے میں نے ایسا مال خریدا جو بغداد میں اچھی قیمت پہ بک سکے۔

جہاز مزید ایک دو بندرگاہوں پر رُکا۔ وہاں بھی خرید و فروخت ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے تجارت میں خوب فائدہ ہوا۔ آخر ایک دن ہم بصرہ پہنچ گئے۔ وہاں سے میں بغداد گیا

اور پورے مال کو اچھے خاصے منافع پر بیچ دیا۔ ایک بار پھر میں مال و دولت کا مالک بن گیا۔
دوستو! اگر زندگی رہی تو کل میں آپ کو اپنے چوتھے سفر کا حال سناؤں گا۔

چوتھا سفر

ایک دن کچھ تاجر دوست میرے ہاں آئے۔ باتوں باتوں میں بحری سفر کا ذکر آیا۔ اس سے ایک بار پھر میرے دل میں شوق کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ وہ آگ ہے جو بُجھائے نہیں بجھتی۔ دوسرے ہی دن میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ چند دنوں میں مال لے کر بصرہ جا پہنچا اور ایک جہاز پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔ مشرق میرے لیے ہمیشہ جادو کی سرزمین رہی تھی۔ اَن دیکھے جزیرے، اَن دیکھے لوگ، انوکھی چیزیں، انوکھے رسم و رواج۔ وہ لوگ جو عجیب و غریب باتوں کی تلاش میں رہتے ہیں، بحری سفر ان کی پیاس بُجھاتے ہیں۔

ہم وطن سے بہت دُور کُھلے سمندر میں رواں دواں تھے کہ ایک دن زور کی آندھی آئی۔ جہاز ایسا پلٹا کہ ہم سب پانی میں جا گرے۔ جہاز ڈوبنے لگا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، "سندباد جہازی بہت جی لیا تو اب، لیکن آج تیری موت تیرے سر پر کھڑی ہے۔" سمندر بہت ہی دیالو ہے۔ ادھر میں نے یہ بات سوچی اُدھر ایک تختہ میری طرف بہ کر آ گیا اور میں اُچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ میں نے اس تختے پر بیٹھ کر دوسروں کی مدد کی اور وہ بھی کسی نہ کسی لکڑی کے ٹکڑے سے چمٹ گئے۔

یوں بھی ہوتا ہے

اگلے دن ہم موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر بہتے چلے گئے۔ آخر خُشکی کے ایک کنارے جا لگے۔ ہم میں سے کسی میں اتنا دَم نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل سکے۔ ساری رات ہم کنارے پر بے حس و حرکت پڑے رہے۔ سورج نکلا تو ہم اُٹھے۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ کچھ وحشی وہاں آ گئے۔ وحشی میں نے اس لیے کہا ہے کہ ان کی شکل انسانوں جیسی تھی ورنہ تھے وہ جانور، نہایت بدشکل، بھدّے اور گھناؤنے۔ انھوں نے ہمیں تھپّڑ اور چانٹے مار مار کر کھڑا کیا اور جانوروں کی طرح ہانکتے اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے

ان سے کچھ بات کی ۔ انھوں نے ہمیں زمین پر بٹھایا ۔ ہمارے لیے کھانا لایا گیا۔ یہ کھانا دیکھ کر مجھے تو متلی ہونے لگی ۔ جنھوں نے یہ کھانا کھایا وہ جادو میں آ گئے ۔ اب ان کی بھوک ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی ۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں ان وحشیوں کی کہانیاں پہلے سُن چکا ہوں ۔ جب وہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو پکڑ لاتے ہیں تو انھیں یہی غذا دیتے ہیں، کھانے والوں کا پیٹ نہیں بھرتا ۔ وہ کھاتے ہی چلے جاتے ہیں، اس طرح وہ موٹے ہو جاتے ہیں اور پھر ان وحشیوں کا لقمہ بنتے ہیں ۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ کھانا بند کریں، لیکن ان پر جادو چل چکا تھا اور وہ نہ رُک سکے ۔

میں جی ہی جی میں کڑھتا رہا کہ کسی طرح اپنے ساتھیوں کی جان بچاؤں، لیکن وہ وحشی ہر وقت ان کے گرد جمع رہتے تھے اور ہر وقت انھیں کھلاتے ہی رہتے تھے ۔ آخر میں نے سوچا کہ اگر میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو اپنی جان بچانا مجھ پر فرض ہے ۔ چناں چہ ایک دن میں سب کی آنکھ بچا کر ایک درخت کے نیچے چھُپ رہا، پھر موقع پا کر جنگل کے اندر گھس گیا۔ وہاں مجھے ایک پھل نظر آیا جسے میں جانتا تھا ۔ میں نے اس سے اپنا پیٹ بھرا اور اپنی جان بچانے کے لیے جتنا تیز چل سکتا تھا چلنے لگا ۔ سات دن تک میں چلتا رہا ۔ لیکن کہیں بھی مجھے کوئی انسان یا جانور نظر نہ آیا ۔

ساتویں دن ایک جگہ مجھے کچھ انسان نظر آئے ۔ میری جان میں جان آئی ۔ میں ان کی طرف بڑھا، ان لوگوں نے مجھے دیکھا تو اپنی تلواریں سونت لیں ۔ میں نے بلند آواز سے کہا، "اللہ کے واسطے میری بات تو سنو ۔" وہ میرے نزدیک آئے تو میں نے اپنی رُوداد بیان کی ۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا، "آج تک تمھارے علاوہ کوئی اور آدمی ان وحشیوں سے بچ کر نہیں آیا ۔" اب میں ان کے ساتھ رہنے لگا ۔

یہ لوگ ایک اور جزیرے کے تھے ۔ وہ اپنے جزیرے کو چلے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے ۔ ان لوگوں نے اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کیا ۔ دربار میں میری طلبی ہوئی ۔ میں نے اپنے بارے میں اور جو کچھ مجھ پر بیتی تھی، اس کا حال بیان کیا ۔ بادشاہ نے بڑی دل چسپی سے سُنا ۔ روزانہ میری طلبی ہوتی اور روزانہ بادشاہ طرح طرح کے سوالات پوچھتا اور غور سے سُنتا ۔

اس بادشاہ کا جزیرہ خوش حال تھا ۔ بادشاہ اور اس کی تمام رعیت گھوڑوں پر سوار ہوتی

تھی، لیکن زین کے بغیر۔ میں سمجھ گیا کہ وہ زین سے قطعی ناواقف ہیں۔ ایک دن اس بات کا میں نے بادشاہ سے ذکر کیا تو اس نے پوچھا، "زین کیا چیز ہے؟" میں نے کہا، "بادشاہ سلامت! میں ایک زین بنا کر لاؤں گا تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ زین کیا ہے۔" میں نے ایک اچھی سی زین تیار کی۔ بادشاہ اسے استعمال کر کے بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس شہر کے تمام اُمرا نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے لیے زینیں بناؤں۔ چناں چہ میں نے بے شمار زینیں تیار کر کے انھیں دیں۔ سب نے مجھے انعامات سے نوازا اور میں خاصا دولت مند ہو گیا۔

شادی خانہ آبادی

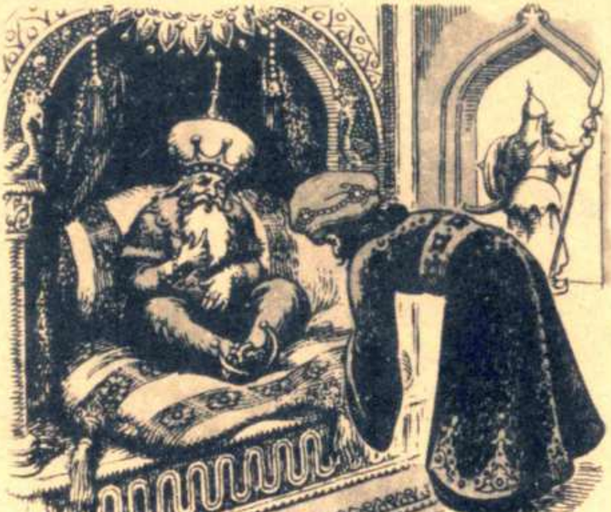

ایک دن بادشاہ نے مجھے بلوایا اور کہا، "میں اور میری رعیت تمھیں اپنا سمجھتی ہے، اب تم بھی اپنی اپنائیت ثابت کرو۔" میں نے عرض کیا، "میں اپنے آپ کو آپ کی رعیت شمار کرتا ہوں۔ فرمائیے کیا حکم ہے۔" بادشاہ نے کہا کہ میرے ایک درباری کی ایک حسین و جمیل اور

مال دار بیٹی ہے۔ تم اس سے شادی کر لو۔ میں نے ہاں کر دی۔ دو چار دنوں میں میری شادی ہو گئی۔ جیسا کہ بادشاہ نے مجھے بتایا تھا میری بیوی ایک حسین عورت تھی جو مجھ سے محبّت کرتی تھی۔ ہم ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ایک دن میری بیوی کے ایک رشتے دار کی بیوی فوت ہو گئی۔ میں تعزیت کے لیے اس کے گھر گیا۔ وہ بے چارہ بڑا پریشان تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بیوی کا غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، "دیکھو بھئی، تقدیر نہیں ٹلتی۔ جس کی موت آتی ہے وہ مرتا ہے۔ مجھے آپ کی بیوی کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا ہے۔ آپ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں آپ کو ایک اور نیک سیرت اور خوب صورت بیوی دے گا۔"

مُردوں کا غار

اس نے کہا، "تم نہیں جانتے ہماری رسم کیا ہے۔ جب مرد مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی مُردوں کے غار میں دھکیل دیتے ہیں اور جب بیوی مرتی ہے تو اس کے خاوند کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا، "یہ رسم تو بُری رسم ہے۔" مگر رسم قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی شام لوگ اس کی بیوی کی لاش کو شہر کے باہر ایک غار میں لے گئے۔ غار کے منھ سے ایک پتھر کو ہٹا کر لاش کو اندر پھینک دیا گیا۔ پھر انھوں نے میرے دوست کو رسیوں سے باندھ کر غار میں اُتار دیا۔ غار کے سامنے ایک بڑے پتھر کو جما دیا گیا اور سپاہی پہرے پر کھڑے ہو گئے۔

یہ بڑی دردناک بات تھی۔ میں نے بادشاہ سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے کہا، "یہ بڑی قدیم رسم ہے اور میں بھی اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔"

آج نہیں تو کل تیری باری ہے

پھر خود میری پیاری بیوی مختصر سی بیماری کے بعد چل بسی۔ لوگ آئے اور اس کی لاش کو مُردوں کے غار کی طرف لے گئے۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے احتجاج کی آواز بلند کی یعنی یہ حُجّت پیش کی کہ میں اس ملک کا نہیں، اس لیے مجھ پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔

ہمدرد نونہال، جولائی ۱۹۸۹ء

انھوں نے کہا، "ہمت مت ہارو ۔ تم ہم میں سے ایک ہو" وہ مجھے باندھ کر وہاں لے گئے اور غار میں اُتار دیا۔ میں نے بڑی عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی، "اے اللہ! میں غیروں میں پھنس گیا ہوں ۔ مجھے وہ اپنے قانون کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں ۔ اے میرے اللہ! تو مجھے بچالے۔"

مجھے غار میں کچھ چمک سی نظر آئی ۔ دراصل وہ لوگ تمام جواہرات مُردے کے ساتھ غار میں پھینک دیتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ غار میں ہر طرف جواہرات بکھرے پڑے تھے۔ مُردوں کو رسّیوں سمیت نیچے ڈال دیا جاتا تھا۔ اس لیے وہاں رسیاں بھی پڑی تھیں ۔ پھر میں نے وہاں کچھ حرکت بھی محسوس کی ۔ میرے خیال کے مطابق کوئی لومڑی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے پکڑوں، مگر اس نے مجھے کاٹا اور بھاگ گئی۔

لومڑی سے چھٹکارے کا ذریعہ

میں نے سوچا کہ اگر لومڑی اندر آتی ہے تو اس غار کے اندر کوئی اور خفیہ راستہ بھی ہو گا۔ لومڑی ایسی ذات ہے کہ ہیرا پھیری سے رُکتی نہیں ۔ وہ پھر آئے گی اور ضرور آئے گی۔ میں رسّی لے کر اس کی تاک میں بیٹھا کہ اسے قابو میں کر دوں گا۔ آخر وہ میرے قابو میں آ گئی ۔ میں نے رسّی سے اسے جکڑ دیا اور رسّی کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں رکھا۔ وہ ایک طرف بھاگی اور ایک سوراخ کو پہنچی ۔ معلوم ہوا کہ سوراخ تنگ ہے، لومڑی تو گزر سکتی ہے، لیکن آدمی نہیں گزر سکتا۔ میں دن بھر اس سوراخ کو چوڑا کرنے میں مصروف رہا اور آخر باہر نکلنے میں کام یاب ہو گیا۔

باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک پہاڑ کے دامن میں سمندر کے کنارے پر پہنچ گیا ہوں ۔ اس مقام کے متعلق مجھے کچھ معلومات تو حاصل تھیں، لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ جس ڈھلان کے نیچے میں کھڑا تھا وہ دیوار کی طرح عمودی تھی۔ نہ تو کوئی اوپر سے نیچے آسکتا تھا اور نہ نیچے سے اوپر جا سکتا تھا۔ قریب ہی ایک ندی سمندر میں گر رہی تھی اور ایک پھل دار درخت بھی تھا۔ میں نے پانی پیا، پھل کھائے اور سوچنے بیٹھ گیا۔ ایک ترکیب جو سمجھ میں آئی یہ تھی کہ یہاں سے ضرور کوئی جہاز گزرے گا اس لیے اس کا انتظار کیا جائے۔

دوسری بات یہ سوچی کہ کیوں نہ اس غار سے ہیرے جواہرات لائے جائیں۔ اگرچہ اس میں خطرہ بڑا ہے۔ میرے پاس کچھ رسیوں کے ٹکڑے تھے میں نے سوچا اگر میں سب کو جوڑ کر ایک لمبی رسی بنالوں تو غار میں اُترنا اور اس سے نکلنا آسان ہو جائے گا۔

چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کئی بار غار میں اُترا اور ڈھیروں جواہرات نکال لایا۔ غار سے کپڑے لا کر ایک بوری بنائی اور اس کو جواہرات سے بھر لیا۔ اب مناسب یہی تھا کہ میں کسی جہاز کا انتظار کروں۔

آخر ایک دن ایک جہاز آہی گیا اور یہ حقیقت کُھلی کہ جہاز اس ندی سے تازہ تازہ پانی بھرنے کے لیے آتے ہیں۔ میں نے کپتان سے بات چیت کی لیکن سارا بھید اُسے نہیں بتایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں کس مصیبت میں ہوں۔ اگر تم مجھے بچالو تو میں تمھیں اس کا صلہ دوں گا۔ اس نے کہا کہ ہم لوگ مصیبت زدہ لوگوں کو بچانے کی اُجرت نہیں لیتے۔ اس کا اجر ہمیں اللہ دے گا۔ چناں چہ وہ مجھے بخیر و عافیت وطن لے آیا۔

اب کی بار میں نے ارادہ کیا کہ پھر کبھی بحری سفر نہ کروں گا، لیکن دوستو! آدمی ارادے باندھتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ کل، بشرطِ زندگانی میں اپنے پانچویں سفر کا حال بیان کروں گا۔

پانچواں سفر

میری ایک عادت ہے کہ میں خوشیوں کو تو یاد رکھتا ہوں دُکھوں کو بھول جاتا ہوں۔ ایک دن میں بصرہ گیا۔ دیکھا کہ ایک نیا جہاز بن رہا ہے۔ وہ جہاز مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ جلدی ہی کئی تاجر بھی مل گئے اور ہم بحری سفر کو روانہ ہو گئے۔ ملک ملک، شہر شہر، بندر گاہ بندر گاہ ہم سفر کرتے گئے۔ ہر جگہ کچھ مال بیچا، کچھ خریدا، کئی نئے مقامات دیکھے۔ کئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک دن ہم جزیرے میں پہنچے۔ جزیرہ خاصا بڑا تھا، لیکن نہ تو اس میں کوئی آدمی نظر آیا اور نہ درخت اور ندیاں نظر آئیں۔ دوسرے تاجر جہاز سے اُتر کر ساحل پر چہل قدمی کرنے لگے۔ انھیں ایک گنبد نما چیز نظر آئی جو کہ سفید تھی۔ میں نے انھیں منع کیا کہ اسے ہاتھ نہ لگانا۔ یہ رُخ پرندے کا انڈا ہے، جلدی سے جہاز میں سوار ہو جاؤ۔

یا تو انھوں نے میری بات سُنی نہیں یا انھیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ پتھر لے کر انھوں نے اس انڈے کے ایک طرف ایک بڑا سوراخ کر دیا۔ اندر سے آواز سی آئی۔ شاید رُخ کا بچّہ مر رہا تھا۔ اس آواز کا جواب دور آسمان سے سنائی دیا۔ دو بڑے بڑے رُخ جو اس بچے کے ماں باپ تھے آتے۔ ان کے پَر اتنے بڑے تھے کہ نیچے زمین پر اندھیرا چھا گیا۔

جہاز بھی گیا

میں نے سمجھا کہ اب یہ بڑے رُخ ہمیں مار ڈالیں گے، لیکن وہ اُڑ کر کہیں چلے گئے۔ میں نے لوگوں سے کہا، دوستو! جلدی کرو۔ ہمیں فوراً جہاز لے جانا چاہیے۔ تاجر، ملّاح اور جو بھی کنارے پر تھے سب جہاز پر سوار ہو گئے۔ کپتان نے جہاز کو کُھلے سمندر میں لے جانے کی کوشش کی۔ اتنے میں وہ دونوں رُخ ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ دونوں نے ایک ایک پتّھر اُٹھا رکھا تھا اور ہر پتّھر ایک چھوٹے مکان کے برابر تھا۔

بھلا رُخ ہمارے اوپر سے گزرا اور اس نے پتھر کو ہم پر گرایا۔ کپتان نے بڑی ہوشیاری سے جہاز کو ایک طرف کاٹا اور ہم بچ گئے۔ پتھر سمندر میں گرا۔ پانی گزوں اوپر اُچھلا۔ جہاز بے قابو ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کپتان ہمیں دوسرے پتھر سے نہ بچا سکا۔ وہ جہاز پر گرا اور جہاز بھی گیا۔

ہم میں سے کئی آدمی مارے گئے۔ خوش قسمتی سے میں بچ گیا۔ ایک تختہ میرے ہاتھ آ گیا اور اس سے میری جان بچ گئی۔ چار دن اور چار رات میں اپنے تختے سے چمٹا پانی میں ہچکولے کھاتا رہا۔ آخر ایک جزیرے میں جا پہنچا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ جزیرے میں درخت بھی تھے اور تازہ پانی بھی۔ اس سے میری ہمت جوان ہو گئی۔

سمندر کا بوڑھا آدمی (شیخ البحر)

کچھ دیر میں نے کمر سیدھی کی اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھے وہ کچھ زیادہ ہی کم زور اور بیمار نظر آیا۔ اسے دیکھ کر فوراً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں یہ بھی میری طرح کسی غرق شدہ جہاز سے بچ کر تو یہاں نہیں پہنچا۔ ایک ندی کے کنارے وہ بالکل خاموش اور بے حرکت بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر بات کرنے کی کوشش کی۔ اس کے منھ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ اس نے ندی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سمجھا وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے ندی کے اس پار پہنچا دو۔ میں نے اسے اُٹھا کر ندی کو عبور کرنا چاہا۔ پھر اس میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنی ٹانگیں میری گردن کے گرد ڈال دیں۔ اس کی ٹانگیں دُبلی پتلی مگر مضبوط تھیں۔ میں نے چاہا کہ اسے اُتار دوں مگر اس نے مجھے لات ماری۔ پھر اس نے میری گردن کو اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں میں جکڑ لیا۔ ایسا لگا کہ میرا دَم گُھٹ جائے گا۔

میں گویا اس کا قیدی بن گیا۔ رات ہوئی تو میں نے کچھ پھل کھائے، پانی پیا اور سو رہا۔ پھر صبح وہ میرے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ جو کام وہ مجھ سے کرانا چاہتا اس کے لیے مجھے ایک دو لاتیں رسید کر دیتا۔ چند دن تک یہی کچھ ہوتا رہا۔ ایک دن اس جنگل میں مجھے ایک پھل نظر آیا۔ بوڑھے نے مجھے لات ماری۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ پھل مانگ رہا ہے۔ میں نے وہ پھل توڑ کر اسے کھلا دیا۔ پھل کو کھانے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ بوڑھے کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔

میں نے ایک اور پھل اسے کھلایا۔ اس کے بعد وہ میرے کندھوں سے نیچے گر پڑا اور مر گیا۔ ایک پریشانی تو ختم ہوئی۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتفاق سے ایک جہاز اس طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے شور مچا کر ملاحوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جہاز ساحل پر لے آئے۔ میں نے انھیں اس بوڑھے آدمی کا واقعہ سنایا تو وہ مجھ سے کہنے لگے "تم خوش قسمت آدمی ہو، اس لیے اس کے چنگل سے بچ نکلے ہو۔ اسے شیخ البحر (یعنی سمندر کا بوڑھا) آدمی کہتے ہیں۔ اس نے کئی ملاحوں کی جان لی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس جزیرے پر اکیلا نہیں آتا۔"

میں نے ان سے پوچھا، "آپ اس جزیرے پر آخر کیوں آتے ہیں؟" انھوں نے کہا کہ ہم یہاں سے ناریل لینے آتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا، "چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ انھوں نے دو تین خالی بوریاں لیں اور ایک کو پتھروں سے بھر لیا۔ پتھروں والی بوری انھوں نے مجھ سے اٹھوائی۔ ہم جنگل کے ایک ایسے حصے میں پہنچے جہاں ناریل کے بے شمار درخت کھڑے تھے۔ یہ درخت خاصے اونچے تھے اور ان کے پھل یعنی ناریل زمین سے خاصی بلندی پر درخت کی چوٹی کی ٹہنیوں پر لگے ہوئے تھے۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ان درختوں پر بندروں کی ایک فوج مورچہ بند تھی۔ جونہی ہم وہاں پہنچے ہم نے بندروں پر وہ پتھر پھینکے جو ہم بوری میں بھر کر لائے تھے۔ بندروں کو غصہ آیا تو انھوں نے ناریل توڑ توڑ کر ہم پر ان کی بارش برسا دی۔ ہم نے ان سے اپنی بوریاں بھر لیں۔ انھیں اٹھا کر جہاز پر لے گئے اور پھر خالی بوریاں لے آئے۔ شام تک ہم یہی کچھ کرتے رہے۔ ہم نے ہزاروں ناریل جمع کر لیے۔

اس کے بعد جہاز دوسرے جزیروں کو روانہ ہوا۔ وہاں ناریل کی منڈیاں تھیں۔ ہم نے وہاں یہ ناریل بیچ کر دوسری چیزیں خریدیں۔ اس جزیرے پر موتی اور مرجان بھی ملتے تھے۔ ہم میں سے ہر شخص نے اپنی بساط بھر سامان لیا۔ پھر دو چار اور جزیروں کا سفر کیا۔

میں جب اس جہاز کے مسافروں کے پاس آیا تھا تو سوائے لباس کے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے ان تاجروں سے کہا، "مجھے تجارت کا بڑا تجربہ ہے اور اللہ کی طرف سے مجھے برکت بھی حاصل ہے۔ اگر تم لوگ مجھے اپنا گماشتہ (سیلز مین) بنا لو تو مجھے امید ہے کہ تم کو بڑا فائدہ

ہو گا۔ مجھے تم اپنی کمائی سے کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔" وہ سب راضی ہو گئے۔ اس سفر میں میں نے اچھی خاصی دولت کمائی۔ جہاز نے پھر بصرہ کا رُخ کیا اور ایک دن میں اپنے شہر بغداد پہنچ گیا۔

دوستو! ان شاء اللہ میں کل آپ کو چھٹے سفر کی کہانی سناؤں گا۔

چھٹا سفر

بغداد میں رہتے ہوئے میں روز بازار جاتا۔ کئی تاجر ملتے، کئی کپتانوں اور ملاحوں سے ملاقات ہوتی۔ میرے دل میں سفر کی چنگاری پھر سلگ اُٹھی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ اب کی بار کچھ سفر خشکی پر کروں گا اور کچھ سمندر میں۔ چناں چہ میں نے بغداد سے کچھ اونٹ اور گھوڑے خریدے اور ان پر مال اسباب لاد کر خشکی کے راستے ہندستان کی طرف چلا۔

سیکڑوں شہروں سے میرا گزر ہوا۔ آخر چلتے چلتے میں ہندستان پہنچ گیا۔ وہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ سمندر کا سفر کرنے کے لیے مجھے جنوبی ہندستان جانا چاہیے۔ چناں چہ میں اسی طرف چلا۔

مال مویشی بیچ دیے۔ سمندر کے لیے سفر کا مال خریدا اور ایک جہاز میں سوار ہو گیا۔ ہمارا جہاز کھلے سمندر میں کئی دن اور کئی راتیں چلتا رہا۔ ایک دن طوفان آیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اس نے جہاز کو ہانکنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے کہ کپتان چلّا چلّا کر کہنے لگا، "سب مارے گئے، سب مارے گئے۔" ہم نے پوچھا، "کیا ہوا۔ یہ کون سا مقام ہے؟" اس نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا، "یہ جگہ "موت" کے غار کی ہے۔ دیکھتے نہیں وہ سامنے جو پہاڑی ہے اس کے نیچے ایک غار ہے جہاں سمندر کا پانی نیچے اُترتا ہے۔ جہاز ہو یا کشتی سب اس میں گم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کوئی زندہ نہیں بچا۔"

تمام ملاّح ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کبھی چپّو چلاتے، کبھی پتوار سنبھالتے، مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ہمیں نظر آرہا تھا کہ پانی غار میں گھسا جا رہا ہے۔ ہم سب نے دعائیں مانگیں، گڑگڑائے، سجدے کیے۔ اتنے میں ایک دھماکا سنائی دیا۔ ہم غار کے اندر تھے۔ جہاز کسی چیز سے ٹکرایا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں مر چکا ہوں، مگر میں مرا نہیں تھا۔ مجھے نظر کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ البتہ پانی کے بہاؤ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آندھی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی سخت

جیسے پر پانی کے اُوپر حرکت کر رہا ہوں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ تاریکی میں میرا سفر جاری رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن یہ خواب نہ تھا، حقیقت تھی۔

سراندیپ

یا تو میں سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ نیند کے دوران مجھے شور و غل سُنائی دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میں جہاز کے ایک تختے پر پڑا تھا اور کئی لوگ میرے اِرد گرد جمع تھے۔

میں نے پوچھا "میں کہاں ہوں؟"

وہ میری زبان نہیں سمجھے۔ کچھ کُھسر پُسر ہوئی۔ مجمع سے ایک آدمی آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم سراندیپ میں ہو۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، کیوں کہ میں اس کے راجا کے بارے میں اور خود اس ملک کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا تھا۔ جو شخص ترجمان کے طور پر مجھ سے باتیں کر رہا تھا اس نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ اس دریا سے نہریں نکالنے آئے ہیں جو ہمارے کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ یہ دریا ان پہاڑوں سے آ رہا ہے۔ کبھی کوئی ان پہاڑوں کے پَرلی طرف نہیں گیا اور نہ کبھی کوئی اس طرف سے یہاں آیا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ تم وہاں سے کیسے آ گئے ہو۔

سراندیپ کا راجا

مجھے کیا معلوم تھا کہ میں وہاں کیسے پہنچا۔ میں نے اسے اپنے سفر کا حال سُنایا اور خاص طور وہ واقعہ جس میں ہمارا جہاز غار میں جا گرا تھا۔ اس نے میری باتوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کر کے لوگوں کو بتایا۔ سب نے کہا کہ یہ حیرت انگیز بات ہے۔ اسے مہاراج کے پاس لے چلنا چاہیے۔

ان سب نے مجھے تسلّی دی۔ میری خاطر تواضع کی اور پھر مجھے راجا سراندیپ کے پاس لے چلے۔ اس کا پایۂ تخت تین دن کی مسافت پر تھا۔ تین دن بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ مہاراجا کو اطلاع ہوئی۔ وہ تشریف لائے اور میری سرگزشت سُنی۔ پھر ملازموں کو حکم دیا کہ مجھے عزّت و احترام سے ٹھیرایا جائے۔ روزانہ مہاراجا مجھے اپنا ہاں بُلواتا، کئی سوالات کرتا، یہاں

تک کہ میں نے اسے اپنے چھے سفروں کے حالات سُنا دیے اور وہ بہت خوش ہوا۔
ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ بصرے کا ایک جہاز بندر گاہ پر لگا ہے۔ میں نے مہاراجا سے اجازت چاہی۔ اس نے مجھے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے بے شمار تحفے دیے اور ساتھ ہی خلیفہ ہارون الرشید کے نام ایک خط بھی دیا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا:
"یہ خط سراندیپ کے مہاراج ادھیراج کی طرف سے میرے دوست عظیم خلیفہ ہارون الرشید کے نام ہے۔"
خوش قسمتی سے سراندیپ سے بصرہ کا سفر بڑا خوش گوار رہا۔ وطن پہنچ کر میں وہ خط خلیفہ کے دربار میں لے گیا۔ خلیفہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آئے اور میری داستان دل چسپی سے سُنی۔
دوستو، اگر زندگی رہی تو میں ساتویں سفر کی کہانی آپ کو کل سُناؤں گا۔

ساتواں سفر

چھٹے سفر کے خاتمے پر خلیفہ ہارون الرشید نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ اس سے تاجر برادری میں میرا وقار اور بڑھ گیا۔ نئے نئے دوست بننے لگے۔ چھے سفروں میں ایک عمر گزر گئی تھی۔ جوانی پختہ عمر میں ڈھل گئی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ سفر نہیں کروں گا۔ اب تک تو ستارہ عروج پر رہا ہے۔ میں ہر مصیبت سے بچ نکلا ہوں، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔
ایک دن خلیفہ ہارون الرشید کا پیغام پہنچا۔ میں ان کے دربار میں پہنچا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا، "سندباد جہازی! تمھیں یاد ہے کہ تم مہاراجا سراندیپ کا میرے نام ایک خط لائے تھے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرا جواب ان تک پہنچا دو۔" خلیفہ کا فرمان تھا، اس لیے میں نے خوشی خوشی منظور کر لیا۔
سرکاری ملازموں کو حکم دیا گیا کہ وہ میرے لیے ایک بہترین جہاز کا بندوبست کریں۔ جہاز کا انتظام ہو گیا۔ خلیفہ کی طرف سے بغداد، اسکندریہ اور قاہرہ کے انمول تحفے میرے حوالے کیے گئے۔ میں یہ سب کچھ لے کر سراندیپ پہنچا۔ مہاراجا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور جب میں نے تمام تحفے اس کی نذر کیے تو وہ اور بھی خوش ہوا۔ یہ تو ایک سفارتی سفر تھا،

اس لیے میں نے مہاراجا سے واپسی کی اجازت مانگی اور جہاز لے کر بصرہ روانہ ہو گیا۔

بحری لٹیرے

تین دن کے سفر کے بعد ایک دن اچانک ہم پر بحری لٹیروں نے دھاوا بول دیا۔ پانچ یا چھے بڑی بڑی کشتیوں میں سیکڑوں لٹیرے سوار تھے۔ انھیں قزّاق بھی کہتے ہیں۔ ان کشتیوں نے ہمارے جہاز کے گرد گھیرا ڈال کر ہمیں اور ہمارے جہاز کو قیدی بنا لیا۔ وہ ہمارے جہاز کو ایک جزیرے میں لے گئے اور وہاں ہم سب کو بیچ دیا۔

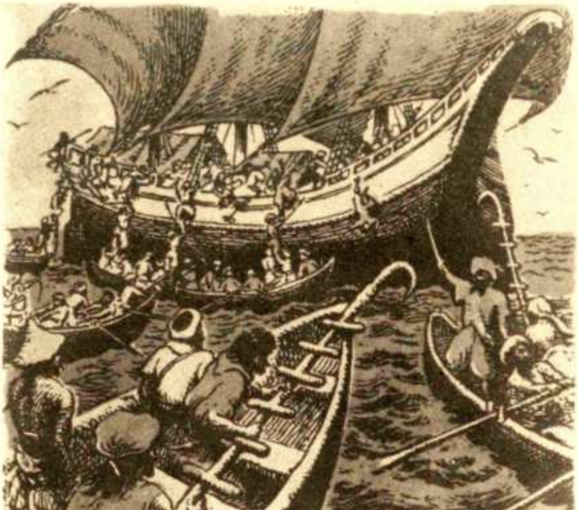

مجھے جس تاجر نے خریدا وہ ایک مہربان اور شریف آدمی تھا۔ مجھ سے بڑی نرمی سے پیش آیا۔ ایک دن اس نے مجھے بلا کر پوچھا، "کیا تم تیر چلا سکتے ہو؟" میں نے جواب دیا، "ہاں۔" اس نے کہا، "چلو اچھا ہوا، کیوں کہ ہمارے ملک کا دستور ہے کہ جو غلام ہم خریدتے ہیں انھیں ہم ہاتھیوں کے شکار کے کام پر لگاتے ہیں۔ ہاتھی مار کر ہم ان کے قیمتی دانت حاصل

کرتے ہیں اور پھر ان کی آمدنی سے کچھ رقم ان سمندری لٹیروں کو دیتے ہیں۔ میں آج ہی تمھیں جنگل میں لے جاؤں گا۔" شام کو وہ مجھے لے کر جنگل پہنچا۔

ہاتھیوں کا شکار

رات ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ دیکھو تم اس درخت پر چڑھ جاؤ۔ جب ہاتھی قریب آئیں تو ایک کو اپنے تیر سے گھائل کر دینا۔ میں صبح آؤں گا۔ میں خاصی دیر تک ہاتھیوں کا انتظار کرتا رہا۔ آخر ایک ہاتھی اس درخت کے قریب آیا جس پر میں بیٹھا تھا۔ میں نے تیر چلایا اور وہ زخمی ہو گیا۔ صبح کو تاجر آیا اور وہ میرے قریب مُردہ ہاتھی دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔

اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، "مجھے خوشی ہے کہ تمھارا نشانہ اچھا ہے۔ یاد رکھو اگر تم ہاتھی کو نہیں مار سکے تو پھر وہ تمھیں ضرور مار دے گا۔" ہم ہاتھی دانت لے کر واپس چلے گئے۔ اسی روز بعد دوپہر میری دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ انھیں بھی سمندری قزاقوں نے پکڑ کر بیچا تھا اور وہ بھی ہاتھیوں کا شکار کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مجھ سے کہنے لگا، "اگر ہم روز روز ہاتھی مارتے رہیں تب بھی ہم موت سے بچ نہیں سکتے۔ ہاتھی تو ایسی مخلوق ہے کہ اگر ایک ہاتھی مارا جائے تو اس کا رشتے دار ہاتھی بدلا لیتا ہے۔ ان میں اتنی عقل موجود ہے۔" اس نے مجھ سے بڑے کام کی بات کی تھی۔ میں نے اس پر غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک تو مجھے ایک ہی درخت پر دوسری بار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہر بار درخت بدل لینا چاہیے۔ دوسرے جب ایک سے زیادہ ہاتھی ہوں تو پھر تیر نہیں چلانا چاہیے اور تیسرے اس یقین سے تیر چلانا چاہیے کہ ہاتھی ڈھیر ہو جائے، اگر وہ بچ گیا تو میری خیر نہیں ہو گی۔

مدتوں ہر رات میں ایک ہاتھی مارتا رہا۔ تاجر اس بات سے بہت خوش تھا۔ اس نے میری تعریف کی اور کہا کہ آئندہ ہر دس ہاتھی دانتوں میں سے ایک دانت تمھارا ہو گا۔ جب تم سو دانت جمع کر لو گے تو میں تمھیں آزاد کر دوں گا اور تم وہ سو ہاتھی دانت بھی اپنے ساتھ لے جانا۔

میری قسمت اچھی تھی۔ میں تقریباً سو ہاتھی دانت جمع کر چکا تھا۔ مگر ایک دن ایک ہاتھی زندہ بچ کر بھاگ نکلا۔ دوسری رات جنگل میں بڑا ہنگامہ تھا۔ سیکڑوں ہاتھی میری تلاش میں

سرگرداں تھے۔

آخری حادثہ

ایک دن تمام ہاتھی اس درخت کے گرد جمع ہو گئے جس پر میں چڑھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا "سند باد جہازی، اب تک تو تمھارا مقدّر چمکتا رہا ہے، مگر آج تمھاری شامت آ ہی گئی ہے۔" ہاتھی درخت کے نزدیک آتے گئے۔ میں نے صورتِ حال کو سمجھا اور کوئی تیر نہ چلایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دُور اندیشی ہی سے میری جان بچی۔ پھر سب ہاتھیوں نے مل کر درخت

کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالا۔ میں دھڑام سے زمین پر گرا۔ ایک ہاتھی نے مجھے سونڈ سے اُٹھا کر اپنی پیٹھ پر بٹھایا اور پھر وہ ایک قطار بنا کر چل دیے۔ وہ کئی وادیوں سے گزرے۔ آخر پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی میں پہنچے اور وہاں رُک گئے۔

اس سے پہلے میں نے ایسی کہانیاں سُنی تھیں کہ ہاتھیوں کا ایک مرگھٹ ہوتا ہے جہاں جا کر وہ مرتے ہیں، مگر مجھے ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ آج یہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سیکڑوں تو کیا ہزاروں ہاتھی یہاں مر چکے تھے۔

دوسرے ہاتھی میرے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ بھی رہے تھے، لیکن کسی نے مجھے چھُوا نہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ نگاہوں میں مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ بات کر سکتے تو غالباً مجھ سے یہی کہتے کہ تم ہمیں کیوں مارتے ہو؟ یہاں دیکھو۔ ہزاروں ہاتھی دانت پڑے ہیں۔ ہمارے یہ کس کام کے۔ تم لے جاؤ اور لوگوں سے کہو، اگر تمھیں ہاتھی دانت ہی چاہییں تو ہمیں مت مارو، ادھر سے کچھ ہاتھی دانت اُٹھا کر لے جاؤ۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں پشیمانی کی تصویر بن چکا تھا۔ وہ میرے جذبات کو بھانپ گئے۔ ایک طرف سے ہاتھیوں کا گھیرا ٹوٹا اور جس ہاتھی پر میں سوار تھا وہ مجھے لے کر چلا اور اس کے ساتھ دو اور ہاتھی چلے۔ جنگل کے ایک کنارے پر جا کر اس ہاتھی نے اپنی سونڈ سے مجھے اُٹھا کر آہستہ سے زمین پر ڈال دیا۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں ہاتھیوں کا پیغام سمجھ چکا تھا۔ چناں چہ میں اپنے آقا تاجر کو اور ہاتھی دانت کا کاروبار کرنے والے دوسرے تاجروں کو ہاتھیوں کے اُس مرگھٹ میں لے گیا۔ وہ وہاں ہزاروں ہاتھی دانت دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ میں نے ان سے کہا: "دیکھیے

آپ وعدہ کیجیے کہ آپ روزانہ ضرورت سے زیادہ ہاتھی دانت یہاں سے نہیں اٹھائیں گے۔"
انھوں نے وعدہ کیا۔
ہم سب خوشی خوشی واپس آئے۔ تمام تاجروں نے مل کر مجھے تحفوں سے مالا مال کر دیا۔
میں سو ہاتھی دانت اور وہ تحفے اپنے ساتھ وطن لے آیا۔ سب چیزیں بیچ کر بے شمار دولت

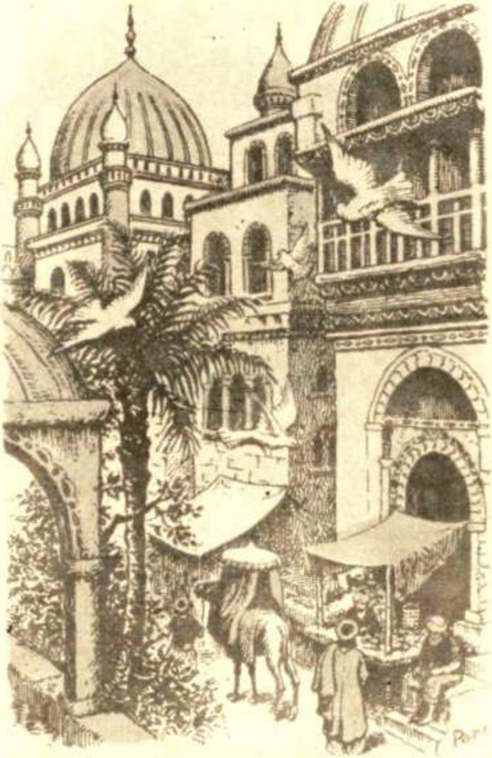

جمع کی۔ یہ دس سال پہلے کی بات تھی۔ یہی میرا آخر سفر تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی سفر نہیں کیا۔ مجھے ان بے زبان ہاتھیوں کا پیغام ہمیشہ یاد رہے گا۔
اللہ حافظ۔

ہمدرد نونہال، جولائی ۱۹۸۹ء

کھِل کھِلائیے

لائبریرین حیران تھا کہ ایک صاحب روزانہ ایک ہی کتاب جاری کراتے ہیں، اسے کھول کر دیکھتے ہیں اور پھر ایک زور دار قہقہہ لگا کر کتاب کو بند کر کے لائبریرین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لائبریرین کے دل میں تجسس پیدا ہوا اور ایک دن وہ کتاب ان صاحب کو دینے کے بعد ان کے پیچھے کھڑا ہوا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس شخص نے کتاب کھول کر ایک تصویر پر نظریں جما دیں۔ یہ ایک بیل اور ایک لڑکے کی تصویر تھی۔ بیل لڑکے کا پیچھا کر رہا تھا۔

لائبریرین پوچھنے ہی والا تھا کہ حضرت اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے کہ ان صاحب نے لائبریرین کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"ہات تیرے کی! ذرا سا لڑکا ابھی تک تیرے قابو میں نہیں آیا۔" مرسلہ: محمد سرور بھٹی، سکھر

◘ دو دوست مچھلیوں کا شکار کھیل رہے تھے۔ اتنے میں جھیل کا محافظ آگیا، ایک دوست اٹھ کر بھاگا۔ محافظ نے اس کا پیچھا کیا اور پکڑ لیا، "تم لائسنس کے بغیر مچھلی کا شکار کیوں کھیل رہے تھے؟" اس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اپنا لائسنس نکال کر محافظ کو دکھاتے ہوئے کہا، "میری یہ ہمت کہ میں لائسنس کے بغیر شکار کھیلوں!"

محافظ نے حیرانگی سے لائسنس دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا، "جب تمھارے پاس لائسنس موجود تھا تو پھر بھاگے کیوں تھے؟"

"اس لیے کہ میرے دوست کے پاس لائسنس نہیں تھا۔" لڑکے نے جواب دیا اور جب محافظ نے پلٹ کر جھیل کے کنارے پر نظر ڈالی تو وہاں سے اس کا دوست غائب تھا۔

مرسلہ: نور جہاں، شہداد پور

◘ شہر میں موسیقی کی ایک بہت بڑی محفل کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ایک صاحب پروگرام مینیجر کے پاس آئے اور پروگرام میں شرکت کی اجازت چاہی۔ مینیجر نے ان صاحب سے پوچھا، "آپ گانا گاتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"سارنگی بجاتے ہیں؟"
"نہیں جناب۔"
"تو پھر طبلہ بجاتے ہوں گے؟"
"جی نہیں۔"
مینیجر نے جھلا کر پوچھا، "تو پھر آپ کیا بجائیں گے؟"

"جناب میں تالیاں بجاتا ہوں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔ مرسلہ: اینلا یوسف بھٹی، کراچی

◻ ایک تاجر کو توقع سے بڑھ کر اپنے کاروبار میں منافع ہوا۔ اس منافع میں اس کے ایک سب سے پرانے اور وفادار ملازم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ تاجر نے اس ملازم کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور اسے پانچ ہزار رُپے کا چیک بطور انعام دیا۔ ملازم کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے چیک پر نظر ڈالے بغیر مالک کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر جانے لگا تاجر نے اسے روکتے ہوئے کہا، "ذرا سننا تو، چیک کو سنبھال کر رکھنا۔ اگر آئندہ برس بھی اتنا نفع ہوا تو اس چیک کو میرے پاس لے آنا۔ میں دستخط کر دوں گا۔"

مرسلہ: خالد محمود، کراچی

◻ ایک صاحب کو پوسٹر پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن شام کو وہ فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک کھمبے پر پڑی جس پر پوسٹر لگا ہوا تھا مگر وہ بہت اوپر تھا اس لیے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ صاحب پوسٹر پڑھنے کے لیے کھمبے پر چڑھے۔ پوسٹر پر لکھا تھا:
"کھمبا گیلا ہے ہاتھ نہ لگائیں۔"

مرسلہ: ہما نور، کراچی

◻ ایک شخص دوسرے شخص سے: جب میں پنکھا بند کرتا ہوں تو وہ پھر بھی چلتا رہتا ہے۔
دوسرا شخص: واہ بھئی! کمال کا پنکھا ہے۔
پہلا شخص: یہ کمال کا پنکھا نہیں، میرا پنکھا ہے۔ مرسلہ: رقیہ سلطانہ، کراچی

◻ ایک امریکی خاتون ریاست کے گورنر کے پاس گئیں اور بولیں، "جناب والا! میرا شوہر قید کی سزا بھگت رہا ہے۔ ازراہِ کرم اُسے معاف کر دیجیے۔"
گورنر: آپ کا شوہر کس جرم میں گرفتار ہوا تھا؟
عورت: گوشت چوری کرنے کے الزام میں۔
گورنر: اُس کے رویّہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟
عورت: بہت ظالمانہ۔ ہر وقت مارتا پیٹتا تھا۔
گورنر: پھر آپ اُسے رہا کیوں کروانا چاہتی ہیں؟ عورت: گوشت ختم ہو گیا ہے جناب والا!
مرسلہ: عمر خطاب خاں، اورنگی کراچی

◻ اتوار کو پادری نے بڑے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے بیواؤں اور یتیموں کے لیے چندے کی اپیل کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر مجمع میں کوئی بیوہ یا

یتیم ہے تو وہ بے شک چندہ نہ دے۔
اگلے اتوار پادری نے کہا، "گزشتہ اتوار میں نے کہا کہ بیوائیں اور یتیم چندہ نہ دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ دو بڑی جنگوں میں بھی اُس قدر بیوائیں اور یتیم نہیں ہوئے تھے جتنے میرے چندے کی اپیل سے ہو گئے۔"

□ سالن میں دوسرے دن بھی نمک زیادہ تھا۔ شوہر بے چارہ کھانا ایسے کھا رہا تھا جیسے کونین نگل رہا ہو۔ تیز مزاج بیوی نے پوچھا، "آپ نے آج بھی کھانا کم کھایا ہے۔ کیا کھانا لذیذ نہیں تھا؟"
شوہر نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا، "لذیذ بے حد لذیذ، کل صرف شوربے میں نمک زیادہ تھا۔ آج نمک میں شوربا کم ہے۔"

□ ایک نئے شاعر صاحب ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گئے۔ ایڈیٹر نے پوچھا، "یہ غزل آپ ہی کی ہے؟" شاعر نے جواب دیا، "بے شک! کیا آپ اسے شائع کر رہے ہیں؟"
ایڈیٹر نے کہا، "نہیں، یہ غزل ہمارے رسالے کے معیار کی نہیں ہے۔"
شاعر صاحب بڑبڑائے، "یا اللہ! کیا غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہو سکتی ہیں!"
مرسلہ: تنزیل رضا محمود، ڈیرہ غازی خان

□ "عمران صاحب! براہ کرم! آٹو گراف دے دیجیے۔ میرا بچّہ بہت شوقین ہے۔"
"مگر میں عمران نہیں ہوں۔"
"کیا فرق پڑھتا ہے، میرا بچّہ کب پڑھ سکتا ہے۔"
مرسلہ: حسن مہدی خراسانی، کراچی

□ پہلا دوست: میں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کسی سے شرط نہیں لگاؤں گا۔
دوسرا دوست: رہنے دو، بھلا تم کسی بات پر قائم رہ سکتے ہو۔
پہلا دوست: اچھا یہ بات ہے۔ تو پھر لگا لو شرط۔
مرسلہ: دل شاد حسین طور، جہلم

□ ایک پروفیسر صاحب کے ایک شاگرد نے انھیں اپنی شادی کی تقریب میں مدعو کیا اور لکھا: "آپ کو یہ جان کر مسرت ہو گی کہ ہم ایک سے دو ہو رہے ہیں۔"
پروفیسر صاحب نے جواب دیا، "میری دُعا ہے کہ آپ ایک ہو کر رہیں۔"
مرسلہ: کامران احمد خاں، کراچی

□ ایک کمپاؤنڈر نے ڈاکٹر سے کہا، ڈاکٹر صاحب میری بیوی بیمار ہے اس کی تیمار داری کے لیے ایک ہفتے کی چُھٹی دے دیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا، "تم بڑے جھوٹے ہو، ابھی ابھی تمھاری بیوی کا فون آیا ہے وہ کہہ رہی تھیں تمھاری چھٹی منظور نہ کی جائے، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" کمپاؤنڈر بولا، "پھر تو ہمارے ہسپتال میں دو بڑے جھوٹے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب! ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔"
مرسلہ: ناصر ادریس، جڑانوالہ

صاف اور صحت بخش خون ہی
انسان کی اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔

خون میں فاسد مادّوں کی پیدائش سے پھوڑے پھنسیاں،
خارش، دانے اور مہاسے وغیرہ جسم پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔
ہمدرد کی صافی خون کو صاف اور صحت مند رکھتی ہے۔

صافی کا باقاعدہ استعمال جِلدی بیماریوں
سے محفوظ رہنے اور خون کی صفائی کا مفید ذریعہ ہے۔

جڑی بوٹیوں سے
تیار شدہ

صافی

سے خون بھی صاف
جِلد بھی صاف

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

آوازِ اخلاق
بدزبانی ذہن کا سرطان ہے

Adarts HSF-1/82

سام پہ کیا گزری

سید اظفر مہدی، سکھر

ایک دل چسپ مہماتی ناول

چھٹا اور آخری ٹکڑا

"ہمت نہ ہارو سائمن! یہاں سے فرار کی کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی۔" سام نے سائمن کا حوصلہ بڑھایا۔ کچھ دیر بعد اُس نے باہر سوتے ہوئے مارش کو آواز دی، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے مارش کو کئی آوازیں دیں، مگر مارش دوسری طرف منھ کیے سوتا رہا۔ اُس کا پستول اس کے پاس پڑا ہوا تھا۔

"جانے کیا بات ہے؟" سام بڑبڑایا۔

"شاید ہماری قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا ہے۔" سائمن نے بے بسی سے کہا۔ سام نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رات کا اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں چھٹا تھا۔ صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ لنگور اور بندروں کا ایک غول چیڑ اور صنوبر کے درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر چھلانگیں لگاتا پھر رہا تھا۔ مگر ایک بندر سب سے الگ تھلگ ایک شاخ پر بیٹھا کوئی جنگلی پھل کھا رہا تھا۔

اچانک اس بندر کی نظر جھونپڑی کے اندر پڑی۔ وہاں دو آدمی رسّیوں سے بندھے سر جھکائے

بیٹھے تھے۔ بندر نے تیزی سے پھل ایک طرف پھینکا اور شاخ سے اُتر کر سیدھا جھونپڑی میں گھس آیا۔ سام اور سائمن نے ایک ساتھ اُس بندر کو دیکھا۔

"ریڈ پرل!" سام نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا،"آخر تم آ ہی گئے۔ ریڈ پرل! ہماری مدد کرو۔ ہماری رسیاں کھول ڈالو۔"

ریڈ پرل اس کی بات سمجھ گیا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے سام کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی کھول ڈالی۔ سام کے ہاتھ آزاد ہو گئے تو اس نے اپنے پاؤں خود کھول لیے۔ اس کے بعد اس نے سائمن کی رسیاں بھی کھول دیں۔ اب وہ دونوں آزاد تھے۔ انھوں نے اپنے جسم کو خوب زور زور سے جھٹکے دیے۔ مسلسل بندھے رہنے سے ان کے جسم شل ہو گئے تھے۔

"تمھارا بہت شکریہ ریڈ پرل! تم نے صحیح وقت پر ہماری مدد کی ہے۔" سام نے ریڈ پرل سے کہا جو اپنی عادت کے مطابق اس کے کندھے پر جا بیٹھا تھا۔ ریڈ پرل بھلا اُس کی بات کا کیا جواب دیتا! البتہ اس نے دانت نکال دیے اور خرخیانے لگا۔ اس طرح وہ بھی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

"سائمن! اس سے ملو، یہ میرا دوست ہے ریڈ پرل۔" سام نے ریڈ پرل کا سائمن سے تعارف کرایا۔ ریڈ پرل نے سائمن سے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سائمن کھِل کھلا کر ہنس پڑا اور بولا:

"سام! تمھارا دوست خوب ہے!"

پھر ایک دَم انھیں باہر سوئے ہوئے مارش کا خیال آگیا۔ وہ سہم کر رہ گئے۔ انھیں تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ باہر مارش موجود ہے۔ اگر وہ اُن کی آوازوں سے جاگ جاتا تو بات بگڑ سکتی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا کہ مارش اب بھی سو رہا ہے۔

"سائمن تم یہیں ٹھیرو۔ میں مارش کا پستول اُٹھا لاتا ہوں۔" سام یہ کہہ کر دبے قدموں باہر نکلا اور پھر اُس کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ مارش کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اس کے منھ سے جھاگ نکلے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا سام؟ تم رُک کیوں گئے؟" سائمن نے جھونپڑی کے اندر سے آہستہ سے سام سے پوچھا تو اس نے سائمن کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ سائمن باہر آیا اور اس نے مارش کو دیکھ کر کہا۔

"اس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔" پھر اس کی نظر اس تھیلے پر گئی مگر اب یہ خالی تھا۔ اچانک سام کو اپنے سر کے عین اوپر تیز سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ موت اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتی نظر آنے لگی۔

درخت کی ایک شاخ سام کے سر پر جھکی ہوئی تھی اور اس شاخ پر وہی سبز رنگ کا سانپ اپنی دوشاخہ زبان نکالے، گردن اکڑائے سام کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ریڈ پرل سام کے کندھے سے اتر کر پہلے ہی ایک جھاڑی میں چھپ چکا تھا۔

ادھر سائمن کی نظر جو سانپ پر پڑی تو وہ اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا۔ پھر ایک دم اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ سائمن نے برق رفتاری سے مارش کا پستول اٹھا لیا۔ ایک فائر ہوا اور سانپ کا پھن کٹ کر دور جا گرا۔ کچھ دیر تک تو سام کو پتا ہی نہ چلا کہ یہ فائر کس نے کیا ہے۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر دیکھا۔ سائمن کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ حیرت سے سانپ کے باقی جسم کو دیکھ رہا تھا جو درخت کی شاخ سے لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔

"شکریہ سائمن!" سام نے سائمن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

سائمن نے مارش کا پستول ایک جھاڑی میں اچھال دیا۔ پھر وہ دونوں جانے کے لیے پلٹے مگر.... ایک چیز نے ان کے قدم روک لیے۔ ان کے سامنے ایک جھاڑی کے اوپر ریڈ پرل کا مردہ جسم پڑا تھا۔ نہ معلوم کب اس کو بھی سانپ نے ڈس لیا تھا۔

"ریڈ پرل" سام کے منھ سے نکلا اور وہ اس کی طرف بڑھا۔ مگر سائمن نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اس کے بدن میں زہر پھیل چکا ہے سام! اس کو مت چھونا۔" سائمن نے کہا، "آؤ اب ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ یہاں ہمارا اب کوئی کام نہیں۔"

سام بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسے ریڈ پرل کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ اس جنگل میں آنے کے بعد ریڈ پرل ہی وہ واحد ہستی تھا جس سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ مگر اب وہ سام سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے سام کو رہائی دلا کر جو احسان کیا تھا اسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

صبح کے دھندلکے میں ایک شخص تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ وہ جم تھا۔ جنگل عبور کر کے وہ

ساحلی چٹانوں کے قریب پہنچ کر رُکا اور ایک چٹان کی اوٹ سے ساحل کی ریت پر سوئے ہوئے دوسرے ڈاکوؤں کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ان میں بلیک ایگل نہیں تھا۔

"بلیک ایگل کہاں گیا؟" جم نے اپنے آپ سے کہا، "اگر اس نے مجھے پکڑ لیا تو...! جو ہو سو ہو، مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" وہ چٹانوں کی اوٹ سے نکلا اور تیزی سے ساحل پر لنگر انداز جہاز کی طرف بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ جم، ورنہ اس پستول کی ایک گولی تمھارا بھیجا نکالنے کے لیے کافی ہوگی۔" بلیک ایگل کی کرخت آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ جم جہاں تھا وہیں رُک گیا۔ بلیک ایگل لپک کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پستول مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"لاؤ تھیلی اِدھر دو!" بلیک ایگل نے جم کو حکم دیا۔

"نہیں، نہیں۔ یہ میں تم کو نہیں دے سکتا۔ یہ مجھے ملی ہے۔" جم نے تھیلی کو اور مضبوطی سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ تھیلی تمھیں نہیں ملی۔ اسے تم نے اُس جھونپڑی میں کافی عرصے سے چھپا رکھا تھا تاکہ جب تمھیں موقع ملے لے کر چلتے بنو۔ مگر میں تم کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" بلیک ایگل نے کہا۔ جم نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اچانک ساحل کی طرف دوڑ لگا دی۔

بلیک ایگل کے پستول نے ایک ایک کر کے دو شعلے اُگلے۔ دھماکوں کی آواز سارے جنگل میں گونج اُٹھی۔ جم کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ تھیلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بلیک ایگل نے وہ تھیلی اُٹھا کر خاموشی سے جیب میں رکھ لی۔

دھماکوں کی آواز سے باقی چاروں ڈاکو بھی اُٹھ گئے۔ اُٹھنے کے بعد انھوں نے جم کی لاش دیکھی۔ انھوں نے بلیک ایگل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے مکّاری سے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا، "بلیک ایگل کو کبھی کوئی شکست نہ دے سکا۔" یہ اُس کا پسندیدہ جملہ تھا۔ "جاؤ، جا کر مارش سے کہہ دو کہ اب ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رُک سکتے۔" بلیک ایگل نے ان چاروں کو حکم دیا۔ وہ حیرت سے بلیک ایگل کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہمارا مقصد پورا ہو چکا ہے بلیک ایگل؟" ان میں سے ایک ڈاکو نے ہمّت کر کے پوچھا۔ بلیک ایگل نے خوف ناک نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا، "ہاں، ہمارا مقصد پورا

ہو چکا ہے۔ جاؤ، تم چاروں جا کر مارش کو خبر کر دو۔" بلیک ایگل نے لفظ چاروں پر زور دے کر کہا۔ چاروں ڈاکوؤں کے لیے یہ بات حیران کُن تھی۔ مارش کو بتانے کے لیے کوئی ایک جا سکتا تھا۔ مگر ان چاروں کو بھیجا جا رہا تھا۔ لیکن ان کی اتنی ہمّت نہ ہوئی کہ بلیک ایگل سے کچھ پوچھتے۔ وہ خاموشی سے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔

اچانک ایک فائر ہوا اور ان میں سے ایک ڈاکو لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ مَر چکا تھا۔ باقی تینوں نے ایک ساتھ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ بلیک ایگل کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھا اور اس کا رُخ ان تینوں کی طرف تھا۔ تینوں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انھیں اپنے سردار سے ایسی اُمید نہ تھی۔ اب ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ بلیک ایگل کو ہیروں کا ہار مل چکا تھا اور وہ اکیلا اس کا مالک بننا چاہتا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں کوئی فیصلہ کر لیا۔ پھر ان کے ہاتھ برق رفتاری سے اپنے پستولوں کی طرف اُٹھے اور اُٹھے ہی رہ گئے۔ ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی ابلیک ایگل نے تینوں کو ختم کر دیا۔ فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ ہر طرف دھوئیں اور بارود کی بُو پھیل گئی۔

بلیک ایگل نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنے مَرے ہوئے ساتھیوں پر ڈالی اور ایک طرف قدم بڑھا دیے۔ ہیروں کے ہار کی تھیلی اس کی جیب میں تھی۔

صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ سے ایک بار پھر سارا جنگل گونج رہا تھا۔ سام اور سائمن جنگلی جھاڑیوں اور پودوں کو روندتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ اچانک دھماکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں۔ وہ ایک دَم چونک گئے۔ سام کے اندازے کے مطابق یہ آوازیں ساحل کی طرف سے آئی تھیں۔ اس نے فوراً اپنا خنجر نکال لیا۔ وہ دونوں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھا رہے تھے۔ پتّا بھی کھڑکتا تو وہ چونک جاتے۔ کچھ دیر بعد وہ گھنے جنگل کو پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ اب انھیں سمندر کی لہروں کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ساحل قریب ہی ہے۔ وہ زیادہ محتاط ہو کر چلنے لگے۔ آخر وہ ساحل کے قریب پہنچ گئے جہاں ان کی نگاہوں کے سامنے ایک خوف ناک منظر تھا۔

ساحل پر پانچ لاشیں آڑی ترچھی خون میں نہائی پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش ساحل

کے نزدیک پڑی ہوئی تھی۔ یہ جم کی لاش تھی۔ سائمن حیرت اور خوف سے لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ سام اس وقت کچھ سوچ رہا تھا۔

"سائمن! ہیروں کا ہار مل چکا ہے۔" تھوڑی دیر بعد سام بولا۔

سائمن ایک دم چونک اُٹھا:

"کیا؟ کیا ہار مل چکا ہے؟ تمھارے پاس ہے؟"

"نہیں، بلیک ایگل کے پاس ہے۔" سام نے جواب دیا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"ان لاشوں کو غور سے دیکھو۔" سام بولا۔ "یہ ڈاکوؤں کی لاشیں ہیں۔ جانتے ہو انھیں کس نے قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔" سائمن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

سام نے کہا، "انھیں صرف ایک شخص نے قتل کیا ہے اور وہ بلیک ایگل ہے۔"

سائمن حیرت سے سام کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"کل جب ہمیں اس جھونپڑی میں قید کیا گیا تھا تو بلیک ایگل ہماری نگرانی کے لیے مارش اور جم کو چھوڑ گیا تھا۔ تم نے دیکھا کہ رات کو جم کس قدر بے چینی سے مارش کی طرف بار بار دیکھ رہا تھا۔ اُسے دراصل مارش کے سونے کا انتظار تھا۔ جیسے ہی مارش کی آنکھ لگی اُس نے اس تھیلے کا منھ کھول دیا جس میں سانپ بند تھا۔ آزاد ہوتے ہی اس سانپ نے مارش کو ڈس لیا۔ جم بھی یہی چاہ رہا تھا۔ تم نے بتایا تھا کہ ایک بار پہلے بھی یہ ڈاکو تمھیں قید کر کے اس جنگل میں لا چکے ہیں مگر اس وقت تمھارے ماموں بھی تمھارے ساتھ تھے۔ تم ان ڈاکوؤں کے جہاز میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے لیکن تمھارے ماموں ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے گھنے جنگل کی طرف نکل گئے۔ ہیروں کا ہار تمھارے ماموں کے پاس تھا۔ یہ بات جم کو معلوم ہو چکی تھی۔ چناں چہ اس نے تمھارے ماموں کو کسی طرح اس جھونپڑی میں پہنچا کر ان کے قبضے سے ہار حاصل کرنے کے بعد ان کے خنجر سے انھیں مار ڈالا۔ جس تھیلی میں ہار تھا وہ اس نے اسی جھونپڑی میں چھپا کر رکھ دی تاکہ موقع ملتے ہی اسے لے اُڑے۔ رات کو جو ہاتھ ہم نے جھونپڑی میں دیکھا تھا وہ جم کا تھا۔ وہ ہار کی تھیلی وہاں سے نکال رہا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ رات کے اندھیرے میں ہار کی تھیلی

لے کر خاموشی سے یہاں سے بحری جہاز پر روانہ ہو جائے۔ بلیک ایگل نے جو اسے فرار ہوتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ ہار اُسے مل چکا ہے۔ بلیک ایگل نے جم کو مار ڈالا۔ وہ دیکھو! جم کی لاش جہاز کے قریب ہی پڑی ہوئی ہے۔ اُس نے جہاز پر فرار ہونا چاہا، مگر اُسے موقع نہ مل سکا۔ اِدھر بلیک ایگل نے جب ہار اپنے قبضے میں کر لیا تو اس کی نیت میں بھی فتور آگیا۔ اس نے اکیلے ہی ہار کا مالک بن جانے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی مار ڈالا۔ تمھاری ماں کا ہیروں کا ہار اب بلیک ایگل کے پاس ہے۔"

سائمن کو سام کی ذہانت کی داد دینی پڑی۔ اس نے ساری بات سمجھ کر کس خوب صورتی سے بیان کی تھی۔

"یقیناً بلیک ایگل یہاں سے جا چکا ہے۔ غالباً وہ جہاز پر ہوگا۔ آؤ جہاز پر چلیں۔" سام نے کہا۔ پھر وہ دونوں جہاز کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاز کے قریب پہنچ کر انھوں نے احتیاط سے نظر دوڑائی، مگر انھیں وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ سارے جہاز پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جہاز کے عرشے سے ایک موٹی سی رسّی نیچے ساحل کی ریت تک لٹکی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس رسّی کے ذریعے سے جہاز پر چڑھ گئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے جہاز کے سارے کمرے دیکھ ڈالے مگر بلیک ایگل کہیں دکھائی نہ دیا۔

"پتا نہیں بلیک کو زمین کھا گئی یا آسمان کھا گیا۔" سام نے کہا۔

اچانک انھیں جہاز میں نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کی نظر اب تک ان سیڑھیوں پر نہیں پڑی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے اُتر گئے۔ یہاں کچھ اندھیرا سا تھا۔ انھوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے دو تین کیبن بنے ہوئے تھے۔ ایک کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس کیبن کی طرف بڑھے۔ سامنے ہی ایک کرسی پر انھیں بلیک ایگل بیٹھا ہوا نظر آگیا مگر اس کی پیٹھ ان کی طرف تھی۔

سام نے اپنا خنجر مضبوطی سے تھام لیا اور سائمن کو لے کر اس کیبن کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

"ہیروں کا ہار! ہیروں کا یہ ہار اب مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! اب یہ میرا ہے، صرف میرا!" بلیک ایگل اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ پھر وہ کرسی سے اُٹھا اور فلک شگاف قہقہے لگاتے

ہوتے ناچنے لگا۔ "بلیک ایگل کو کبھی کوئی شکشت نہیں دے سکتا۔" وہ ناچتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔ ہار کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی۔

"بلیک ایگل کو کبھی نہ کبھی شکست ہونی تھی۔" سام نے اچانک دروازے کے پیچھے سے نکل کر کہا۔

بلیک ایگل کے قہقہے ایک دم رُک گئے۔ ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ سام نے تاک کر اپنا خنجر اس کی طرف پھینکا۔ خنجر اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس کے منھ سے خوف ناک آواز نکلی اور وہ اپنا سینہ پکڑے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ہار کی تھیلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔

سائمن نے آگے بڑھ کر وہ تھیلی اُٹھائی اور اُسے کھول کر میز پر اُلٹ دیا۔ ہیروں کا ہار میز پر پڑا جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ اُس سے کئی رنگ کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

"ہاں! یہی وہ ہیرے ہیں جنھوں نے میری ماں مجھ سے چھین لی۔ میرے ماموں کو ہمیشہ کی نیند سُلا دیا۔ میرے گھر کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔"

سائمن کی آواز بھرّا گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں اسے اب اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔" یہ کہہ کر وہ جہاز کے اوپری حصّے کی طرف چل پڑا۔ سام بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

عرشے پر پہنچ کر سائمن نے ایک نظر غور سے ہار کو دیکھا اور پھر اُسے سمندر میں اُچھال دیا۔ سورج کی کرنیں ہار پر پڑیں تو ایک لمحے کے لیے فضا میں بجلیاں سی کُوند گئیں۔ پلک جھپکتے میں ہار سمندر کی تہ میں پہنچ چکا تھا۔

سام خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ سائمن کو اس ہار کی وجہ سے کتنی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اس ہار کا سمندر کی تہ میں پہنچ جانا ہی سائمن کے حق میں بہتر تھا۔ پھر سائمن جہاز کے مستول سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سمندر کے اوپر اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے لگا۔

"سائمن!" یہ سام کی آواز تھی۔

سائمن نے کھوئی کھوئی نظروں سے سام کو دیکھا۔ سائمن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"آؤ، اب ہم اس جگہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج دیں۔"
سائمن تھکے تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جہاز کے کنٹرول رؤم میں پہنچ کر سام کچھ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اُسے ایک جگہ سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ مل گیا۔ سام کو اسی کی تلاش تھی۔ یہ ایک نقشہ تھا۔ سام نے نقشہ میز پر پھیلا دیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی بعد اس نے سَر ہلایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ جہاز کے لنگر اُٹھا دیے گئے اور وہ آہستہ آہستہ ساحل سے دُور ہونے لگا۔

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ جہاز کے بادبان زور زور سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ سام جہاز کے عرشے پر کھڑا دُور ہوتے ہوئے اس ساحلی جنگل کو دیکھ رہا تھا جہاں اس نے کافی عرصے جنگلی جانوروں کے درمیان جنگلی پھل کھاتے گزارا تھا۔ اُسے اپنا غار یاد آیا جسے وہ بطور گھر استعمال کرتا تھا۔ اس کی کشتی اب بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ اسے ریڈ پرل یاد آیا جو مرنے سے پہلے اس پر ایک احسان کر گیا تھا۔ ریڈ پرل کو یاد کر کے سائمن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"کیا سوچنے لگے؟" سائمن نے پیچھے سے آکر کہا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ ریڈ پرل نے میرا کتنا ساتھ دیا...."
"مگر اب تمھارا ساتھ میں دوں گا۔" سائمن نے سام کی بات کاٹ کر کہا۔ سام نے مسکرا کر سائمن کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر نیلے آسمان پر اُڑتے ہوئے ان پرندوں کو دیکھنے لگا جو ہر فکر سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ (ختم شد)

ہم چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اخبار نونہال کی خبریں معتبر اور مستند ہوں تاکہ ہر ایک یہ کہہ سکے کہ اخبارِ نونہال میں یہ خبر یا معلومات آئی ہے تو ضرور صحیح ہو گی، لیکن بعض نونہال خبر کے ساتھ یا تو تراشہ نہیں بھیجتے یا تراشے پر اخبار کا نام و تاریخ لکھنی بھول جاتے ہیں۔ جس اخبار سے آپ تراشہ کاٹیں اُس کا نام، شہر کا نام اور اخبار کی تاریخ ضرور تراشے پر یا تراشے کو کاغذ پر چپکا کر نیچے لکھ دیا کیجیے۔ بعض نونہالوں کی بھیجی ہوئی خبریں اچھی ہونے کے باوجود حوالہ نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہوتیں۔ اگر کسی کتاب سے آپ نے معلومات لی ہے تو کتاب کے نام کے علاوہ صفحے کا نمبر بھی لکھ دیا کیجیے۔
مدیر اعلا

آوازِ اخلاق

تمام مسلمان باہم بھائی ہیں۔
تمام انسان اللہ کی مخلوقِ اشرف ہیں۔
اخوّت اور ان کا حسنِ اخلاق ان کا طرزِ حیات ہے۔

عفوو درگزر ان کا اصولِ زندگی ہے۔
ایثار شانِ انسان ہے۔ یہی سچائی ہے اور یہی اچھائی ہے۔

تو پھر آیئے! پاکستان میں اچھے اور سچے انسان بن کر رہیں۔

عفوو درگزر اخلاقِ زندگی ہے

ملک و ملّت کا ھمدرد، صانع رُوح افزا مشروبِ مشرق

Adarts-6/89

نونہال ادیب

حمد

پسند: انیس فاطمہ جعفری، لاڑکانہ

خدایا اول و آخر بھی تُو ہے
خدایا باطن و ظاہر بھی تُو ہے
وہ اول تُو کہ آخر سے ہے آخر
وہ آخر تُو کہ ہے اوّل سے فاخر
نہیں اوّل کو آخر سے جُدائی
ورائے عقل ہے تیری خُدائی
زمین و آسماں کا نُور ہے تُو
مگر خود ناظر و منظور ہے تُو
مسلّم ہے تجھی کو حکم رانی
کہ تیری سلطنت ہے جاودانی

نعت

پسند: محمد سلیم، رد ہڑی

شاعر: خالد جمیل

تری بات بات لکھی گئی ترے فیصلے بھی رقم ہوئے
ہوئے معجزے بھی زمین پر ترے عرش پر بھی قدم ہوئے
تری ہر ادا ہوئی دل نشیں ترے ہر قدم پہ جُھکی نظر
ہمیں یاد ہیں وہ تمام تر تری ذات پر جو ستم ہوئے
تھے جو لاکھوں عیبوں میں مُبتلا ترے فیض سے ہوئے پارسا
میں سناؤں کتنی عنایتیں میں گناؤں کتنے کرم ہوئے
شب و روز تیری ہدایتیں، تری رحمتیں تری برکتیں
یہ انھی کا فیض تھا بر ملا کئی سر کشیدہ جو خم ہوئے
یہ عبادتیں یہ ریاضتیں ترا حکم تھا مِرا فرض تھیں
وہی سجدے روحِ سجود میں مرے آنسوؤں سے جو نم ہوئے
جنھیں ترے در سے خلوص تھا انھیں تُو نے پاس بُلا لیا
انھیں مل گئیں تری چاہتیں وہی سرخروئے حرم ہوئے

پاکستان ہمارا

پسند: محمد توقیر، کراچی

ہے اب اس پہ دھیان ہمارا
مقصد ہے ہر آن ہمارا
بلکہ ہے ایمان ہمارا
ملک چڑھے پروان ہمارا

پیارا پاکستان ہمارا

اس پر اپنا خون بہایا
لاکھوں جانیں دے کر پایا
ہو اب تیرا فضل خدایا
دن دُونا ہو رات سوایا
ملک یہ عالی شان ہمارا
شان ہو اس کی سب سے اعلا
علم کا ہو ہر دل پہ سکّہ
صنعت میں سب مانیں لوہا
اور سب سے اونچا ہو جھنڈا
پورا ہو ارمان ہمارا

محنت

پسند: فرزانہ ناز میمن، نواب شاہ

بچّو! محنت کرنا سیکھو
آگے آگے بڑھنا سیکھو
محنت میں ہے عظمت پنہاں
محنت میں ہے راحت پنہاں
محنت سب کے کام آتی ہے
محنت شان بڑھاتی ہے
بن محنت ہر کام ہے مشکل
پیدا ہونا نام ہے مشکل
محنت کی ہے بات نرالی
اس سے صحرا میں ہریالی
جن لوگوں نے محنت کی ہے
جگ میں ان کی دھوم مچی ہے
محنت سے ہر کام کرو تم
قوم کا روشن نام کرو تم

پیاری امّاں

پسند: محمد اسلم، نتھے والا

پیاری اماں اچھی اماں تُو ہی گھر کی شان ہے
تیرے دم سے دنیا جنت تازہ دین ایمان ہے
تُو بلبل کا دلکش نغمہ تو کوئل کی راگنی
صبح کی ٹھنڈی پاک ہوا ہے چندا کی ہے چاندنی
تُو کلیوں کی بھینی خوشبو تُو پھولوں کی جان ہے
پیاری اماں اچھی اماں تُو ہی گھر کی شان ہے
تُو کرتی ہے سدا ہماری ایسے ہی رکھوالی
ننھے پودوں کی رکھوالی کرتا ہے جیسے مالی
ہم کتنے خوش قسمت ہیں ماں تجھ پہ ہم کو مان ہے
پیاری اماں اچھی اماں تُو ہی گھر کی شان ہے
تیری آنکھیں ہم کو دیکھیں جیسے جھل مل تارے
تیری دعاؤں سے کٹ جائیں دکھ اور درد ہمارے
تیرا رُتبہ اعلا افضل تیری اونچی شان ہے
پیاری اماں اچھی اماں تُو ہی گھر کی شان ہے

پیغامِ محبت

مرسلہ: ماریہ فرمان، کراچی

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
جگر

آزادی

پسند: غزالہ شاہین، فیصل آباد

اے پاک سرزمین کے خوددار بھائی بہنو
اپنی زبان بولو اپنا لباس پہنو
اللہ نے تمھیں بھی میٹھی زبان دی ہے
اور تم پہ رحمتوں کی چادر بھی تان دی ہے
کردار سے عمل سے تم کون ہو بتا دو
یہ گلستاں تمھارے یہ وادیاں تمھاری
تم کو پکارتی ہیں آزادیاں تمھاری
آزاد قوم بن کر اس ملک کو دکھا دو
اپنے اُصول رکھنا اپنی ہی رائے رکھنا
تم عظمتِ وطن کا پرچم اُٹھائے رکھنا
یہ ہے زمیں تمھاری اس کو سنبھالے رکھنا

اخلاق

پسند: وقار احمد، کوٹری

اپنے اخلاق کو بلند کرو
خود کو دنیا میں ارجمند کرو
بولنے کو اگر زباں کھولو
پہلے ایک ایک بات کو تولو
بل جبیں پر کبھی نہ آنے پائے
خوش دلی ہاتھ سے نہ جانے پائے
کوئی تم سے جو راستہ پوچھے
ہچکچاؤ نہ رہنمائی سے
کوئی چاہے مدد جو مشکل میں
پیار سے اُس کے گھر کرو دل میں
دوسروں کے جو کام آتے ہیں
وہ زمانے میں نام پاتے ہیں
دوسروں کے جو کام آتے ہیں
وہ زمانے میں نام پاتے ہیں
دوسروں کی مدد کرو گے اگر
ہوگا اللہ مہرباں تم پر
کام بگڑے ہوئے بنائے گا
مشکلوں سے تمھیں بچائے گا
مال و زر پر کبھی نہ اترانا
شکر اللہ کا بجا لانا
آدمی جب غرور کرتا ہے
خود کو رحمت سے دُور کرتا ہے
ماہ و انجم، نہ کوہسار میں ہے
وہ بلندی جو انکسار میں ہے

غصّہ

پسند: مصباح الدین خان، کراچی

غصّہ جو بھی کرے انسان
بن جاتا ہے وہ حیوان
غصّہ ہے ایک ایسی لعنت
جس سے پھیلے دائم نفرت

غصّے میں کب ہو پہچان
چاہے غیر ہو یا مہمان
غصّے سے بھاگے ہمدردی
غصّہ تو ہے آگ کی بھٹی
غصّہ پیدا کرے ہے دُشمن
غصّے میں جل جاتے تن مَن
غصّے کو پی جانا سیکھو
علم کی راہ پر آنا سیکھو

انجم کی جب موڑی کلائی
امّی نے کی خوب پٹائی
انجم آیا لے کر بانس
بھاگی پھر ابّو کے پاس
کپڑے اس کے میلے کچیلے
کھاتی ہے وہ کچّے کیلے
دانت ہیں اس کے یا ہیں پربت
اس لڑکی کا نام ہے ثروت

شریر لڑکی

پسند: محمد سہیل حسن، ڈھاکہ

ایک ہے لڑکی دُبلی پتلی
ہلکی پُھلکی جیسے تتلی
صورت اُس کی پیاری پیاری
پر اُس کو ہے اِک بیماری
دن بھر وہ کرتی ہے شرارت
شب کو اسے ہوتی ہے حرارت
جب وہ دکھلائے اپنی شان
بھائی کے اپنے مروڑے کان
صبح کو مُرغا جب دے بانگ
چوزے کی وہ توڑے ٹانگ
جب بیٹھے وہ کرنے پڑھائی
صورت پر بج جائیں ڈھائی

پاک سرزمین

پسند: آسیہ عبدالغفور

یہ پاک سرزمین ہے پیارا وطن ہمارا
ہم پھول اس چمن کے یہ ہے چمن ہمارا
بخشی ہے اس کو حق نے دنیا میں خاص عزت
عظمت ملی ہے اس کو اسلام کی یہ دولت
یہ کہہ رہا ہے اس کے جھنڈے کا چاند تارا
مُسلم ہیں دینِ برحق اسلام ہے ہمارا
محنت سے اپنی اس کی عزت بڑھائیں گے ہم
ہمّت سے اس کا پرچم اُونچا اُڑائیں گے ہم
اِک بار پھر اُٹھیں گے قرآں کا نور لے کر
اِس پاک روشنی سے چمکے گا پھر ہر اِک گھر
پھر نیکیوں کے چشمے پھوٹیں گے اس زمیں سے
عزت ملے گی نسلِ آدم کو پھر یہیں سے

ایک عہد

عفت غفور، کراچی

سُنسان میدان ہے۔ وہاں اس کا کوئی مدد گار نہیں۔ کوئی اس آدمی، اُس کم زور بوڑھے کی سننے والا نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں جو اس کی مشکل کا ساتھی بن سکے۔ صرف ایک کالا حبشی ہے جس کے ہاتھ میں کوڑا ہے۔ وہ حبشی کبھی کہتا ہے، "سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔" کبھی کہتا ہے، "جُھک جاؤ اس طرح کہ اگر پیٹھ پر پانی کا پیالہ رکھ دیا جائے تو پانی نہ چھلکے۔" کبھی کہتا ہے، "زمین پر اُلٹے لیٹ جاؤ اور اپنا ماتھا زمین پر رکھ دو۔"

یہ وہ آدمی ہے جس نے دنیا میں کبھی زمین پر لیٹنا تو کیا زمین کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ جس نے ساری زندگی کسی کی بات نہیں سُنی تھی۔ آج حبشی کے ذرا ذرا سے اشارے پر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ ظاہر ہے نہ کرتا تو کوڑے کھانے پڑتے۔ آج وہ سوچ رہا تھا، "کاش! میں شروع سے یہ عادت ڈال لیتا۔ مجھے سیدھے کھڑے ہونے، جُھکنے اور ماتھا ٹیکنے کی عادت ہوتی تو آج مجھے اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔"

اب وہ تھک چُکا تھا۔ اس نے بار بار کہا، "مجھ پر رحم کرو! مجھے معاف کر دو۔" مگر جتنی وہ معافی مانگتا اتنا ہی کوڑا تیزی سے چلتا۔

اچانک ایک کم زور سی عورت وہاں آئی۔ اس نے درخواست کی کہ اس کو معاف کر دیا جائے اس کی جگہ میں سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر، نہیں۔ سزا ہمیشہ سزا واروں کو ہی ملنی چاہیے۔ جیسے ہی کوڑا اُوپر اٹھا اس عورت نے بڑھ کر پکڑ لیا۔ دونوں میں کھینچا تانی ہوئی مگر ظاہر ہے کہاں حبشی اور کہاں کم زور عورت! جیت حبشی کی ہوئی اور عورت وہاں سے غائب ہو گئی۔ بوڑھے نے کہا، "یہ بتا دو کہ یہ عورت کون تھی جو میری ہمدرد بن کر آئی تھی؟" حبشی نے کہا، "یہ عورت تیری عبادت تھی۔ مگر چوں کہ تُو نے سوائے عیدین کے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، اس لیے یہ بے چاری اتنی کم زور ہے۔ تو جتنی زیادہ اللہ کی عبادت کرتا، یہ اتنی ہی مضبوط اور طاقت ور ہوتی مگر افسوس کہ تُو نے پروا نہ کی۔ کاش! تُو نے شروع سے نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہوتی تو آج تیرا یہ حشر نہ ہوتا۔"

اس کے ساتھ ہی حبشی نے اس بوڑھے کے ایک کوڑا رسید کیا۔ بوڑھے کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ وہ سوچنے لگا، "ہمارا پروردگار کتنا رحم دل ہے! میں نے ساری عمر نماز نہیں پڑھی مگر اس نے دنیا میں مجھے کچھ نہیں کہا۔ ہاں، البتہ اگر دنیا میں کوئی ایسا پرندہ ہوتا جو ہر وقت کوڑا لیے میرے سر پر سوار رہتا تو شاید میں ضرور نماز پڑھتا۔" مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس طرح تو میں غلام بن جاتا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں۔ سو اس نے مجھے آزاد رکھا مگر میں ناشکرا نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ایک کوڑا اور پڑا اور اس

زخمی بچّہ

یہ عین ہمدردی اور انسانیت ہے کہ زخمی بچّے کو فوراً مدد فراہم کی جائے۔
اسے ہسپتال لے جا کر اس کی مرہم پٹّی کرائی جائے۔

مگر کیا...

یہ نونہالانِ وطن زخمی نہیں ہیں جو تعلیم سے محروم ہیں ؟
اور غلیظ اور گندی گلیوں محلّوں کی غلاظتوں میں کھیل اور پل رہے ہیں ؟

یہ بھی زخمی ہیں !

ان کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیم گاہیں قائم کرنا عین انسانیت ہے
اس میدان میں جو پیش رفت کریں وہ ہمدرد ہیں۔

کیا آپ ہمدرد ہیں ؟ ہمدرد ہونا عین عظمت ہے۔

ملک و ملّت کا ہمدرد ، صانع **رُوح افزا** مشروبِ مشرق

Adarts 2/87

کی چیخ نکل گئی۔
آنکھیں کھولیں تو منظر کچھ اور تھا۔ پیار بھری نظروں سے دیکھنے والی بہن، رحمت کا سایہ ماں، فرشتہ صفت باپ سبھی موجود تھے اور پوچھ رہے تھے کیا تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ تب اس نے سارا خواب سنایا۔ اس کی ماں نے کہا، "بیٹا! اللہ تعالیٰ بندے کو بار بار نیکی کرنے کا موقع دیتا ہے، مگر بہت کم لوگ اس کو پاتے ہیں۔"

لڑکے نے کہا، "ماں! میں ان شاء اللہ اس موقع کو ضائع نہیں کروں گا۔ آج سے پانچوں وقت کی نماز پڑھوں گا۔ نہ صرف خود پڑھوں گا، بلکہ دوسروں کو بھی پڑھواؤں گا۔"

پاکستان ہمارا گھر

قدسیہ یاسمین، ککّر

"گھر" یہ تین لفظوں پر مشتمل لفظ اپنے اندر بہت سی خوب صورتیاں اور رعنائیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ انسان جب گھر کا ذکر کرتا ہے تو اس کے دل میں، اس کے الفاظ میں اس کے لیے بڑی محبت ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھر کی بُرائی کسی سے نہیں سُن سکتا۔ گھر جہاں انسان کے اپنے ہوتے ہیں، جہاں اسے آزادی ہے ہر کام کرنے کی۔

پاکستان ہمارا گھر ہی تو ہے۔ ایک ایسا گھر کہ ہم جس کے مکین ہیں۔ ایک ایسا پیارا گلستان ہم جس کے رکھوالے ہیں۔

پاکستان ہمارا پیارا اور خوب صورت گھر، ہماری سوہنی دھرتی جس کی گود میں ہم کھیلتے ہیں۔ وہ گھر جہاں ہمارے اپنے پیارے رہتے ہیں۔ جس کی گلیاں جس کے گوشے، جس کی رونقیں ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ یہ پاک زمین، یہ پاک وطن جس سے ہماری پہچان ہے، جس سے ہماری شان ہے، جس سے ہماری عزّت ہے، اس کے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں۔ پاکستان کتنا پیارا اور میٹھا لفظ ہے۔ جب ہم اس لفظ کو ادا کرتے ہیں تو بے ساختہ دونوں ہونٹ ایک دوسرے کو چوم لیتے ہیں۔ پاکستان ہماری جان ہے۔ ہماری آن ہے۔ اسے ہمارے بزرگوں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ اب اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے، ہم اس کی حفاظت نہیں کریں گے۔ تو کون کرے گا! اس پاک دھرتی کی، اس سوہنے وطن کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ دھرتی ماں اپنے بیٹوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ اس دھرتی کے ہر باسی کو مطمئن دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس گھر کو پُرسکون دیکھنا چاہتی ہے، وہ امن چاہتی ہے۔ وہ اپنے بچّوں کے چہروں پر نفرت اور غصّے کے بجائے ایک دوسرے کے لیے پیار دیکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ماں اپنے بچّوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہے۔

آئیے ساتھیو! عہد کریں کہ ہم امن کے پیامبر بن کر دکھا دیں گے۔ ہم ان شاء اللہ اپنے پاک وطن

کو امن کا گہوارا بنا دیں گے۔

انعام

اسما شفیق، کراچی

آج اسکول میں سالانہ تقسیم انعام کی تقریب تھی۔ لاتعداد لڑکوں اور لڑکیوں نے تقاریر، ڈراموں، ٹیبلو میں شرکت کی تھی۔ نائمہ نے ہمیشہ کی طرح آج بھی تقریر میں ہی حصہ لیا تھا۔ تقریب کے آخر میں تمام بچوں میں انعام تقسیم ہوتے۔ نائمہ کو آج بھی ہمیشہ کی طرح انعام ملا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ تقاریب میں شرکت تو وہ ہمیشہ کرتی مگر آج پہلی دفعہ اسے پہلا انعام ملا اس لیے وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ اگلے روز جب اسکول کھلا تو نائمہ کی تمام دوستیں اس کی گرویدہ ہو گئیں اور اسے نرغے میں لے لیا۔ لیکن فوزیہ ہمیشہ کی طرح اپنی سیٹ پر ہی بیٹھی رہی۔ وہ پتا نہیں کیوں شروع سے ہی نائمہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ نزہت جو کہ فوزیہ کی سب سے قریب ترین دوست تھی وہ بھی نائمہ کو بے حد پسند کرتی۔ وہ اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی، کیوں کہ نائمہ ایک ذہین، باصلاحیت اور اچھے کردار والی لڑکی تھی۔

اسکول میں انگریزی کی کلاس تھی۔ ٹیچر ابھی تک کلاس میں نہیں آئی تھیں۔ اس لیے تمام لڑکیاں نائمہ کے گرد گھسی ہوئی تھیں اور اسے پہلا انعام ملنے پر مبارک باد دے رہی تھی۔ جیسے ہی ٹیچر کلاس میں آئیں تمام لڑکیاں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ ٹیچر نے بھی آتے ہی نائمہ کو مبارک باد دی اور اس کو انعام میں ملی ہوئی خوب صورت کتاب بھی دیکھی۔ تمام دوستوں کو بھی نائمہ کو انعام میں ملی ہوئی کتاب بہت پسند آئی۔ فوزیہ ابھی تک اپنی ہی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے تو نائمہ کو مبارک باد بھی دینا گوارا نہیں کیا۔ انگریزی کا پیریڈ ختم ہو گیا اور پھر ہاف ٹائم ہو گیا۔ فوزیہ اب بھی اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ آخر نائمہ اس کے پاس خود ہی آئی اور کتاب دکھائی۔ فوزیہ نے کتاب کو سرسری نظر سے دیکھ لیا مگر سوچنے لگی کہ ایسی تو ہزاروں کتابیں میں خرید سکتی ہوں، میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ اپریل سے دسمبر آ گیا۔ ششماہی امتحان بھی گزر گئے۔ اس کے بعد ۲۵ دسمبر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تمام لڑکیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دفعہ نائمہ کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے اس تقریب میں شرکت نہیں کر سکی، جب کہ اس کی کلاس کی دوسری لڑکیوں نے تقریر اور دوسرے پروگراموں میں حصہ لیا تھا۔ اس دفعہ فوزیہ کا بھی جی چاہا کہ وہ بھی تقریر میں حصہ لے گی۔ چناں چہ وہ اپنی تقریر لے کر ٹیچر کو سنانے چلی گئی۔ اس کی تقریر سب کو ہی بے حد پسند آئی۔ اس کی پہلی مرتبہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ اس وقت بہت زیادہ

خوش ہوئی۔ آخر ۲۵ دسمبر بھی آ ہی گیا۔ پورا اسکول شامیانوں، کرسیوں اور روشنی سے چمک رہا تھا۔ وقت پر تقریب شروع ہوئی۔ بے شمار پروگرام پیش کیے گئے۔ اس کے بعد فوزیہ کی باری آئی۔ چوں کہ اس کی حوصلہ افزائی پہلے ہی ہو چکی تھی اس لیے وہ بہت پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی باری پر تقریر کی۔ اس کی تقریر اتنی با اثر تھی کہ پورے اسکول میں دھوم مچ گئی۔

اس کی تقریر کا انداز نہایت ہی سنسنی خیز تھا۔ آج نائمہ کی جگہ فوزیہ کو پہلا انعام ملا۔ فوزیہ اسٹیج پر گئی جیسے ہی پرنسپل نے فوزیہ کو پہلا انعام دیا۔ اس کی نظر نائمہ پر پڑی جو کہ خوشی سے اُچھل اُچھل کر اسے ہاتھ دکھا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا پہلا انعام ملنے پر کتنی خوشی ہوتی ہے۔

فوزیہ جلدی جلدی اسٹیج سے اُتر کر سیدھی نائمہ کے پاس آئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے نائمہ اس کی سب سے مخلص دوست ہو۔

فوزیہ نے ایک دفعہ انعام میں ملی ہوئی کتاب پر سرسری نظر ڈالی تو اسے بے اختیار خیال آیا کہ میں ایسی ہزاروں کتابیں ضرور خرید سکتی ہوں مگر اس کی کتاب کی بات ہی کچھ اور ہے۔

سوال

خالد محمود مغل، جھنگ صدر

اجمل بہت امیر باپ کا لاڈلا بیٹا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت مغرور ہو گیا تھا۔ اجمل کے والد ایک بہت بڑی مل کے مالک تھے۔ انھوں نے اجمل کے لیے ایک کار خریدی تھی جس میں وہ اسکول آتا جاتا تھا۔ اجمل کی گاڑی چلانے کے لیے انھوں نے ڈرائیور بھی رکھا تھا۔ ڈرائیور روز اجمل کو اس کی گاڑی میں اسکول لے جاتا اور چھٹی ہونے پر واپس لاتا۔ اس ڈرائیور کا نام اسد تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اجمل کے تمام گھر والے اُسے اسد بابا کہتے تھے۔ روز صبح اسد بابا کا بیٹا اپنے بابا سے کہتا: "میں اسکول جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، تم اسکول جاؤ۔ مجھے بھی چھوٹے صاحب کو اسکول چھوڑنے جانا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی صاف کرنے لگتا۔

"اسد بابا! گاڑی کی صفائی کر لی۔" وہ گھر کے دروازے سے باہر آتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھتا۔

"جی چھوٹے صاحب!" اسد بابا جواب دیتے اور پھر وہ دونوں اسکول کو روانہ ہو جاتے۔ یہ تھا ان کا روز کا معمول۔

ایک دن حسبِ معمول اسد بابا اجمل کے انتظار میں گاڑی لیے اسکول کے دروازے کے سامنے موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بجی۔ اجمل نے اپنی کتابیں اُٹھا کر بستے میں رکھیں اور اسکول کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ آج اُسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ بے اختیار اس کی نظر گھڑی پر گئی مگر وہ یہ

دیکھ کر چونک گیا کہ اُس کے ہاتھ پر گھڑی موجود نہیں تھی۔

اجمل نے سوچا کہ شاید میں نے گھڑی اپنی گاڑی میں چھوڑ دی ہوگی۔

اجمل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا، "اسد بابا! میں اپنی گھڑی گاڑی میں بھول گیا تھا۔ کیا وہ گھڑی تمھیں ملی؟"

"نہیں چھوٹے صاحب! مجھے تو کوئی گھڑی نہیں ملی۔" اسد بابا نے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ضرور تم نے میری گھڑی چُرائی ہے۔ میں تمھاری شکایت ابّو سے کروں گا۔"

اجمل خواہ مخواہ بوڑھے ڈرائیور پر رعب جمانے لگا۔ لاڈ پیار میں بگڑا ہوا تو تھا ہی۔ اُسے چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں تھی۔ گھر جا کر اجمل نے اپنے ابّو سے کہا:

"ابّو! میں صبح اپنی گھڑی گاڑی میں بھول گیا تھا۔ اسد بابا نے وہ گھڑی اُٹھا لی اور اب کہہ رہے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"کیوں اسد! یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔" اجمل کے ابّو نے کہا۔

"نہیں صاحب! یہ سب غلط ہے۔ میں نے گھڑی نہیں اُٹھائی۔" اجمل کے ابّو ویسے بھی غصّے کے بہت تیز تھے۔ اس وقت زور سے چیخے تو اُن کی آواز سُن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے۔

"تم مجھ سے زبان چلا رہے ہو۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" یہ کہہ کر اجمل کے ابّو نے اسد کو زور سے دھکا دیا۔ اسد بابا زمین پر گر گئے۔ اُن کے سر سے خون بہنے لگا۔

"رُک جائیے انکل! یہ لیجیے اپنی گھڑی۔" اچانک اسد بابا کے بیٹے افضل کی آواز سُنائی دی۔ "یہ گھڑی صبح اجمل صاحب باتھ روم میں چھوڑ گئے تھے۔ آج جب میں صفائی کرنے باتھ روم میں گیا تو یہ گھڑی مجھے وہاں رکھی ہوئی نظر آئی۔" یہ کہہ کر اس نے گھڑی اُن کی طرف بڑھا دی اور بولا:

"آپ نے اپنی گھڑی تو لے لی ہے۔ اب میرے بابا کے سر سے بہنے والا خون بھی مجھے واپس کر دیجیے۔"

اجمل کے ابّو سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اُن کے پاس اجمل کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

پرل ایس بک

رعنا فاروقی، کراچی

مشہور مصنفہ پرل ایس بک ۲۶ جون ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد کا نام پسلم سائیڈن اور والدہ کا نام کیرولین تھا۔ آپ نے چینی زبان میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۴ء میں رنڈولف میکون رومن کالج سے بی اے کیا۔ آپ نے پہلی شادی ۱۹۱۷ء میں جان ایل بک

نامی آدمی سے کی۔ ۱۹۳۱ء کو چین میں آپ کا مشہور ناول گڈ ارتھ منظرِ عام پر آیا۔ یہ ناول دو حصّوں پر مشتمل ہے اور اس کے دوسرے حصّے کا نام ہاؤس اوف ارتھ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اس ناول پر آپ کو امریکی ادبی انعام ملا۔

۱۹۳۴ء میں آپ کے پہلے شوہر جان ایل بک نے آپ کو طلاق دی اور پھر ایک سال ۱۹۳۵ء میں آپ نے رچرڈ و بیش سے دوسری شادی کرلی۔ آپ نے چودہ لاوارث بچّوں کو گود لیا۔ آپ نے لاوارث بچّوں کے لیے ایک ادارہ بھی کھولا جس کا نام "پرل ایس بک فاؤنڈیشن" ہے۔ چھے مارچ ۱۹۷۳ء کو امریکا میں آپ کا انتقال ہوا۔

مائی خیری

غلام حسین میمن، حیدرآباد

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ کے صوبۂ سندھ میں کئی ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے خیر اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

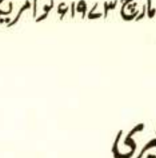

کبھی حیدرآباد کے معروف علاقے فقیر کا پڑ آنا ہو تو وہاں ایک مسجد "مائی خیری مسجد" دوٗر سے نظر آئے گی۔ اسے ایک نیک دل خاتون نے تعمیر کروایا تھا۔ اُن کا اصل نام خیر النساء تھا جو میر صوبیدار خاں شہید کی ملکہ تھیں۔ خیر اور بھلائی کے کاموں کی وجہ سے انھیں "مائی خیری" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

ان کا بچپن لائق استادوں سے تعلیم اور تربیت حاصل کرتے میں گزرا۔ انھیں بچپن ہی سے نیک کام کرنے اور عظیم لوگوں کی سوانح عمری پڑھنے کا شوق تھا۔ دینی علم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ رحم دل اور نیک تھیں۔ غریبوں اور مسکینوں کی باقاعدگی سے مالی امداد کرتی تھیں، کیوں کہ یہ قول ان کے "اللہ تعالیٰ نے ہماری دولت میں غریبوں اور مسکینوں کا بھی حصّہ مقرر کیا ہے جو انھیں ملنا چاہیے۔" انھیں لوگوں کی مدد کرنے سے روحانی تسکین ہوتی تھی۔ انھوں نے کتنے ہی معذوروں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے ماہوار وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔

وہ ایک بڑے علاقے کے جاگیردار کی ملکہ ہوتے ہوئے بھی نہایت سادگی پسند تھیں۔ انھیں مدرسے اور مسجدیں بنوانے کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے ہر گاؤں میں الگ الگ مسجدیں تعمیر کروائیں۔ "مائی خیری مسجد" کے ساتھ مدرسہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ جو بھی طالب علم اس مدرسے میں پڑھنے آتا اس کا کھانا پینا، رہنے کی جگہ اور کپڑے سب کا انتظام مائی خیری کرتی تھیں۔

ان کے کن کن خیر کے کاموں کو یاد کیا جائے۔ وہ تو انسانیت کی خدمت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

یکم رمضان المبارک ۱۲۴۲ ھجری کو اس عظیم خاتون کی وفات ہوئی۔ ان کے جنازے میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ انھیں ہالا کے قریب خدا آباد میں دفنایا گیا جہاں اُن کے مزار پر آج بھی عقیدت مند آتے ہیں۔

(سندھی سے ترجمہ)

ایکسی ڈنٹ

فرحانہ رقیب، سعودی عربیہ

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ اس وقت میری عمر ساڑھے تین سال تھی۔ ہم لوگ چھٹیوں میں پاکستان گئے۔ ایک دن ہماری ایک جگہ دعوت تھی۔ سب لوگ تو تیار ہو گئے تھے، صرف امّی ابھی تیار ہو رہی تھیں کہ ہمارے چچا زاد بھائی آگئے اور کہنے لگے کہ جو تیار ہے وہ میرے ساتھ چلے۔ ابّو اور میرے تینوں بھائی تو چلے گئے، لیکن میں نے کہا کہ میں امّی کے ساتھ جاؤں گی۔ تھوڑی دیر میں امّی بھی تیار ہو گئیں۔

دعوت والا گھر قریب ہی تھا، لیکن بیچ میں ایک بڑی سڑک تھی۔ جب ہم لوگ سڑک کے قریب پہنچے تو امّی سڑک پار کرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ میں نے سوچا کہ گاڑیوں کے بیچ میں سے گزرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔ چناں چہ میں نے جھٹ امّی سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگی۔ امّی جتنی دیر میں مجھے پکارتیں میں سڑک کے بیچ میں پہنچ چکی تھی۔ ادھر سے ایک گاڑی تیزی سے آرہی تھی، میں اُس سے ٹکرائی اور دوسری طرف گر پڑی۔

امّی نے جلدی سے مجھے اُٹھایا اور جلدی جلدی دعوت والے گھر پہنچیں۔ وہاں سے ابّو مجھے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جاکر پتا چلا کہ پاؤں کی ہڈی اپنی جگہ سے ہل گئی گئی۔ میرے پاؤں پر دو مہینے تک پلاستر چڑھا رہا۔ اس واقعے کو چھے سات سال گزر چکے ہیں لیکن اب بھی جب کبھی اس کا خیال آتا ہے تو میں کانپ جاتی ہوں۔

سچ کی برکت

سعدیہ محمود، بہاول پور

کسی ملک پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے ظلم سے لوگ تنگ آچکے تھے۔ ایک دن اُس نے ایک بزرگ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ بزرگ جان بچانے کے لیے اپنے ایک مہربان اور دوست کے گھر میں چھپ گئے اور نماز پڑھنے لگے۔

ظالم بادشاہ کو جب یہ پتا چلا تو اس کے سپاہیوں نے ان بزرگ کے نیک دوست کا گھر گھیر لیا۔ سپاہیوں نے اس شخص سے پوچھا کہ وہ بزرگ کہاں ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ وہ اندر کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

سپاہی فوراً اندر آگئے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ سپاہیوں نے باہر آکر اس شخص سے پھر پوچھا۔ اس نے اس بار بھی یہی کہا کہ وہ اندر نماز پڑھ رہے ہیں۔

سپاہی پھر اندر گئے مگر اس بار بھی انھیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔

انھوں نے اس نیک آدمی سے غصّے سے کہا کہ تم اتنے نیک اور پرہیزگار ہو کر بھی جھوٹ بولتے ہو؟

اس شخص نے کہا، "اللہ نے تمھیں اندھا کر دیا ہے تو میں کیا کروں۔"

غرض جب سپاہی چلے گئے تو بزرگ اندر سے باہر نکل آئے۔ انھوں نے اپنے دوست سے کہا، "تمھارا سچ اللہ کو اتنا پسند آیا کہ بادشاہ کے سپاہیوں کی آنکھوں پر اس نے پردہ ڈال دیا۔ تمھارے سچ نے میری جان بچائی ہے۔"

واقعی سچ میں بڑی برکت ہے۔

گولڈن فش

شعاع نورین، ٹنڈو محمد خاں

سرسبز باغ کے درمیان ایک خوب صورت تالاب تھا۔ بچّے اس باغ کی سیر کو آتے تو تالاب اور اس کی مچھلیوں سے ضرور لطف اندوز ہوتے۔ اکثر بچّے مچھلیاں پکڑنے کانٹے اور ڈور ضرور لاتے۔

اس تالاب میں سیکڑوں قسم کی مچھلیاں تھیں، لیکن ان میں ان کی ایک شہزادی گولڈن فش بھی تھی۔ جب تک گولڈن فش کو اپنے حُسن کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اس وقت تک اس کا یہ حال رہا کہ وہ ڈھیروں مچھلیوں کے جھرمٹ میں چھپی رہتی تھی۔ اس طرح وہ کسی بچّے کو بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک بار ایک بچّہ تالاب کے کنارے بیٹھا آئینے سے کھیل رہا تھا کہ اچانک آئینہ تالاب میں گر کر اس کی تہ میں چلا گیا۔ سب ہی مچھلیوں کو یہ چیز بڑی اچھی لگی۔ باری باری ہر مچھلی جاتی اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی۔

پھر وہ مچھلیاں دن بھر آپس میں لڑتی جھگڑتیں ایک کہتی کہ میں زیادہ خوب صورت ہوں دوسری کہتی کہ میں زیادہ ہوں۔

ایک دن تمام مچھلیوں نے اپنا مسئلہ گولڈن فش کی عدالت میں پیش کیا۔ گولڈن فش نے کہا، "آئینہ میرے سامنے پیش کیا جائے۔" جب گولڈن فش نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اتنی حسین مچھلی تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ بس پھر کیا تھا اس نے غرور سے اکڑ کر کہا، "تم سب کالی کلوٹی ہو۔ سب سے حسین میں ہوں۔ جاؤ جھگڑا ختم۔"

اُس دن کے بعد سے گولڈن فش مغرور ہو گئی۔ وہ کسی مچھلی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ ایک دن اسکول کے بچّوں کی ایک ٹولی باغ میں سیر کرنے آئی۔ انھوں نے اپنے کانٹے ڈور تالاب میں ڈال دیے۔ بچّو! پانی کی لہروں کے ساتھ جونہی گولڈن فش اوپر آئی بچّوں کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ پھر

کیا تھا۔ تمام بچّوں نے اُسے پکڑنے کی کوشش شروع کردی اور آخر شام کو وہ ایک بچّے کے جال میں آپھنسی۔

اب وہ پچھتانے لگی، "کاش! میں کالی کلوٹی مچھلیوں سے اپنے کو الگ نہ کرتی تو آج یوں دُشمن کے جال میں نہ پھنستی۔"

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو اُسے غرور کی سزا مل چکی تھی۔

کار کی آپ بیتی

ثمینہ محمود، کراچی

اگر آپ لوگ میری کہانی سننا ہی چاہتے ہیں تو میں سُنا دیتی ہوں۔ میں ایک گاڑی ہوں، مگر میرا نام کیا ہے اور میں کب کی پیدائش ہوں یہ نہیں بتا سکتی۔ ویسے بھی "صنفِ نازک" سے عمر نہیں پوچھا کرتے۔ بس یہ سمجھ لیں اب میں بڑھاپے کی طرف محوِ سفر ہوں۔ مگر خیر اب ایسی بھی بوڑھی نہیں ہوں، ہاں ذرا سا رعشہ ہو گیا ہے۔

جب میں بچّی تھی تو اس وقت سڑکوں کی آبادی زیادہ نہیں تھی، بہت کم گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ پھر جو آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو توبہ ہی بھلی۔ اتنی گاڑیاں عالمِ وجود میں آگئی ہیں کہ کیا کہیے اور تو اور اب تو ایسی نازک اور چھیل چھبیلی گاڑیاں آنے لگی ہیں کہ ذرا سا ٹکرائیں اور کچومر نکل گیا۔

بھئی پہلے ہمارے زمانے میں تو ہر چیز اصلی ہوتی تھی اور سستی بھی۔ رُپے کا پندرہ لٹر پٹرول آتا تھا اور اب تو بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اب تو اس میں کچرا بھی بہت ہونے لگا ہے۔ اب بھلا بتاؤ یہ کچرا میرے پیٹ میں جائے گا تو مجھے کھانسی تو آئے گی ہی۔ مگر میرا مالک تو کچھ سُنتا ہی نہیں، اُلٹا مجھے ہی بُرا کہتا ہے کہ یہ گاڑی جھٹکے بہت کھاتی ہے۔ پھر مجھے کسی مکینک کو دے آتا ہے جو اِن بوڑھی ہڈّیوں پر ہتھوڑے برساتا ہے۔ خیر جناب، میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ قیامت کے روز بدلا لوں گی۔

لوگ تو مجھ سے اتنا جلتے ہیں کہ میرے مالک کو مشورہ دیتے ہیں کہ یہ گاڑی تو آثارِ قدیمہ والوں کو دے دو۔ بھلا میں کوئی سکندرِ اعظم کے دور کی سوغات ہوں۔ اور نہ میں بھی ان لوگوں پر ایسا دھواں چھوڑتی ہوں کہ کھانستے رہ جاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔

ویسے بزرگ یہ صحیح کہتے ہیں کہ نوجوان نسل بزرگوں کا احترام نہیں کرتی۔ یہ جو نئی گاڑیاں ہیں اللہ ماری مجھے دیکھ کر ہنستی ہیں اور اگر میں کہوں کہ بھئی راستہ دے دو تو راستہ بھی نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں کہ بڑی اماں ہلکے چلو کہیں گر نہ جانا۔ اب تو یہ نئے نئے فیشن کر کے نکلتی ہیں۔ عجیب عجیب شکلیں ہو گئی ہیں اور رنگ تو دیکھو! ایسے ایسے

ہیں کہ ہم نے ساری عمر نہیں دیکھے۔ خیر قیامت قریب ہے اسی لیے یہ سب دیکھنا پڑ رہا ہے۔ اور ان گاڑیوں پر ہی کیا موقوف، یہ بچے یعنی تم لوگ بھی میرا مذاق اُڑاتے ہو۔ مجھے دیکھ کر کوئی کہتا ہے ارے صابن دانی آرہی ہے، کوئی کہتا ہے نہیں نہیں یہ تو دھوئیں کا بم ہے سارے دھوئیں کے بم ہو گئے تم خود۔ خیر ایسی بڑی بھی نہیں ہوں اب میں۔ اب بھی لوگ مجھے دیکھ کر رُک جاتے ہیں اور ایسے غور غور سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہیں کہ شرم آجاتی ہے۔ دیکھو تم مجھ پہ ہنس رہی ہو۔ ٹھیک ہے میں جارہی ہوں اب میری کہانی بھی ختم ہو گئی ہے۔ اللہ حافظ

لوہا، لڑکا اور چیل

شبنم، حیدرآباد

شہر بغداد میں ایک شریف سوداگر رہتا تھا۔ اللہ نے اسے ہر طرح کی فراغت دی تھی، لیکن اس کے کوئی وارث نہ تھا۔ آخری عمر میں حج کے سفر کا ارادہ کیا۔ دوسرے سامان کے علاوہ اس کے پاس کئی من لوہا تھا۔ اس نے یہ لوہا اپنے ایک دوست کے سپرد کیا اور کہا، بھئی واپس آکر لے لوں گا۔

واپس آکر اس نے دوست سے اپنی امانت مانگی۔ دوست کی نیت بگڑ چکی تھی۔ اس نے جواب دیا، "مجھے افسوس ہے کہ تمھارا لوہا تو چوہے کھا گئے۔"

ہمدرد نونہال، جولائی ۱۹۸۹ء

سوداگر یہ سُن کر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

اتفاق سے راستے میں اُسی دوست کا لڑکا کھیل رہا تھا۔ سوداگر اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جب یہ لڑکا شام تک گھر واپس نہ پہنچا تو ہر طرف تلاش میں سوداگر کے ہاں بھی پہنچا اور لڑکے کے متعلق دریافت کیا۔

سوداگر نے کہا، "اے دوست! جب میں تمھارے گھر سے واپس آرہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک چیل تمھارے بچّے کو اُٹھائے لے جارہی ہے۔" وہ دوست بولا، "بھئی مذاق نہ کرو کہیں چیل بھی اتنے بڑے لڑکے کو اُٹھا سکتی ہے۔" سوداگر نے کہا، "جس شہر کے چوہے کئی من لوہا کھا سکتے ہیں وہاں کی چیل اگر ایک لڑکا اُٹھا کر لے جائے تو کیا تعجب ہے۔" دوست یہ جواب سُن کر بہت شرمندہ ہوا اور کہا، "میں نے تو مذاق کیا تھا، لوہا موجود ہے۔" سوداگر نے کہا، "اگر لوہا موجود ہے تو یہ لڑکا بھی حاضر ہے۔"

سیٹھ کی ترکیب

صلاح الدین عباسی، سکھر

جب سے سیٹھ رحمت اللہ کی بیوی کا انتقال ہوا تھا تب سے وہ بہت اُداس رہتا تھا۔ ہر وقت خاموش خاموش۔ اگر اسے اپنے بچّوں کی فکر نہ ہوتی تو شاید وہ خود کو ایک کمرے میں ہی بند کر لیتا

ہم جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب
کی درازیٔ عمر اور سرپرستی
کے لیے اللہ تعالیٰ
کے حضور دعاگو ہیں

FROM.
Aluminium Plastic
Industries (Pvt) Ltd.
S.I.T.E. Manghopir Road, Karachi.
MANUFACTURERS & SUPPLIERS OF
Collapsible tubes

ہمدرد لیبوریٹریز (وقف) پاکستان کو اُن کی مصنوعات پیلو ٹوتھ پیسٹ ،
مسواک ٹوتھ پیسٹ ، نونہال ٹوتھ پیسٹ اور ہمدرد شہد کے لیے ۲۰ سال سے
زائد عرصے سے ALLUMINIUM COLLAPSIBLE TUBES تیار کرنے والا ادارہ

لیکن بچّوں کی محبّت سے مجبور ہو کر وہ ان سے ہنس بول لیتا تھا۔ اس کے دونوں بچّے ان چند لمحوں میں جو خوشی حاصل کرتے تھے اس سے ان کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا باپ ان سے ہر وقت باتیں کرے، انھیں پیٹھ پر بٹھا کر سیر کرائے، آئس کریم کھلانے لے جائے مگر سیٹھ رحمت اللہ کو بیوی کی جُدائی کا روگ کچھ زیادہ ہی لگ گیا تھا۔

سیٹھ کا ایک دوست تھا رضا۔ اس نے سیٹھ کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرے۔ اس سے وہ بچّوں کی فکر سے آزاد ہو جائے گا اور اسے بیوی کا پیار بھی ملے گا۔ سیٹھ نے پہلے تو بہت انکار کیا، کیوں کہ وہ سوتیلی ماں کے ظلموں سے واقف تھا، مگر جب چند دوستوں نے باقاعدہ اس کے خلاف محاذ کھول لیا تو اس نے اقرار کر ہی لیا۔

رضا نے اس کے لیے ایک خوب صورت لڑکی ڈھونڈی اور اس کی شادی کرادی۔ سیٹھ کی یہ بیوی رضیہ بہت خوب صورت تھی، لیکن جتنی وہ خوب صورت تھی اتنی ہی ظالم اور لالچی بھی تھی۔ یہ راز تو سیٹھ پر اُس وقت کھُلا جب اس کے دونوں بچّے ہر وقت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہنے لگے۔ اب سیٹھ ہر وقت پریشان پریشان رہنے لگا۔ پہلی بیوی کی جُدائی کیا کم تھی کہ دوسری بیوی نے ظلم ڈھانے شروع کر دیے تھے۔ سیٹھ رحمت اللہ اپنے دوست رضا پر بھی بہت ناراض ہوا، کیوں کہ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا۔ سیٹھ اپنی بیوی کو چھوڑ بھی نہ سکتا تھا، کیوں کہ اس کی چالاک اور لالچی بیوی نے حقِ مہر میں پانچ لاکھ سونے کے سکّے لکھوائے تھے۔ جب اس کے دونوں بچّے ہر وقت اپنی سوتیلی ماں کے ظلموں کا نشانہ بننے لگے تو سیٹھ نے فیصلہ کیا کہ وہ کوئی ایسی ترکیب آزمائے گا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کافی دِنوں کے سوچ بچار کے بعد سیٹھ کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے فوراً اسے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن وہ ایک تیتر (ذبح کیا ہوا) لے کر اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور بولا، "نیک بخت! دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔"

بیوی ناک بھوں چڑھا کر بولی، "تیتر ہی تو لائے ہو کون سا ہرن ہے جو میں خوشیاں مناؤں۔"

سیٹھ ضبط کرتا ہوا بولا، "جب تو اس کی خصوصیت سُنے گی تو مارے خوشی کے ناچنے لگے گی۔"

"بیوی بولی، "ایسا کیا ہے اس کے گوشت میں؟"

سیٹھ مسکرا کر بولا، "جو بھی اس کا گوشت کھائے گا اسے ہر صبح کو جاگنے کے بعد اپنے تکیے کے نیچے سے دس سونے کی اشرفیاں ملیں گی۔"

بیوی یہ سُن کر اُچھل پڑی اور بولی، "سچ؟"

سیٹھ بولا، "بالکل سچ۔ میں بھلا تم سے جھوٹ کیسے بول

سکتا ہوں۔"

بیوی نے یہ سُن کر گوشت اُٹھایا اور باورچی خانے میں گئی اور نوکر سے بولی، "ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہ گوشت بُھنا ہوا میرے سامنے ہونا چاہیے۔"

عبدل ہاتھ جوڑ کر بولا، "جو حکم مالکن۔"

بیوی یہ حکم دے کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے خیالوں میں روزانہ دس سونے کی اشرفیاں تھیں۔ پھر وہ بے چینی سے گوشت کا انتظار کرنے لگی۔ مگر جب پندرہ منٹ گزر گئے اور بُھنا ہوا لذیذ گوشت نہ پہنچا تو بیوی غصّے میں بھر گئی۔ وہ دہاڑتی ہوئی باورچی خانے میں پہنچی جہاں عبدل بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

بیوی تڑخ کر بولی، "عبدل گوشت کہاں ہے؟"

عبدل ہکلا کر بولا، "گگ ... گگ ... گوشت۔"

بیوی کا ماتھا ٹھنکا، "میں پوچھتی ہوں گوشت کہاں ہے۔"

ہمّت کر کے عبدل بولا، "وہ تو ... وہ تو ... دونوں چھوٹے مالک کھا گئے۔"

بیوی غصّے میں لال ہو گئی، "کہاں ہیں وہ دونوں؟" بیوی چلاّتی ہوئی سیٹھ کے کمرے میں پہنچی جہاں دونوں بچّے باپ کی آڑ میں بیٹھے ہوئے کانپ رہے تھے۔

"ٹھہرو تو ابھی تمھیں بتاتی ہوں کہ گوشت کیسے کھاتے ہیں۔" بیوی بچّوں کو مارنے کے لیے لپکی۔

"ارے کیا کرتی ہو؟ کیوں مارتی ہو ان کو؟ کچھ بتاؤ تو مجھے۔" سیٹھ فوراً بچّوں کے آگے آ گیا۔

بیوی نے سب ماجرا سیٹھ کو بتا دیا۔ سیٹھ نے عبدل کو بلایا تو وہ روہانسا ہو کر بولا، "گوشت تیار ہو گیا تو میں سلاد لینے چلا گیا تاکہ گوشت سلاد کے ساتھ پیش کر سکوں۔ لیکن جب واپس آیا تو بھوں... بھوں ... بھوں ..."

"اب میں انھیں نہیں چھوڑوں گی۔ انھوں نے میری دس اشرفیاں گنوا دی ہیں۔" بیوی پھر بچّوں کی طرف لپکی۔

"ارے کیا کرتی ہو نیک بخت؟" سیٹھ فوراً بولا۔ "دیکھو اگر تیتر کا گوشت صرف تم کھاتیں تو صرف تمھیں اشرفیاں ملتیں مگر چوں کہ گوشت اب ان دونوں نے کھا لیا ہے اس لیے اب ہمیں ہر صبح کو بیس اشرفیاں ملنے لگیں گی۔" سیٹھ کی یہ بات سُن کر بیوی رُک گئی۔ چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد اس نے بے اختیار بچّوں کو اپنے سے چپٹا لیا۔ وہ بچّے اب اسے پیارے لگنے لگے تھے۔

دوسری صبح جب ان دونوں کے تکیے اُٹھائے گئے تو واقعی وہاں بیس اشرفیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بیوی بے اختیار ناچنے لگی۔

اصل معاملہ کیا ہے، وہ صرف عبدل اور سیٹھ کو ہی معلوم تھا۔ لیکن اب تو آپ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

آدھی ملاقات

◻ کہانیوں میں "تباہی یا زندگی" اور "سام پہ کیا گزری" بہت ہی پسند آئیں۔ تعبیر احمد قریشی، بھریا شہر

◻ ہمیں نونہال کا سالانہ خریدار بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔
حنیف، شریف، منظور اور مبارک بلوچ

اگر رسالہ عام ڈاک سے منگوانا چاہتے ہیں تو ۵۵ رُپے کا منی آرڈر کر دیجیے اور اگر رجسٹری سے منگوانا ہے تو ۱۰۳ رُپے کا۔

◇ کہانیوں میں جھوٹ، پانی کا بلبلہ، سیدھا راستہ اور تباہی یا زندگی سبق آموز تھیں۔ علی اصغر حسین علی، کراچی

◻ نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں سفرنامہ دو مسافر دو ملک حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ طریقہ کار بتائیے۔

محمد سلمان خان، حیدر آباد

حیدر آباد میں المہران پرائیویٹ لمیٹڈ تلک چاڑی سے خرید لیجیے یا پھر ۱۶ رُپے کا منی آرڈر کر دیجیے۔ (بارہ رُپے قیمت اور چار رُپے ڈاک خرچ رجسٹری سے)

◇ پورا شمارہ دل کو بھایا۔

الطاف حسین اور آصف حسین، کراچی

◇ پہلی بات، شہادت کا شوق، تباہی یا زندگی، مُلّا کام بگاڑ دو بہت اچھی تحریریں تھیں۔ صباحت سعیدہ، محمد عاطف زمان، کراچی

◻ کیا آپ نے نونہال کی قیمت ہمیشہ کے لیے بارہ رُپے کر دی ہے یا صرف جولائی کے شمارے کے لیے کی ہے؟

فائق محمود، فدا محمد، گاؤں دیسہ

ہمدرد نونہال کے خاص نمبر کی قیمت ۱۲ رُپے ہے۔ عام شمارہ ۵ رُپے کا ہی ہوگا۔

◇ ملا کام بگاڑ دو (مناظر صدیقی) اس دفعہ نمبر لے گئی۔
شمیلا حبیب اور ساجد حبیب عزیز، کراچی

◇ خاص نمبر کی خوش خبری پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔
ابو الکلام، علی اکبر شاہ گوٹھ سو کوارٹرز

◇ پہلے ہی صفحے پر خاص نمبر کی جھلکیاں پڑھ کر خاص نمبر کے انتظار میں مزید اضافہ ہوا۔ عمر خطاب خاں، اورنگی ٹاؤن

◻ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔
قرۃ العین طاہر، راول پنڈی

◻ لطیفے نئے نہیں تھے۔ مہدی حسن کاظمی، کراچی

◻ سرورق اچھا نہ تھا۔ غلام حیدر غلام، بھنگر

◻ اب کے نونہال میں دل پسند اور من موہنی تحریریں تھیں۔ لطیفے اپنی شوخی کے لحاظ سے ٹاپ پر تھے۔
سلمٰی ثنا اللہ راجپوت، حبیب اللہ راجپوت، دولت پور صفن

◇ بھئی نونہال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔
منیر حسین آصف، الفاروق کالونی

◻ مئی کے نونہال میں تمام کہانیاں اچھی لگیں۔
امداد علی پلیچو، جنگ شاہی

◻ سرورق پر دو بچّوں کی تصویر بہت اچھی تھی۔

نازیہ انجم، کراچی

◻ نونہال ایک ایسے ساگر کی مانند ہے جس میں کروڑوں قیمتی موتی پائے جاتے ہیں۔ نونہال ایک ایسا روشن آسمان ہے جس میں کروڑوں روشن ستارے ہیں۔

ارشد حسین، بیدادی، ہزارہ

◇ نونہال اچھا تھا۔ تہمینہ رِیا، کراچی

◻ مئی کا رسالہ اتنا اچھا تھا کہ ایک گھنٹے میں پڑھ کر ختم کر دیا۔ نعیم یوسف، کراچی

◻ کہانیوں میں وہی گاؤں، چندن ہار اور سام پر کیا گزری اچھی تھیں۔ کاشف وسیم، ایبٹ آباد

◻ ہم پانچوں بھائی عرصۂ دراز سے نونہال کے قاری ہیں۔ یقین جانیے ہم نے اتنا خوب صورت رسالہ آج تک نہیں دیکھا۔
عبدالحمید، عبدالرشید، فہیم احمد، عبدالوحید، نوید انجم، ترنڈہ سوائے خان

◻ اس مرتبہ لطیفے بہت مزے دار تھے اور سرورق کی تو جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عبدالعزیز لاسی، اوتھل

◻ مئی کا نونہال بہت ہی دل چسپ تھا۔
جاوید شبیر بربرا، علی پور

◻ جھوٹ، انمول اور پانی کا بلبلہ بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں اور سب کا بادشاہ "جاگو جگاؤ" تھا۔
منظور سلطان، کراچی

◻ لطیفے معیاری تھے۔ سرورق بھی پسند آیا۔ دانہ دانہ اچھے تھے۔ معلوماتی مضمون ٹکڑے اور بوجھو پسند آیا۔
سمیرا صدیقی، کراچی

◻ مجھے پہلی بار یہ رسالہ میری دوست مریم علی نے تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔ یہ رسالہ پڑھ کر مجھے بے حد مزہ آیا۔ اور میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ نسیمہ گل، کوئٹہ

◻ تصویریں بنانے میں مشیر صدیقی صاحب بہت محنت کر رہے ہیں۔ ظفر علی، کراچی

◻ ہمیں اس دفعہ "سام پہ کیا گزری" اور "جاگو جگاؤ" بہت پسند آیا۔ شیخ انجم رفیق، وسیم رفیق، اٹک

◻ بزم ہمدرد نونہال کی رپورٹ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔
خالد محمود بھٹی، ترنڈہ سوائے خان

◻ نظمیں غریب کا لڑکا، ایک کتاب کی کہانی بہت پسند آئیں۔
نصیر احمد، عمران، امجد، جاوید، نوید اور جونی، کراچی

◻ پورا نونہال بہت ہی پسند آیا۔
محمد طارق صدیقی

◻ اس بار سرورق بالکل پسند نہیں آیا۔
جمال ساجد، اسلام آباد

◻ سب نونہالانِ وطن کو اور ہمدرد کے کارکنوں کو عید مبارک۔
فیض رسول انجم، آبدی شریف

◻ تازہ شمارہ خوب تھا۔ عبدالقدوس مقدسی، جیوانی

◻ سام پہ کیا گزری بہت پسند آئی۔ راجا راشد بشیر، کراچی

◻ لطیفے سارے اچھے تھے۔ شکیل خان، میرپور خاص

◻ اس دفعہ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا جاگو جگاؤ بہت ہی پسند آیا۔ انعام کا دن، گلدستہ، شہادت کا شوق، انمول، وہی گاؤں، چندن ہار اور مُلّا کام بگاڑو دل کو بھائے۔
محمد یوسف یونس راجپوت، ٹھٹھ

◻ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مجھے پسند نہ ہو۔
عبدالقادر کندھر، حیدر آباد

◻ مئی کا جھپھاتا ہوا ستارہ دکھائی دیا تو اس کی چمک دار پُرنور کرنیں دل کے دالان کو روشن کر گئیں۔
نیلوفر شہناز، فیصل آباد

◻ نونہال ادیب میں مختیار احمد انجم پروانہ کا مضمون اوچ شریف بہت اچھا تھا۔ ملک شفیق حسین، رضوان انجم، قادر بخش شاکر، سید یوسف شمسی، رازق بخش، محمد اسلم جاوید، غلام عباس، منیر احمد ارشد، اوچ شریف

◻ تباہی یا زندگی بہت عمدہ کہانی تھی۔ محمد ریاض، گوراڑہ شریف

◻ چندن ہار، تیندوے کا شکار، سید ھا راستہ، سام پہ کیا گزری، وہی گاؤں اور انمول نمبر لے گئیں۔
گلزار احمد بیتوں، ترنڈہ سوائے خان

◻ شہادت کا شوق (طالب ہاشمی) اور انعام کا دن (عتیق الرحمٰن صدیقی) بہترین تحریریں تھیں۔ زرملک نور محمد، لیاری

◻ مئی کا رسالہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔
دل عباس حسین اعوان، جہلم

◻ مجھے مئی کے شمارے کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔
سیدہ مبین فاطمہ، کراچی

□ میں آپ کا نونہال پانچ سال سے پڑھ رہا ہوں اور میں نے آپ کے نونہال سے بہت کچھ سیکھا اور عمل بھی کیا۔ میرے سب گھر والے آپ کے نونہال کو بہت پسند کرتے ہیں۔

ظفر حسین بلوچ، کراچی

◇ میں گیارہویں جماعت کا طالب علم ہوں اور مجھے آپ کا رسالہ پڑھتے ہوئے پورے چھے سال گزر چکے ہیں۔ یہ نہایت ہی مفید اور دل چسپ رسالہ ہے اور قیمت کے لحاظ سے تو اپنی مثال آپ ہے۔ کاشف حیات، گوجرانوالہ

□ جاگو جگاؤ سے ہم نے سبق حاصل کیا۔ سام پہ کیا گزری اچھی کہانی ہے۔ نونہال مصور اچھا کالم ہے۔

عابد حفیظ، ریحانہ انور، تحصیل گوجرہ

◇ میں نونہال بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔

میر عالم، حیدر آباد

◇ اب نونہال ادیب بھی ذرا بہتر ہو گیا۔

طارق محمود تربیلوی، کھلابٹ

◇ پانی کا بلبلہ میں خاصا سسپنس تھا۔ لطیفے بھی اچھے تھے اور نظمیں بھی۔ کلثوم علاء الدین، لاہور

□ تباہی یا زندگی لاجواب تھی۔ عامر اقبال، کراچی

□ دانہ دانہ میں "اپنا محاسبہ، بلندی اور پانچ میں سے ایک" اچھی تحریریں تھیں۔ "پانی کا بلبلہ، انمول، وہی گاؤں اور تباہی یا زندگی" سبق آموز کہانیاں تھیں۔ نونہال ادیب میں "دشمن کا علاج" اور نظم "کیا میں انسان ہوں" بہت پسند آئی۔

نوید اقبال، سیال کوٹ

□ اس بار لطیفے نقل شدہ تھے۔ اس بار کہانیوں میں چندن ہار (عامر اوصاف) اور تباہی یا زندگی (الحبیب عبدل) بڑی اچھی تھیں۔ سام پہ کیا گزری (سید انظر مہدی) کا چوتھا ٹکڑا بہت پسند آیا۔ نظموں میں میٹھی عید (تنویر پھول) اور غریب کا لڑکا (غنی دہلوی) اچھی تھیں۔ اللہ دتہ شمو، عابد کریم، وسیم غفور،

عاطف کریم اور ندیم غفور، ستیانہ بنگلہ

□ ہم نونہال بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ شاہنواز، رب نواز، قمر حسین، غلام یاسین عرف مورڑو، ہدایت اللہ، محمد ابراہیم، غلام فرید، محمد مٹل، انور علی، محمد پریل اور عمران خان میرانی، گڈو بیراج

□ انمول، پانی کا بلبلہ، نونہال ادیب اور نظم میٹھی عید بہت پسند آئی۔ اور کھل کھلاتے زیادہ مزے دار نہ تھے۔

عبدالحفیظ بلوچ، سانگھڑ

□ ملا کام بگاڑو، سام پہ کیا گزری، وہی گاؤں اور چندن ہار اچھی کہانیاں تھیں۔ محمد اعجاز ریاض، کراچی

◇ مئی کا نونہال لاجواب تھا۔

محمد اسلم عزیز شاہپور، سرگودھا

□ میں تقریباً ۵ سال سے ہمدرد نونہال پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اس کی معلومات ہمارے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتی ہے۔ محمد معروف انصاری، محمد کامران زبیری، سکھر

◇ کہانیوں میں وہی گاؤں (حامد علی شاہد) سیدھا راستہ (کلیم احمد) اور سام پہ کیا گزری اعلا پائے کی تھیں۔ نظم میٹھی عید اعلا اور دل کش تھی۔ عبدالحکیم خاں لہر، کامل پور موسیٰ

□ سام پہ کیا گزری اور چندن ہار بہت پسند آئیں۔

محمد شاکر حسین، ٹنڈوالہ یار

□ نونہال نے اس دفعہ بھی اپنا معیار برقرار رکھا۔ "چندن ہار، جھوٹ اور وہی گاؤں" نونہال کی خوب صورتی میں اضافے کا سبب بنے۔ سجاد احمد چھاچھی، کامل پور موسیٰ

◇ جاگو جگاؤ گلاب کے پھول کی طرح تھا۔ پہلی بات، کہانیاں اور لطائف کہکشاں لگے۔ خطوط نے نونہالوں کی نونہال کے ساتھ بے حد دل چسپی کا ثبوت دیا۔

محمد اکرم سیالوی، ننکانہ صاحب

◇ تازہ نونہال پڑھ کر اتنا لطف آیا کہ تحریر سے باہر ہے۔ تمام تحریریں اچھی اور خوب صورت تھیں۔

محمد امجد حسین انصاری، فیصل آباد

◇ ملا کام بگاڑو کہانی بہت پسند آئی۔

راشد معین، نوکوٹ سندھ

□ نونہال ادیب خوب صورت کہانیوں اور نظموں سے آراستہ تھا۔

زاہد منیر، شاہد منیر، دیپال پور

□ اس دفعہ کا نونہال چاند کا ٹکڑا تھا۔ سرورق پر دو پھول نما بچے بہت اچھے لگے۔ پانی کا بلبلہ اور انمول سبق آموز کہانیاں تھیں۔ ہمیں فانی چیز کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے اور کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انھی باتوں میں نونہال کی جان ہے۔

کامران حمید، لاہور

□ نونہال نے آتے ہی دل میں جگہ لے لی۔

ثمرین الفت اویسی، عبداللہ شرجیل، راحیل طارق، رحیم یار خاں

◇ میں اور میری بہن اس نونہال کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

عدیل انور، کراچی

◇ نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔

نبیل قادر بھٹی، اللہ آباد

□ نونہال میں پہلے والی لذت نہیں رہی۔ نہ کوئی لوک کہانی نہ کوئی لمبی کہانی۔ لیکن پھر بھی کہانیوں میں تباہی یا زندگی اور ملّا کام بگاڑو اچھی لگیں۔ لطیفے بھی اچھے تھے لیکن دانتوں کی نمائش نہ کرا سکے۔

فاروق احمد انصاری، کراچی

◇ مجھے نونہال بہت پسند ہے۔

نصراللہ بلوچ، لانڈھی

◇ سام پہ کیا گزری اچھا ناول جا رہا ہے۔

محمد عاقل احمد خاں، پرانا سکھر

□ نونہال میں جتنی چیزیں شامل ہیں سب ہی مزے دار ہیں۔

فرحانہ ناز، کراچی

□ شہادت کا شوق، تیندوے کا شکار، تباہی یا زندگی اور سام پہ کیا گزری بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

عبدالرحمٰن، گھوٹکی

◇ کہانیاں سب دل چسپ اور سبق آموز تھیں مگر جو زیادہ پسند آئی وہ تھی ننھی نظم پیارہ ننھی کی پانی کا بلبلہ۔ سرورق خوب صورت تھا۔

عبدالوحید ہاشمانی، حیدر آباد

□ مئی کا شان دار شمارہ دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے خط لکھ ڈالا۔

خرم معراج، پرانا سکھر

□ ہمدرد نونہال پاکستانی ادب میں بہترین مرتبہ رکھتا ہے۔ دیگر رسائل جو اچھائی کا دعوا کرتے ہیں آئے دن رسالے کی قیمت بڑھاتے رہتے تھے۔ محض دولت اکھٹی کرنے کے لیے۔ جب کہ نونہال ان سب رسائل سے منفرد ہے کاغذ کی مہنگائی کے باوجود قیمت صرف پانچ رُپے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ نونہال کو اتنی کم قیمت میں ہمارے ملک کے غریب نونہال خرید کر پڑھتے ہیں۔ اسٹالوں پر رنگین رسالے ہوتے ہیں مگر مہنگے۔ آپ کا رسالہ ہر لحاظ سے منفرد ہے۔

محمد اعجاز خان بابر زئی، بجام شورو، دادو

□ سرورق بہت خوب صورت تھا۔

نازنین عباس، شگفتہ عباس، شجاع آباد

◇ ہمدرد نونہال بہت اچھا ماہ نامہ ہے۔ اس میں بچّوں کے پڑھنے کے لیے بہت ہی مفید چیزیں ہوتی ہیں۔

شازیہ نصیر، کوہاٹ

◇ یہ رسالہ آپ کی ہدایات و ہمدردی سے بھرپور ہوتا ہے۔

صفدر علی، منڈی بچیانہ

◇ سرورق تو یکسانیت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں اب تبدیلی کی ضرورت ہے۔

عشرت ذاکر، کراچی

□ لطیفے بس ٹھیک ٹھاک تھے۔

روبینہ عید محمد لاشاری بلوچ، جیکب آباد

◇ جب سرورق پر نظر پڑی تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ میرا ہی آئیڈیل ہے۔

محمد اختر انجم، رضوان احمد، مندراں والا

□ رسالے کو ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اچھا اور خوب صورت پایا۔ جاگو جگاؤ کے علاوہ دانہ دانہ اور تباہی یا زندگی (العبید عبدل) بھی پسند آئی۔

حارث لطیف، ساہی وال

◇ اس مرتبہ کا نونہال چاند کی طرح پیارا اور سورج کی طرح چمکتا دمکتا تھا۔

شبانہ عندلیب، گوجرانوالہ

◇ جناب حکیم محمد سعید کا جاگو جگاؤ لاجواب، لاثانی اور انمول ہے۔ سام پہ کیا گزری اور جھوٹ اچھی کہانیاں ہیں۔

نور الاسلام حبشی، کراچی

معلوماتِ عامّہ ۲۷۷ کے صحیح جوابات

۱- قاہرہ کی عظیم اسلامی درس گاہ 'جامعہ ازہر' کی بُنیاد چوتھی صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں جوہر الکاتب الصّقلی نے ۹۸۲ء میں رکھی تھی۔

۲- حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کا مزار سندھ کے حکمراں غلام شاہ کلھوڑو نے تعمیر کروایا تھا۔

۳- جس سال مشہور ماہر فلکیات گلیلیو کا انتقال ہُوا، اُسی سال مشہور سائنس داں اور ریاضی کا ماہر سر آئزک نیوٹن پیدا ہوا۔

۴- پاکستان میں

ڈیرہ اسمٰعیل خاں دریائے سندھ کے قریب واقع ہے۔

خوشاب دریائے جہلم کے قریب واقع ہے۔

چنیوٹ دریائے چناب کے قریب واقع ہے۔

ہڑپّہ دریائے راوی کے قریب واقع ہے۔

۵- نہر سوئیز بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کو ملاتی ہے۔

۶- اوسٹریلیا کے جزیرے تسمانیہ کو ولندیزی ملّاح "ایبل جانسون تسمان" نے دریافت کیا تھا۔

۷- مشہور عوامی داستان 'سسّی پنّوں' کا تعلّق سندھ کی قدیم بستی 'بھنبھور' سے ہے۔

۸- اردو زبان کے وہ بڑے ادیب مولانا محمد حسین آزاد ہیں جن کے والد کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بے قصور پکڑ کر مار دیا گیا تھا۔

۹- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو 'حواری' کہا جاتا ہے۔

۱۰- دنیا کا سرد ترین مقام برّاعظم انٹارکٹیکا میں رُوسی اسٹیشن 'ووسٹوک' ہے۔ اگست ۱۹۶۰ء میں اس کا درجۂ حرارت منفی ۳ر۸۸ سنٹی گریڈ تھا۔

دس صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

مجیب ظفر انوار، کراچی
محمد غیاث احمد صدیقی، کراچی

نو صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

سانگھڑ

غلام رسول
غلام نبی منصوری
محمد عادل قریشی
عبدالحمید یوسف زئی
محمد سلیم
صغیر احمد راجپوت
ندیم عمر یوسف زئی
محمد امین سیف الملوک
عاشق حسین نازش

حیدر آباد

غلام حسین میمن

سیّد عبدالواحد عمار
عبدالقادر کندھر

خیر پور میرس

ظفر اللہ شیخ
فیاض احمد سومرو
جوّاد احمد گاد

میر پور خاص

صدیق حسین
پپّو
پرنس نذیر احمد
عزیز احمد

شکیل احمد
محمد رمضان

سنجھورو

سیّد نوید علی ہاشمی
محمد طاہر آرائیں

مختلف شہروں سے

محمد یونس سنی، بورے والا
حلیمہ عزیز، پشاور

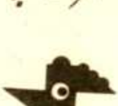

مطبوعاتِ ہمدرد، راول پنڈی میں مندرجہ ذیل کتب فروشوں سے دست یاب ہیں

- میسرز کیپٹل بک ڈپو، اردو بازار
- میسرز ورائٹی بک اسٹال، بینک روڈ
- میسرز امریکن بک کمپنی، بینک روڈ
- میسرز بک سینٹر، حیدر روڈ
- میسرز کیپری بک اسٹال، بینک روڈ
- میسرز محمود بک اسٹال، آب پارہ، اسلام آباد

نونہال لُغت

مَن: مَ ن کنویں کی مُنڈیر

خلل خَ لَل فتور، بگاڑ

ہتھ چھٹ: ہَ تھ چُھٹ جس کا ہاتھ مارنے کے لیے فورًا اٹھ جاتا ہو۔

گُلوخلاصی: گُ لُو خلاصی چُھٹکارا، پیچھا چھوٹنا

بِساط بِ سَاط فرش، بچھونا، گھر کا سامان، شطرنجی

پِدّا پَ دا ایک قسم کا چھوٹا پرندہ

جُھٹال دینا: جُھ ٹال دے نا تھوڑا سا کھانا، چکھ لینا

تُوشَہ تُو شَہ کھانے پینے کی چیز، مسافر کا کھانا، سفر خرچ

بکھیڑا بَ کھے ڑا ہنگامہ، اُلجھاؤ، جنجال، جھگڑا، کام دھندا

کنّی کاٹنا: کَن نی کاٹنا کترانا

امیٹھنا اَمیٹھ نا مروڑنا، بل دینا

تعیناتی: تَع نا تی تقرر

تڑخنا: تَ ڑَخ نا پھٹنا، شق ہونا

بَن: بَ نْ جنگل

اُمس: اُ مَ س وہ گھٹی ہوئی گرمی جو برسات میں ہوا نہ چلنے سے ہوتی ہے۔

امر: اَمْرْ حکم، بات، کام، معاملہ، مسئلہ

اعتنا: اِع تِ نا توجّہ، اہتمام، پروا

خوش گلو: خُوش گُلو اچھی آواز والا

ڈیوڑھی: ڈِیوڑِھی دہلیز، آستانہ، مکان کا وہ حصّہ جو باہر کے دروازے سے ملا ہوا ہو۔

ہنکارا: ہُنکَارا کسی بات کے قول و اقرار کی آواز جیسے کہانی سُننے والے اکثر ہاں، ہوں کیا کرتے ہیں۔

ہُمکارا ہُم کَارا

طغیانی: طُغ یانی سیلاب، دریا کا پانی چڑھنا، پانی کا موجیں مارنا

دیدہ: دِی دَا آنکھ کا ڈھیلا، آنکھ، دلیری، جُرات، بے باکی

رُوداد: رُو دَاد رپورٹ، ماجرا، حال، کیفیت، سرگزشت، عدالت کی کارروائی

پائنتی: پَا ئِیں تی سرہانے کی ضد، پیروں کی طرف

پشیمانی: پَشے مانی پچھتاوا، ندامت، حسرت

خودداری: خُود دَاری اپنی عزّت کو قائم رکھنا

سجیلا: سَ جی لَا آراستہ، بنا ٹھنا، بانکا

توقّف: تَ وَق قُف دیر، وقفہ، ڈھیل

غم گسار: غَمْ گُسَار غم خوار، ہمدرد

مُبادا: مُ بَا دَا ایسا نہ ہو، اللہ نہ کرے، خدانخواستہ

بخل: بُخل کنجوسی، تنگ دلی، لالچ

عیاں ع یَاں ظاہر، کھلا ہوا، واضح

متاع: مَ تَاع پونجی، تجارت کا مال، اثاثہ

بہرہ مند: بَہ رَہ مند خوش نصیب، فائدہ اٹھانے والا۔

قلم زن: قَ لَم زَن کاتب، لکھنے والا، محرر، نقاش

تیغ زن: تیغ زَن تلوار چلانے والا

مدبّر: مُ دَب بِر تدبیر کرنے والا، عقل مند، مشیر، صلاح کار

مہندس: مُ ہَن دِس جوتشی، نجومی، اشکال ہندسہ کا عالم، اقلیدس کا ماہر

منطقی: مَن طِقی منطق جاننے والا، حجتی، جھگڑالو

مورخ: مُو اَر رِخ تاریخ لکھنے والا

سخن ور: سُ خَن وَر باکمال شاعر

کارفرما: کَار فَر مَا حکم کرنے والا، حاکم، بادشاہ، استاد

قطعہ: قِط عَہ کاٹا ہوا ٹکڑا، حصہ، پرزہ، پرچہ، ملک، دیس

آہن: آ ہَن لوہا

شرفا: شُ رَفَا شریف کی جمع، نیک

محور: مِح وَر وہ دُھرا جس پر پہیہ گردش کرتا ہے، وہ فرضی خط جس کے گرد زمین گردش کرتی ہے اس کا ایک سرا قطب شمالی اور دوسرا جنوبی ہے۔

روپہلا: رُو پَہ لَا چاندی کے رنگ کا

اینڈنا: اینڈ نَا غرور کرنا، اکڑنا، انگڑائیاں لینا۔

مؤلف: مُ اَل لِف اکٹھا کرنے والا، کتاب ترتیب

مُصنّف: مُ صَن نِف دینے والا، کتاب لکھنے والا۔

لجلجا: لُج لِ جَا پلپلا، لچک دار، ملائم، نرم،

سینک: سِین ک گرمی، تپش، سینکنے کا کام

صافا: صَافَا سر سے باندھنے کا دوپٹا، شکاری جانور کو بھوکا رکھنا۔

فرزانہ: فَر زَانَہ عقل مند، دانا

سرشار: سَر شَار لبالب، لبریز

اسباب: اَس بَاب سبب کی جمع، ضرورت کا سامان۔

تپش تَ پِش گرمی، حرارت

تشریح تَش رِیح کھول کر بیان کرنا

تشفی تَ شَف فِی تسلّی

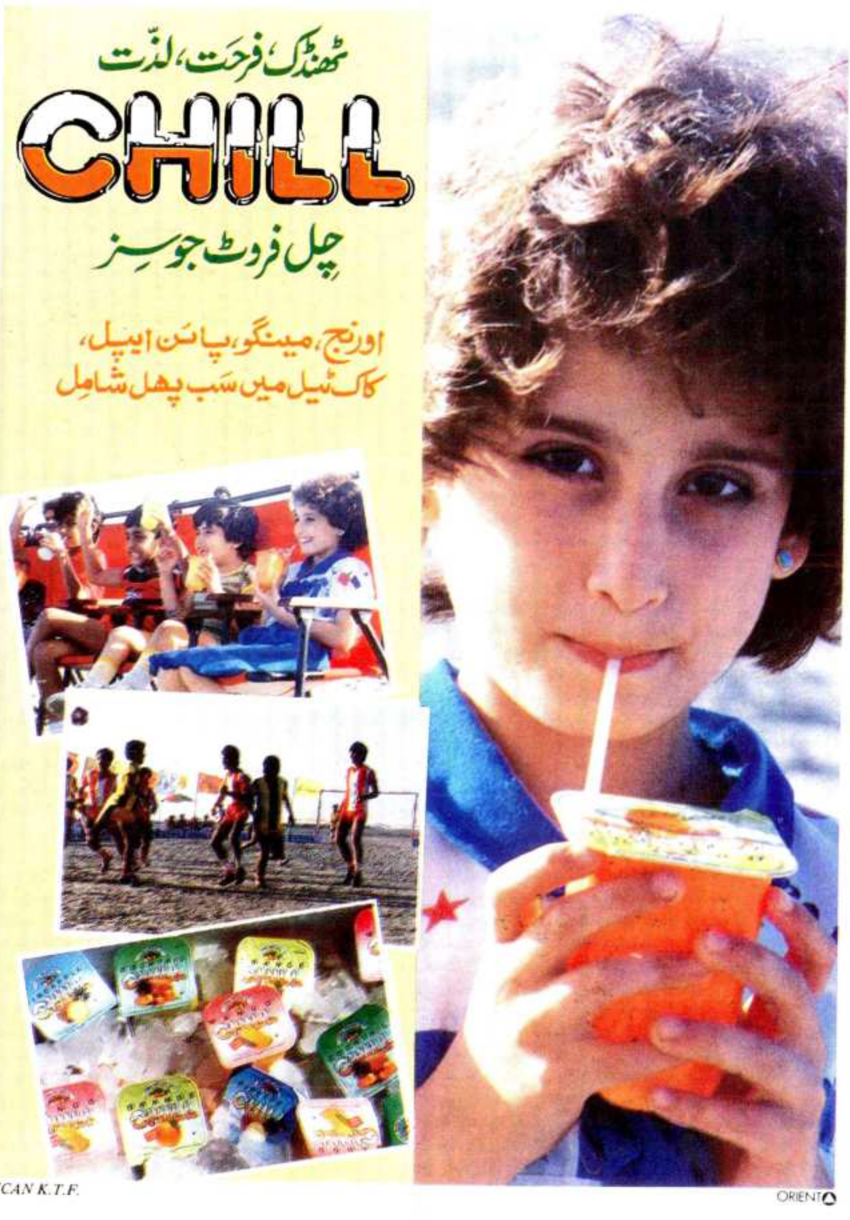

SCAN K.T.F.
ORIENT

جولائی ۱۹۸۹
ہمدرد
نونہال
رجسٹرڈ ایم نمبر ۶۹

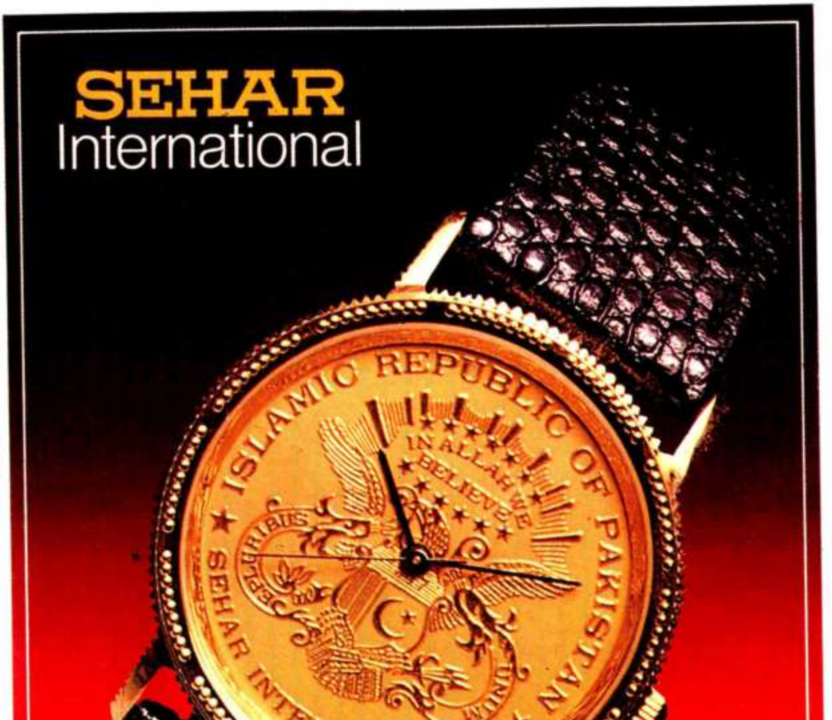

SCAN K.T.F.